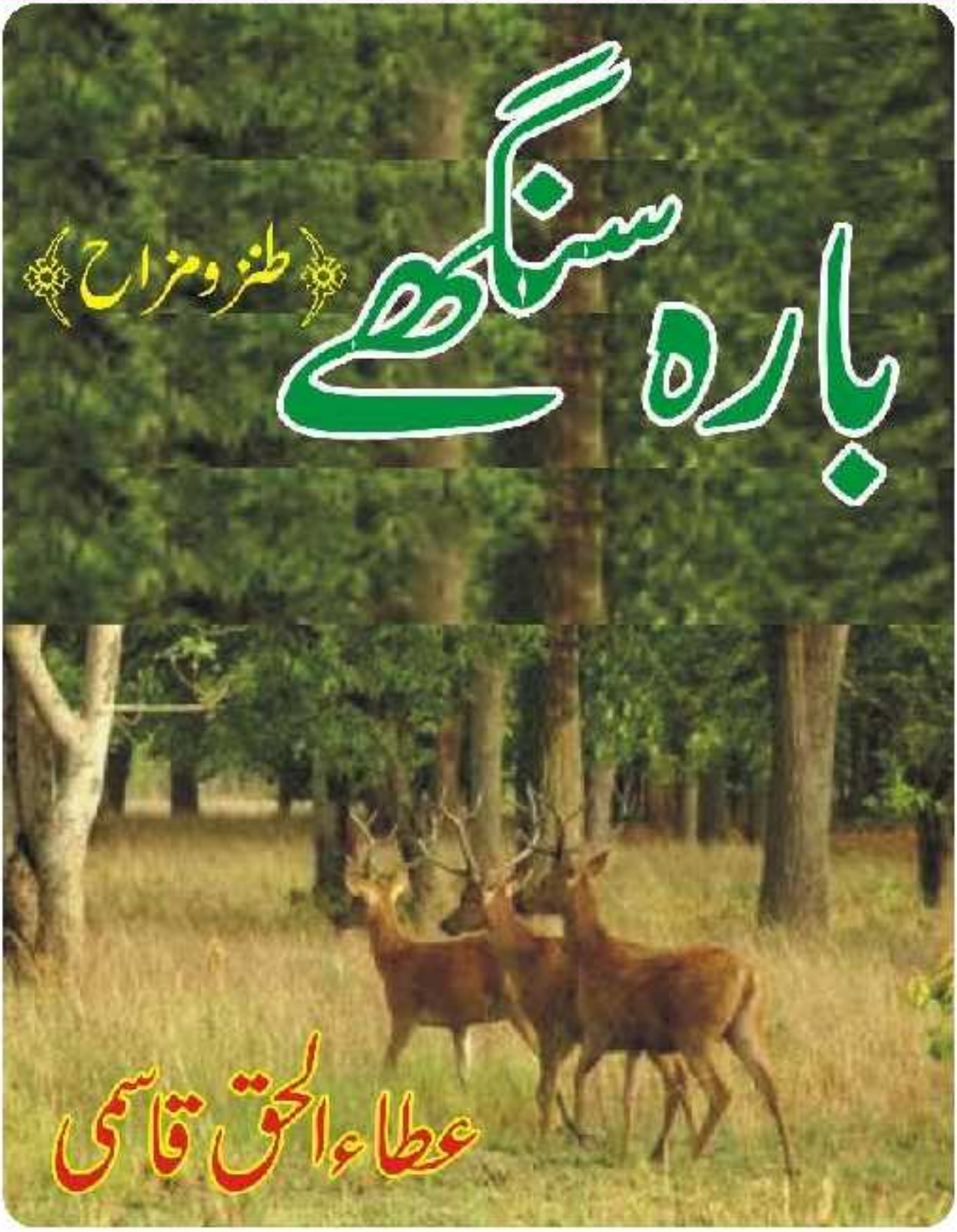
بارہ سنگھے
طنز و مزاح
عطاء الحق قاسمی

گھر کیسا لگا ہے؟

میں بنیادی طور پر سیاح ہوں۔ میں نے آج سے تقریباً تیس برس قبل اس وقت آدھی دنیا کو کھنگال ڈالا تھا جب میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے امریکہ تک ''مار'' کی لیکن ڈالر اور گرین کارڈ کی ''کشش'' بھی میری اس ''کھچ'' کو کم نہ کر سکی جو مجھے اپنے پاکستان کے لئے محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ڈیڑھ دو سال کے عرصے ہی میں واپس پاکستان آ گیا۔ اور میں نے دوبارہ تین سو تیئس روپے ماہوار پر ''ندائے ملت'' جائن کیا۔ امریکہ جانے سے پہلے تو پھر بھی میرے پاس ایک عدد ففٹی سی سی ہونڈا موٹر سائیکل تھا۔ واپسی پر وہ بھی نہیں تھا کہ اسے بیچ کر سفر کے لئے زادِ راہ جمع کیا تھا۔ امریکہ میں جو کمایا تھا وہ امریکہ میں امریکہ کی سیاحت ہی پر خرچ کر دیا۔ یا واپسی پر بائی روڈ آتے ہوئے یورپ' ترکی اور ایران کی سیاحت میں گنوا دیا۔ میں خالی ہاتھ دنیا کی سیاحت پر نکلا تھا اور خالی ہاتھ ہی واپس آیا۔ مگر واپسی پر مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی جنت میں واپس آ گیا ہوں۔

یہ جنت مجھے کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی' بعد میں سیمیناروں' کانفرنسوں اور مشاعروں کے ضمن میں بارہا امریکہ' یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ اتفاق اتنا زیادہ تھا کہ ایک دفعہ ایک دوست نے اپنے کالم میں ایک قاری کے خط کے جواب میں لکھا کہ ''آپ نے جس مسئلے کے بارے میں دریافت کیا ہے، وہ عطاء الحق قاسمی کا شعبہ ہے اور وہ خوش قسمتی سے ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں'' مگر اس کے باوجود صورتحال یہ تھی کہ پاکستان سے باہر جانے کا شوق بھی فراواں ہوتا تھا۔ لیکن پاکستان سے باہر جاتے ہی پاکستان یاد بھی آنے لگتا تھا۔ اور کچھ اس قدر یاد آتا تھا کہ حد پندرہ دن کے بعد میرے لئے ایک دن بھی باہر گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں کتنی ہی مصروفیت چھوڑ کر واپس اپنی سنہری گلیوں اور روشن دیاروں والی سرزمین کا رخ کرتا تھا۔

سوا دو برس قبل جب محترم نواز شریف نے مجھے ناروے میں پاک وطن کی سفارت کاری کا اعزاز بخشا تو میرے گھر میں رونا پٹنا پڑ گیا کہ آخر وہ بھی میرے گھر والے تھے' بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر راضی کیا کہ اس دفعہ سفر کی نوعیت اور طرح کی ہے لہٰذا یہ رونا دھونا چھوڑو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے پاکستان کی بہتر خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے گھر والوں کو تو متفق کر لیا لیکن میں خود اندر سے گھبرایا ہوا تھا کہ اتنا عرصہ ملک سے باہر کیسے گزاروں گا۔ چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنا فیصلہ بدلنے کا ارادہ کر لیا۔ اور ایک دوست سے بات کر کے محکمہ تعلیم میں ایک ''کھڈے لائن'' اسامی اپنے لئے تلاش کر لی۔ دیگر تفصیلات چھوڑتے

ہوئے قصہ مختصر یہ ہے کہ بہت سے نشیب و فراز کے بعد بال آخر میں ناروے پہنچ گیا۔ جو کہ شاید دنیا کے خوبصورت ترین ملکوں میں سے ہے۔ مگر میرا دل اس جنت نظیر سرزمین میں بھی نہیں لگا کہ جب دل میں پہلے سے کوئی بستا ہو تو پھر کسی اور کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ چنانچہ مجھے جب بھی موقع ملتا میں اپنی گلیوں کی خاک اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کے لیے پاک سرزمین کا رخ کرتا۔

ناروے میں اپنی سفارت کے دو سال مکمل کرنے کے بعد مجھے تھائی لینڈ کوچ کرنے کا حکم ملا۔ مجھے پاکستان گئے ہوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے تھے' میں نے سوچا میں سیدھا تھائی لینڈ جاتا ہوں۔ وہاں جائن کر کے دس پندرہ دن کے بعد کچھ دنوں کے لئے پاکستان چلا جاؤں گا لیکن جب تھائی لینڈ آیا تو دیکھا کہ یہاں کا سفارت خانہ تو ناروے کے پاکستانی سفارت خانے سے تین گنا بڑا ہے۔ یہاں یو این او کا ریجنل آفس بھی ہے۔ ''آسیان'' بھی ہے۔ اور دوسرے بہت سے بکھیڑے ہیں۔ کچھ نئے بکھیڑے میں نے خود پالے جن میں سے ایک تھائی لینڈ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اقبال سیمینار اور کل پاکستان اقبال مشاعرے کا انعقاد تھا۔ جس میں پاکستان سے سولہ نامور سکالر اور شعراء شریک ہوئے۔ یوں تین مہینے سفارتی اور ثقافتی مصروفیات ہی میں گزر گئے۔ اور اس طرح پانچ ماہ بعد مجھے پاکستان آنے کا موقع ملا۔

کل 28 اکتوبر 1999ء جب امین نے بنکاک سے لاہور آتے ہوئے جہاز کی کھڑکی میں سے لاہور کا فضائی نظارہ کیا تو یہ شہر روشنیوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ روشنی کی کچھ نئی لکیریں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جو لاہور کی نئی سڑکوں کی سج دھج کا پتہ دے رہی تھیں۔ لیکن جب میں شہر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ سڑکیں سنسان تھیں۔ اور راستے خاموش تھے۔ شاید اس لئے کہ رات ہو چکی تھی۔ میں نے پاک سرزمین کی فضاؤں کا بوسہ لیا۔ اس کی سلامتی کی دعا کی۔ اور اقبال ٹاؤن میں واقع اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو مجھے در و بام شفیق سلیمی کا یہ شعر سنائی دیا۔ لگتا تھا کوئی پرسوز لے میں یہ شعر میرے دل و دماغ میں گنگنا رہا تھا۔

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

◆◆◆

اظہار افسوس نہ کریں!

ناروے سے تھائی لینڈ میری پوسٹنگ بطور سفیر ہوئی تو میں نے فارن آفس کی اجازت سے' پاکستان میں کچھ وقت گزارنے کی بجائے سیدھا بنکاک وتھائی لینڈ کا رخ کیا۔اور 23 جولائی کو اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔تین ہفتوں کے بعد 14 اگست تھا۔اس دوران تھائی لینڈ کی اہم شخصیات سے کرسٹی کالز بھی کرنا تھیں۔اور اس کے علاوہ بہت سے دوسرے اہم کام تھے۔یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بنکاک میں میرے جو کولیگز تھے۔وہ فرض شناسی اور مستعدی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ان میں سید افتخار حسین شاہ (ہیڈ آف چانسری) راجہ شبیر حسین (قونصلر افیرز) اور سید طاہر رضا نقوی (کمرشل افیرز) تھے۔وقت اگرچہ بہت کم تھا۔اور بنکاک میں پاکستانی کمیونٹی کم بھی ہے اور بکھری ہوئی بھی ہے۔اس کے باوجود 14 اگست کی تقریبات بہت دھوم دھام سے منعقد ہوئیں۔صبح پرچم کشائی کی تقریب میں تقریباً دوسو پاکستانیوں نے شرکت کی۔اور بنکاک میں یہ مثالی حاضری تھی۔شام کو ایک بڑے ہوٹل میں سفارتخانے کی طرف سے تحریک پاکستان پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔جس میں یونیورسٹی کے تھائی پروفیسروں نے پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے نہایت پرمغز مقالات پڑھے۔اس کے بعد پاکستانی تاجروں کی مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔جس میں مقامی اور پاکستانی باشندوں نے بہت دلچسپی لی۔آخر میں بچوں کے لئے ایک کلچرل شو تھا اور اس میں پاکستانی بچوں کی پرفارمنس حیران کن حد تک اچھی تھی۔

پھر ایک دن یو این او کے مقامی دفتر کے سامنے سینکڑوں کی تعداد میں تھائی مسلمانوں اور پاکستانیوں نے کشمیر پر انڈیا کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور اس ضمن میں یو این او کے حکام کو ایک یادداشت بھی پیش کی۔

اس دوران بنکاک کے دو بڑے انگریزی اخباروں ''بنکاک پوسٹ'' اور ''دی نیشن'' کے ایڈیٹروں کے ساتھ میں نے ان کے دفاتر میں ملاقات کی یہ ایک خیر سگالی نوعیت کی ملاقات تھی میں راجہ شبیر کی معیت میں ممتاز تھائی عالم دین امام یٰسین سے بھی ملا۔نماز ان کی امامت میں ادا کی اور پھر ان کے دفتر میں مسجد کی انتظامیہ کے ارکان کے ہمراہ ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔تھائی مسلمان تھائی حکومت کی روادارانہ پالیسیوں سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔تھائی لینڈ کے وزیر خارجہ اور قومی اسمبلی کے سپیکر پرجوش مسلمان ہیں۔میرے پروگرام میں تھائی لینڈ کے شیخ الاسلام سے ملاقات بھی شامل تھی مگر میں 12 اکتوبر کے بعد واپس آ گیا اور یوں یہ ملاقات نہ ہو

سکی۔

تھائی لینڈ میں اقبال یا اردو ادب کے حوالے سے کبھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہاں کی زرخیز زمین میں یہ بیج بھی بونا چاہیے چنانچہ اپنے کولیگز اور پاکستانیت کے جذبے سے لیس چند پاکستانیوں جن میں غلام سجاد، مشتاق مگسی اور حافظ خضر حیات خصوصا بہت نمایاں ہیں۔ اقبال تقریبات کا ڈول ڈالا گیا۔ ان تقریبات پر لاکھوں روپے خرچ ہونا تھے اور ہم نے حکومت پاکستان سے ایک پیسہ کی مدد لئے بغیر ان تقریبات کا اہتمام کیا۔ پاکستان سے سترہ دانشور مدعو کئے گئے، چنانچہ تھائی لینڈ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اقبال سیمینار اور کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کی کیسٹ پاکستان ٹیلیویژن کو ارسال کی گئی، مگر خبرنامے میں اسے جگہ نہ دی گئی کیونکہ حکومت بدل گئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ نئی حکومت کے میاں نواز شریف سے تو اختلافات ہو سکتے ہیں۔ لیکن تصور پاکستان کے خالق اقبال، پاکستانی کمیونٹی اور پاکستانی سفارت خانے سے انہیں عناد کیسے اور کب سے شروع ہو گیا؟

جن اقبالی تقریبات کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں ایک تقریب بنکاک کی ایک یونیورسٹی میں تھی اور یہ پروفیسر فتح محمد ملک لیکچر پر مشتمل تھی جس کا عنوان تھا ''اقبال کی شاعری میں مہاتما بدھ کا امیج'' اس تقریب میں یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طالب علموں کے علاوہ بدھ بھکشو بھی شریک ہوئے۔ یہ سب تقریبات سولہ اکتوبر کو منعقد ہونا تھی مگر بعض فنی مجبوریوں کی وجہ سے ہم انہیں ایک ہفتہ پہلے لے گئے اور یوں (خدا کا شکر ہے) یہ تقریبات 9 اکتوبر کو منعقد ہوئیں، 12 اکتوبر کو دانشوروں اور شعراء کی پاکستان واپسی شیڈول تھی، یہ سب مسافر خوشی خوشی جہاز میں سوار ہوئے اور جب ان کے جہاز نے لاہور ائیر پورٹ پر لینڈ کرنا چاہا تو پائلٹ کو پیغام ملا کہ جہاں سے آئے ہو (شرافت سے) واپس وہیں چلے جاؤ، چنانچہ پائلٹ کان لپیٹ کر پانچ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد واپس بنکاک پہنچ گیا۔ اور پھر ان دوستوں نے مزید دو دن ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر حسن رضوی کا پہلے سے پروگرام 12 اکتوبر کی بجائے 14 اکتوبر کو واپسی کا تھا، چنانچہ باقی ''مسافران پاکستان'' کو جہاز میں سوار کرا کے میں انہیں اپنے پاس ایمبیسی ریذیڈنس میں لے آیا تھا۔ 12 اکتوبر کو ہم رات اپنے ٹی وی روم میں پی ٹی وی ورلڈ دیکھ رہے تھے کہ اچانک خبروں کے درمیان ٹی وی کا رابطہ منقطع ہو گیا اور پھر بی بی سی اور سی این این سے کنفیوژنگ خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ پی ٹی وی ورلڈ کا رابطہ بحال ہوا تو اس پر یہ پٹی چلنا شروع ہو گئی کہ ''جنرل پرویز مشرف قوم سے خطاب فرمائیں گے'' ہم تینوں دوست بہت پریشان تھے، میری پریشانی پاکستان کے بارے میں تھی اور اصغر ندیم سید اور حسن رضوی کو پاکستان کے علاوہ میری سفارت کے مستقبل کے حوالے سے بھی پریشانی تھی جب انہوں نے دو تین دفعہ اس کا اظہار کیا تو میں نے کہا ''آپ کی محبت کا شکریہ، لیکن اگر آپ مجھے واقعی جانتے ہیں تو پھر میرے بارے میں پریشان

نہ ہوں' صرف پاکستان کی فکر کریں'' اور اس کے کچھ دیر بعد صوفے پر ٹانگیں پسار کر سو گیا!

ہجر ہو یا وصال ہو اکبر
جاگنا ساری رات مشکل ہے

18 اکتوبر کو میں نے چارج چھوڑ دیا۔ اور 28 اکتوبر کو واپس پاکستان آ گیا۔ اس عرصے میں مجھے امریکہ' یورپ اور گلف کے ملکوں میں پھیلے ہوئے بے شمار احباب کے فون آئے جن میں سے بیشتر پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے تشویش کا اظہار کرتے اور کچھ اس امر پر افسوس کرتے کہ آپ نے ڈھائی مہینے کے مختصر عرصے میں اتنے سارے کام کئے' اور آپ کو جانا پڑ رہا ہے یہ بات کچھ دوستوں نے مجھے پاکستان میں بھی کہی..... میں اپنے ان احباب کے محبت بھرے جذبات کے لیے ممنون ہوں لیکن محض ان کی یاددہانی کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں پروفیسر اور کالم نگار بھی ٹھیک ٹھاک ہوں اور اگر کوئی پروفیسر یا کالم نگار اپنے ضمیر کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اس کا مرتبہ کسی سفیر سے کم نہیں ہوتا۔ بطور سفیر تو میرے رستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ جس سے بسا اوقات میرا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا' مگر ایک درس دینے والے یا ایک ایک لکھنے والے کے طور پر میرے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں..... اس میں زیادہ سے زیادہ جاں کے زیاں کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ تو کچھ ایسا زیاں نہیں جس کی وجہ سے انسان اپنی زبان بند کر لے..... لہٰذا احباب سے میری درخواست ہے کہ وہ مجھ سے بوقت ملاقات جس موضوع پر چاہیں بات کریں بس میری سفارت جانے پر افسوس کا اظہار نہ کریں۔ آپ افسوس کریں گے تو مجھے افسوس ہوگا۔ میں نہیں چاہتا میرے دوستوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں جن کے نزدیک دنیاوی مناصب اتنے اہم ہوں کہ ان سے علیحدگی پر اظہار تعزیت بھی کیا جا سکتا ہو! حالانکہ اس نوع کے بعض مواقع پر مبارک باد بھی دی جا سکتی ہے!

◆◆◆

نامہ اعمال نہ دیکھ!

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، بہت کم لوگوں کو اپنے مفادات پر اپنے نظریات کو ترجیح دیتے دیکھا ہے، بلکہ سچی بات پوچھیں تو ہمارے درمیان بہت کم لوگ ایسے ہیں جو نظریات وغیرہ کے چکر میں پڑتے ہیں، حکمرانوں کے سامنے سچی بات کہنے یا اس پر اسٹینڈ لینے سے کتراتے ہیں، مگر گزشتہ تین ہفتوں کے دوران دانشور کہلانے والے طبقے نے جو قلابازیاں کھائی ہیں۔ ان کے سامنے تو چینی بازی گروں کے کرتب بھی ماند پڑ گئے ہیں، ابھی موجودہ حکومت نے ''خوشامدیوں کی ضرورت ہے'' کا باقاعدہ اشتہار بھی جاری نہیں کیا اور رضا کارانہ طور پر سینکڑوں خوشامدی گلے میں بے غیرتی اور بے حیائی کا طوق سجائے لائن میں لگ گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے گزشتہ دور حکومت میں بھی اپنی خدمات پیش کی تھیں، ان میں کچھ منتخب ہو گئے تھے اور کچھ تھوڑے نمبروں سے رہ گئے تھے، اب یہ دونوں ایک بار پھر قطار میں کھڑے ہیں، ان میں سے کچھ صحافی دوست بھی ہیں جو ''معزول'' وزیر اعظم کے ہیلی کاپٹر سے نیچے قدم ہی نہیں رکھتے تھے، اب وہ چیف ایگزیکٹو کے ہیلی کاپٹر کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ایک صاحب گزشتہ دو برس سے ''ایک ادنیٰ کارکن'' کے لاحقے کے ساتھ میاں نواز شریف کی حمایت میں لاکھوں کے اشتہار اخبارات میں شائع کراتے تھے، انہوں نے ایک منٹ ضائع کیے بغیر 13 اکتوبر کے اخبارات میں جنرل صاحب کی حمایت میں اشتہار شائع کرایا اور اس دفعہ اشتہار کے آخر میں ''ادنیٰ کارکن'' کی بجائے ''ادنیٰ محب وطن'' کے الفاظ لکھے تھے، میں پہلے سمجھتا تھا کہ یہ صاحب اپنے نام کے ساتھ ''ادنیٰ'' کا لفظ انکسار کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر پتہ چلا کہ حقیقت حال بھی یہی ہے۔

سو ان دنوں صورت حال یہ ہے کہ میاں نواز شریف کے خلاف موقع پرستوں کا یہ ٹولہ گز گز بھر لمبی زبانیں نکالے زہر افشانی میں مشغول ہے، حتیٰ کہ اس شخص کو انڈیا کا ایجنٹ بھی کہا گیا جس نے سپر پاور کی دھمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے انڈیا کے پانچ کے مقابلے میں چھ ایٹمی دھماکے کئے اور پاکستانی قوم کو ہمیشہ کے لئے انڈیا کی برتری کے خوف سے نجات دلا دی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا یہ سب کچھ موجودہ حکومت کی منشا کے بغیر رضا کارانہ بے غیرتی کے جذبے کے تحت کیا جا رہا ہے، اس طبقے کو یہ غلط فہمی ہے کہ شاید اس سے ان کے نمبر بڑھ سکتے ہیں، حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ اس سے نمبر کٹ بھی سکتے ہیں، موجودہ حکومت نواز شریف کے کچھ اقدامات کے خلاف ہے، سب اقدامات کے خلاف نہیں وہ جانتی ہے کہ کون محب وطن ہے اور کون نہیں ہے..... اور اگر نہیں جانتی تو پھر ایک دفعہ

وزیر ایک دفعہ وزیر اعلیٰ اور ایک دفعہ وزیر اعظم بننے والے شخص کے بارے میں یہ نئی اطلاع انہیں جتنی تاخیر سے ملی ہے وہ ان کے لیے ندامت کا باعث بن سکتی ہے۔

جب جنرل ایوب خاں کے اقتدار کو سورج نصف النہار پر تھا ان کے ایک وزیر خلیق الزماں ہوا کرتے تھے جو ہر وقت ان کی شان میں رطب اللسان رہتے تھے وہ اپنی اس خوشامد میں اتنے بدنام ہو گئے کہ لوگوں نے ہر خوشامدی کو خلیق الزماں کہنا شروع کر دیا تھا اور جب ایوب خاں اقتدار سے فارغ ہوئے تو اسی خلیق الزماں نے ان کیخلاف ایک بھرپور بیان دیا۔ صہبا اختر مرحوم سے یہ قلابازی ہضم نہ ہوئی۔ چنانچہ ان کا یہ شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا.....

قیامت تو یہ ہے کہ ایوب خاں کو
خلیق الزماں تک برا کہہ رہے ہیں

خلیق الزماں والا سانحہ صرف ایوب خاں کے ساتھ نہیں ہوا۔ یحییٰ خاں کے ساتھ بھی ہوا اور مرحوم ضیاء الحق کے ساتھ بھی ہوا جو لوگ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ سارے اقتدار میں شریک رہے وہ انٹرویو دے رہے ہیں اور کتابیں لکھ رہے ہیں کہ ان کا ضیاء الحق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

میں جنرل پرویز مشرف کی پریس کانفرنس میں نہیں تھا مگر ملک کے ہر چیف ایگزیکٹو کی ہر پرفارمنس پر ارد گرد موجود خوشامدی ٹولہ جس طرح زبان سے یا اشاروں کنایوں سے داد تحسین کے ڈونگرے برساتا ہے اس کی تصویر پوری طرح میرے ذہن میں ہے ہر چیف ایگزیکٹو شروع شروع میں اسے خوشامد سمجھتا ہے مگر بعد میں اس پر یقین کرنے لگتا ہے اور اس کا زوال اسی لمحے سے شروع ہو جاتا ہے آج بھی خوشامدیوں کے غول کے غول اخباروں کے صفحات میں دندنا رہے ہیں ان میں دانشور بھی ہیں صحافی بھی ہیں سیاست دان بھی ہیں علمائے کرام بھی ہیں مشائخ عظام بھی ہیں اور قانون اور آئین کے محافظ وکلاء صاحبان بھی ہیں۔ چیف ایگزیکٹو کو چاہئے کہ وہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ اور بعض دوسرے محکموں سے وہ لسٹیں منگوا کر دیکھ لیں جن میں ہر ایک کے نام کے سامنے کچھ رقم لکھی ہوتی ہے اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ بوقت ضرورت کوئی اپنی اوقات سے زیادہ طلب نہ کر سکے گا البتہ کرنل صولت رضا اور کرنل اشفاق حسین کو چاہیے کہ اس لسٹ میں شامل دانشوروں کے نام وہ چیف ایگزیکٹو سے چھپا جائیں کہ اس کے بعد چیف ایگزیکٹو کے دل میں ان کی دانشور برادری کے لئے کوئی عزت نہیں رہے گی۔

داور حشر مرا نامہ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

◆◆◆

کچھ بے معنی سی باتیں

میرے ساتھ ایک بہت دیرینہ پرابلم ہے اور وہ یہ کہ کبھی کبھار میرا دماغ بالکل کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس عالم میں' میں اگر لکھنے بیٹھوں تو گھنٹوں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں؟ آج صبح یوم اقبال کی تقریب کے لئے کچھ لکھنے بیٹھا تو میرے ساتھ یہی معاملہ ہوا' مجھے محسوس ہوا میرا دماغ مکمل طور پر بند ہے۔ میں نے اقبال کا کوئی شعر یاد کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے میں نے اقبال کبھی پڑھا ہی نہیں' اس کے فلسفہ خودی کے بارے میں سوچا تو مجھے کچھ یاد نہ آیا بلکہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ خودی کس چڑیا کا نام ہے؟ پھر میں نے سوچا کہ بات حالات حاضرہ سے شروع کرتا ہوں مگر حالات حاضرہ کا ''شروع'' ہی میرے پلے نہیں پڑا۔ میں خاصا نروس ہوا کیونکہ میں سارا سال یوم اقبال کا انتظار کرتا ہوں کہ دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ نادر موقع ہوتا ہے اور آپ میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ مجھے آپ کے حصے کی بھڑاس بھی نکالنا ہوتی ہے' مجھے مزید نروس یہ خیال کر رہا تھا کہ اس دفعہ یوم اقبال کے سبھی شرکاء ادیب اور دانشور ہیں' اگرچہ ہمارے ہاں ادیبوں کا ایک طبقہ حالات حاضرہ کے بارے میں براہ راست اظہار خیال کو ادب اور ادیب کے منصب کے منافی سمجھتا ہے مگر تقریب تو یوم اقبال کے حوالے سے ہے اور اقبال ادب اور زندگی کو علیحدہ چیز نہیں سمجھتے' تاہم بات کچھ بھی ہو اتنے بڑے بڑے ادیبوں کی موجودگی میں لب کشائی کرنا دل گردے کا کام ہے اور مجھے یہی خیال نروس کر رہا تھا۔

بال آخر میرا یہ مسئلہ بھی ادب اور ادیب ہی کے حوالے سے حل ہوا مجھے یاد آیا کہ ادب میں تحریک بے معنویت کے حوالے سے بھی تو ہے' اس کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ زندگی کی اپنی کونسی کل سیدھی اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ ہم بھی سیدھی اور سمجھ میں آنے والی باتیں کریں۔ اس موقع پر مجھے منیر نیازی کی ایک اداس کر دینے والی نظم بھی یاد آئی۔

سورج چڑھیا پچھّم توں تے پورب آن کھلویا
اج دا دن وی ایویں ای لنگیا' کوئی وی کم نہ ہویا
ناں ملیاں میں خلقت نوں
ناں یاد خدا نوں کیتا
ناں میں پڑھی نماز تے

ناں میں جام شراب دا پیتا
خوشی ناں غم کوئی کول ناں آیا
ناں ہسیا' ناں رویا
اج دا دن وی ایویں ای لنگیا
کوئی وی کم نہ ہویا

سوخواتین وحضرات! میں اور آپ روزانہ اس دن کا انتظار کرتے ہیں' جب وہ کام ہو جس کا خواب اقبال اور قائد نے دیکھا تھا' مگر ہر دفعہ وہ کام ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ مجھے اس موقع پر محمد منشا یاد کا ایک افسانہ ''بوکا'' یاد آ رہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت پیاسے مرد عورتیں اور بچے ایک کنوئیں کے پاس کھڑے ہیں' ان کی آنکھیں ویران ہیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں' وہ سب پریشان ہیں کیونکہ پانی ان کے سامنے موجود ہے ہے مگر کنوئیں سے پانی نکالنے والا بوکا کنوئیں میں گرا ہوا ہے اور ایسا ہر دوسرے تیسرے دن ہوتا ہے' بال آخر ایک نوجوان ہمت کر کے کنوئیں میں اترتا ہے اور بڑی مشکل سے بوکا باہر نکال کر لاتا ہے۔ ایک بزرگ شخص حاضرین کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے ''آخر ہم میں سے کون ہے جو بوکا کنوئیں میں پھینکتا ہے؟'' مجمع میں سے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص آگے بڑھتا ہے' اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والی چھری ہے' وہ بوکے کی رسی کاٹتا ہے جس سے بوکا ایک دفعہ پھر کنوئیں میں جا گرتا ہے اور وہ حاضرین کو مخاطب کر کے کہتا ہے ''یہ بوکا میں کنوئیں میں پھینکتا ہوں'' اور مجمع بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہے!

خواتین وحضرات! مجھے مجمعے کی یہ بے بسی کبھی سمجھ میں نہیں آئی' چھری والے سے اور کچھ نہیں' کم از کم یہ تو پوچھا جا سکتا ہے کہ میاں تم کیوں ہر دوسرے تیسرے دن بوکا کاٹ کر کنوئیں میں پھینک دیتے ہو' ممکن ہے اس کے پاس اس کی بہت جاندار وجوہات ہوں۔ شفیق الرحمن کی ''تزک نادری'' میں نادر شاہ اپنے وزیر کو بلاتا ہے اور کہتا ہے ''ہم ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں' اس کی وجوہات تیار کرو'' وزیر جو وجوہات تیار کرتا ہے اس میں ''فوری وجہ'' یہ بیان کی جاتی ہے کہ ''بہت عرصے سے ہندوستان پر حملہ نہیں ہوا تھا'' بظاہر یہ وجہ مضحکہ خیز لگتی ہے لیکن یہ ہمارے لئے مضحکہ خیز ہے' نادر شاہ کے لئے نہیں!

میرا خیال تھا کہ میں بے معنی اور بے تکی باتیں کافی دیر تک کر سکتا ہوں مگر میرا سانس تو ابھی سے پھول گیا ہے' یہ ہمارے رہنماؤں ہی کا کمال ہے کہ وہ گھنٹوں بے معنی اور بے تکی باتیں کر سکتے اور الٹے سیدھے بیانات دے سکتے ہیں چنانچہ میں حاضرین سے معذرت

خواہ ہوں کہ اس باران سے کھل کر باتیں نہیں ہوسکیں' آخر میں آپ کو ایک مختصر سا واقعہ سنا کر آپ سے اجازت چاہوں گا' کسی زمانے میں میری آنکھ میں کچھ پرابلم ہوگیا تھا' میرے ایک دوست جو کوالیفائیڈ ڈاکٹر نہیں ہیں مگر ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان سے آپریشن کروایا جائے' ایک دن میرے پاس تشریف لائے' ان سے جو گفتگو ہوئی' وہ کچھ یوں تھی!

''کیا تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو''

''یقیناً میں کند ذہن ہوں''

''کیا میں کند ذہن ہوں''

''نہیں تم بڑے پڑھے لکھے اور ذہین شخص ہو''

''میری پاکستانیت کے بارے میں تمہیں کوئی شبہ ہے''

''ہرگز نہیں' تم پکے محب وطن ہو!'' اس پر وہ چلا کر بولا ''اگر میں تمہارا دوست بھی ہوں ذہین اور پڑھا لکھا بھی ہوں اور محب وطن بھی ہوں تو پھر تم مجھ سے آنکھ کا آپریشن کیوں نہیں کراتے؟'' میرے پاس اس منطق کا کوئی جواب نہیں تھا!

خواتین وحضرات! آخر میں ایک معذرت اس بات کی بھی کہ جو کچھ میں نے کہا اس کا اقبال سے کوئی تعلق نہیں تھا' مگر ایک فیصد ہی سہی' یہ امکان بھی بہرحال موجود ہے کہ آج کے یوم اقبال سے انہی باتوں کا کوئی تعلق ہو' جن کا بظاہر اقبال یا یوم اقبال سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ وما علینا الا البلاغ

(مرکزیہ مجلس اقبال کے زیر اہتمام لاہور میں منعقد یوم اقبال کی تقریب میں پڑھا گیا)

◆◆◆

بلیاں اور کتے

مجھے بلیاں بچپن ہی سے بہت پسند ہیں اور میری یہ پسندیدگی ابھی تک قائم ودائم ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے ایک بلا ہم نے پالا ہوا ہے جو مجھے بہت پیارا لگتا ہے گوراچٹا' بڑی بڑی مونچھیں' کسرتی جسم اور بہت نفیس عادتوں کا مالک! ہم گھر والوں نے اس کا نام پیار سے ''بلا پہلوان'' رکھا ہوا ہے۔ بلا پہلوان اپنے طور طریقوں اور رہن سہن میں بہت مستقل مزاج واقع ہوا ہے۔ یہ سردیوں میں ہیٹر کے پاس اور گرمیوں میں فریج کے پاس آ کے بیٹھتا ہے۔ دودھ رغبت سے نہیں پیتا' البتہ گوشت بڑے شوق سے کھاتا ہے فریج کا دروازہ کھولیں تو دوڑا دوڑا آتا ہے مگر ندیدوں کی طرح آپکی ٹانگ کو سیڑھی بنا کر فریج میں منہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ صرف منہ سے نہایت سریلی آواز میں میاؤں میاؤں کر کے آپ کو یاد دلاتا ہے کہ اس کے بھی کچھ جبلی تقاضے ہیں۔ بلے پہلوان کی ایک عادت جو مجھے بہت پسند ہے' وہ اس کی صفائی پسندی ہے' وہ کبھی گھر میں گند نہیں ڈالتا' بس ایسے مواقع پر چپ چاپ گھر سے باہر نکل جاتا ہے اور کسی جھاڑی کا رخ کرتا ہے اپنی عادتوں سے وہ جس قدر متقی اور پرہیز گار لگتا ہے' اس کا بس چلے تو ایسے مواقع پر اس کے ہاتھ میں لوٹا بھی ہو!

بلا پہلوان بظاہر امن پسند اور صلح جو قسم کا بلا لگتا ہے لیکن ہر چوتھے پانچویں دن گھر میں لہولہان داخل ہوتا ہے' ممکن ہے اسے اپنے دفاع میں کچھ کرنا پڑتا ہو تاہم اس ضمن میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زخمی ہونے کے دو چار دن بعد تک وہ گھر کے ٹی وی لاؤنج میں پڑا رہتا ہے' ٹی وی پر کوئی اچھی شکل نظر آئے تو چند لمحوں کے لئے کنکھیوں سے اسے دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں موند لیتا ہے' البتہ ریسلنگ چل رہی ہو تو ان لمحوں میں وہ کنکھیوں سے بھی ٹی وی کی طرف نہیں دیکھتا۔ جب اس کے زخم بھر جاتے ہیں تو وہ پھر باہر آنا جانا شروع کر دیتا ہے۔ ہم گھر والوں کو تجسس تھا کہ اتنے شریف النفس قسم کے بلے نے آخر کس سے دشمنی پالی ہوئی ہے اور کیوں پالی ہوئی ہے کہ ہر چوتھے دن اس سے متھا لگاتا ہے اور کیوں لگاتا ہے اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس سے بھڑ جاتا ہے۔ ایک دن ہم نے اس کے دشمن اور دشمنی کا راز پا لیا۔ کچھ عرصہ قبل سامنے بازار سے سودا سلف خرید کر میں گھر کی طرف آ رہا تھا کہ میں نے ایک بلا دیکھا جو ہمارے پہلوان سے بھی زیادہ خوبصورت اور پلا ہوا تھا بلکہ عمر میں بھی اس سے بہت کم تھا۔ یہ اپنی جوانی کے گھمنڈ میں جھومتا جھامتا سامنے چلا آ رہا تھا۔ اتنے میں براؤن رنگ کی ایک بھلے مانس سی بلی اسکے قریب سے گزری۔ موصوف اسے دیکھ کر رک گئے اور غرانا

شروع کر دیا۔ بلی بھی رک گئی اور اس نے غراہٹ کا جواب غراہٹ سے دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے مگر کچھ ہی دیر بعد بلی نے محسوس کیا کہ اس کا مدمقابل اس سے بھی طاقتور ہے چنانچہ وہ دم دبا کر بھاگ گئی۔ بعد میں اس مغرور بلے کی ادھر ادھر سے کچھ اور شکایات بھی ملیں بہرحال کچھ روز بعد میں نے دیکھا کہ اس نوجوان بلے کا ہمارے پہلوان سے آمنا سامنا ہو گیا' دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے مگر میں نے آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس دن کے بعد سے بلا پہلوان ہر دو چار دن کے بعد لہولہان حالت میں گھر میں داخل ہوتا اور زخم بھرنے پر پھر مقابلے کے لئے نکل کھڑا ہوتا!

البتہ کچھ عرصے سے میں نے بلے پہلوان اور مغرور بلے کے رویوں میں ایک نہایت دلچسپ تبدیلی دیکھی ہے' مغرور بلا رزق کی تلاش میں یا بلے پہلوان کی تلاش میں کبھی کبھار ہمارے گھر کی دہلیز میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔ جب ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو دونوں زمین کے ساتھ چپک سے جاتے ہیں اور کمانڈوز کی طرح گھات لگا کر بیٹھ جاتے ہیں مگر مزے کی بات یہ ہے کہ گھنٹوں اس حالت میں رہتے ہیں' آنکھ تک نہیں جھپکتے اور ایک دوسرے پر حملہ آور بھی نہیں ہوتے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس عالم میں انہیں گوشت ڈالا جائے یا مار بھگانے کی کوشش کی جائے تو بھی یہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے اور مسلسل اسی طرح ''مورچہ بند'' رہتے ہیں' پھر آہستہ آہستہ پسپائی کا عمل شروع ہوتا ہے مگر اس کے بعد بھی میں نے پہلوان کو دیکھا ہے کہ وہ کافی دیر تک نارمل حالت میں واپس نہیں آتا' غالباً دونوں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اب دونوں کے درمیان انا کا مسئلہ بھی ہے اور یہ انا بہت بری چیز ہے۔

جیسا کہ میں نے کالم کے شروع میں کہا تھا کہ مجھے بچپن ہی سے بلے بلیوں سے بہت پیار ہے اور میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ان کی حرکات وسکنات بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہوں' البتہ کتے مجھے کبھی اچھے نہیں لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر وقت انکی رال ٹپکتی رہتی ہے۔ کتا اگر میرے پاؤں میں لوٹنیاں بھی لے تو بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ کتا' کتا ہی ہوتا ہے میں جب ناروے میں تھا تو میرے لینڈ لارڈ پال کے پاس دو عدد بہت خوفناک سے کتے تھے' وہ اگر کبھی راہ میں مل جاتا یا میں کبھی اس کی طرف جاتا تو یہ کتے مجھ سے بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے لیکن میں نے ان کی اس کوشش کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک دفعہ پال پہاڑوں پر چھٹیاں گزارنے گیا' وہ ان دو میں سے جو زیادہ لاڈلا کتا تھا' اسے اپنے ساتھ لے گیا' ایک دن یہ کتا پال کے بغیر اکیلا گھر سے باہر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ وہ سردی میں اکڑ کر مر گیا تھا۔ پال پر اس کی ناگہانی وفات کا اتنا اثر ہوا کہ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑے اور اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا!

بلیوں کی وفاداری گھر سے ہوتی ہے اور کتوں کی صرف اپنے مالک سے! شاید اسی لیے کتے مجھے اچھے نہیں لگتے!

◆◆◆

سفارت!

آج کے کالم میں اپنے قارئین کے تین خطوط کی تلخیص درج کر رہا ہوں پہلا خط میرے دوست آصف بھلی ایڈووکیٹ (سیالکوٹ) کا ہے دوسرا خط جناب نظام الدین پنوہاں کا بہاولپور سے ہے اور وہ بھی ایڈووکیٹ ہیں اور تیسرا خط جناب محمد اصغر بٹ نے تحریر کیا ہے جو سابق ڈپٹی میئر (کونسلر وارڈ 62 پاک نگر) ہیں' یہ تینوں خط تقریباً ایک ہی موضوع پر ہیں' آج یہ خط پڑھیں' کل انشاءاللہ اس حوالے سے کچھ باتیں ہوں گی۔ خطوط کی تلخیص درج ذیل ہے۔

سلام ورحمت آپ نے ''اظہار افسوس نہ کریں'' کے عنوان سے اپنے 2 نومبر 99ء کے کالم میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ کچھ دوست سفارت کاری کے منصب سے آپ کی سبک دوشی پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے احباب سے یہ درخواست بھی کی ہے کہ وہ آپ سے سفارت کا منصب جانے پر افسوس کا اظہار نہ کریں ویسے میں بھی آپ سے اظہار افسوس کرنا چاہتا ہوں مگر سفارت کے منصب کا چارج چھوڑنے پر نہیں بلکہ سفارت کے عہدہ کو قبول کر کے کالم نگاری اور درس وتدریس کے فرائض سے غفلت برتنے پر آپ نے ''روزن دیوار'' میں سفارت کی اینٹ لگا کر اسے بند کر دیا اور اس روزن دیوار سے افکار وخیالات کی جو تازہ ہوا اہل پاکستان تک پہنچی تھی اس زندگی آموز ہوا سے آپ نے اپنی کرسی سفارت کی خاطر اہل پاکستان کو محروم کر دیا۔ سفارت کے عہدہ سے آپ کی ''محرومی'' پر آپ سے جو دوست اظہار ہمدردی کر رہے ہیں ان کا نقطہ نظر اپنا ہے میری طرف سے آپ بحیثیت کالم نگاری نئی زندگی ملنے پر سفارت کے مقابلے میں کہیں بڑے مرتبہ ومقام پر بطور کالم نگار دوبارہ فائز ہونے پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ میرا آپ کے ساتھ اس موقع پر اظہار مسرت اس لئے بھی ضروری ہے کہ اب بطور پروفیسر اور کالم نگار آپ یقیناً اپنے فرائض اپنے ضمیر کے مطابق سر انجام دیں گے اور بطور سفیر جن رکاوٹوں کی وجہ سے آپ کو بسا اوقات اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا ان رکاوٹوں کے دور ہو جانے سے اب اپنے ضمیر اور روح پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔

(آپ کا بھائی محمد آصف سیالکوٹ چھاؤنی)

السلام علیکم!

کافی عرصہ سے آپ سے ہمکلام ہونے کو دل چاہ رہا تھا اور آج آپ کے روزن دیوار کو پڑھ کر عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ تو ہمیں آپ کی سفارت کے جانے کا افسوس نہ کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آپ اب پاکستان کیوں لوٹ آئے

ہیں۔آپ کی سفارت اور غیر ملک کے قیام سے جو پاکستان کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے اس کی اب آپ پاکستان واپس آ کر تلافی نہیں کر سکتے۔کیا آپ 93ء سے 96ء تک بے نظیر بھٹو کے خلاف اور اپوزیشن لیڈر نواز شریف کے حق میں اس وجہ سے قوم کو حالات سے آگاہ کرتے رہے کہ میاں نواز شریف کے حکومت میں آتے ہی نواز شریف کو کاسہ لیسوں کی نذر کر کے آپ اپنے محبوب ملک ناروے چلے جائیں گے۔کیا یہی حب الوطنی اور فرض شناسی ہے کہ جس وقت نواز شریف کو آپ کے تنقیدی مشوروں کی ضرورت ہو آپ کے ملک سے باہر اپنی ذاتی انا کی تسکین میں مصروف ہوں۔شاید آپ جانتے ہوں کہ ہم جیسے لوگ آپ کی تحریروں سے متاثر ہو کر نواز شریف کے حامی بنے۔اگر آپ ملک کے اندر ہوتے اپنے کالموں کے ذریعے میاں نواز شریف کو ہدایات و مشورے اور تنقید کرتے رہتے تو قوم کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

(آپ کا مخلص نظام الدین پنوہاں ایڈووکیٹ بہاولپور)

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب!

السلام علیکم! امید ہے آپ خریت سے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی پناہ میں رکھے (آمین) آپ کے ساتھ تعلق ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے ہے۔اور جب بھی آپ کی تقریر یا تحریر پڑھی یا سنی ہمیشہ دل کو سکون ملتا تھا کہ اب بھی کچھ لوگ ہیں جو واقعی اس ملک کی بہتری کے لئے دل میں تڑپ رکھتے ہیں۔آج 9 نومبر کا آپ کا کالم پڑھا دل کو پڑھ کر سکون ملا کہ اب بھی ہے کوئی جو سچی بات لکھے۔میاں نواز شریف صاحب نے اگر آپ پر اعتماد کیا تھا تو یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو کس اچھے طریقے سے پورا کر کے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی ہے۔پوری قوم کو آپ پر ناز ہے۔

(محمد اصغر بٹ سابق ڈپٹی میئر لاہور)

◆◆◆

مشورہ نمبر ایک.....!

گذشتہ کالم میں' میں نے احباب کے خطوط کی تلخیص پیش کی تھی۔ جس میں انہوں نے میری طرف سے سفارت قبول کرنے کے اقدامات کو پسند نہیں کیا۔ محترم نظام الدین پنوہاں ایڈووکیٹ کے خیال میں' میں اگر میاں نواز شریف کے اقتدار میں آنے کے بعد پاکستان میں ہی رہتا تو اپنے کالموں کے ذریعے انہیں اچھے اچھے مشورے دیتا اور یوں موجودہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ برادرم آصف بھلی کا کہنا ہے کہ آپ نے ''روزن دیوار'' میں سفارت کی اینٹ لگا کر اسے بند کر دیا۔ اور اس روزن دیوار سے افکار و خیالات کی جو تازہ ہوا اہل پاکستان تک پہنچتی تھی' اس زندگی آموز ہوا سے آپ نے اپنی کرسی سفارت کی خاطر اہل پاکستان کو محروم کر دیا۔ جب کہ اصغر بٹ صاحب نے لکھا ہے کہ'' آپ نے بطور سفیر اپنی ذمہ داریوں کو اچھے طریقے سے پورا کر کے ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ پوری قوم کو آپ پر ناز ہے۔''

مجھے یہ تینوں خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ یہ پوری نیک نیتی سے لکھے گئے ہیں۔ مجھے زیادہ خوشی ہے اس امر کی ہے کہ ہم لوگ ابھی تک قوم کی طاقت کے قائل ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اہل قلم کے الفاظ کو حکمران بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے اس بات کا علم ہوتا تو میں سفارت کبھی قبول نہ کرتا۔ جس کے نتیجے میں میاں نواز شریف ایک آئیڈیل حکمران ہوتے۔ میں تو اس غلط فہمی میں مارا گیا کہ میں نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم' جنرل ضیاء الحق مرحوم' محترمہ بے نظیر بھٹو اور محترم میاں نواز شریف کی پہلی وزارت عظمیٰ کے دوران اپنے کالموں میں جو کچھ لکھا' اس کی داد اپوزیشن والے ہی دیتے رہے۔ اور صرف اس وقت تک دیتے رہے جب تک وہ اقتدار میں نہیں گئے۔ چنانچہ یہی سمجھتا رہا کہ کالم نگاری ایک کار بے معنی کام ہے۔ جس طرح ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر ادبی موضوعات پر گپ شپ کرتے ہیں اور اس سے ادبی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' اسی طرح کالم تجزیے اور اداریے حکمرانوں کی سوچ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ انہیں وہی کرنا ہوتا جو انہوں نے سوچا ہوتا ہے۔ لیکن ان خطوط خصوصاً برادرم آصف بھلی کی ہلاشیری سے میری رائے تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ میں سوچ رہا ہوں کہ جسٹس کیانی مرحوم' حمید نظامی مرحوم' شورش کاشمیری مرحوم' محمد صلاح الدین اور اس طرح کے دیگر مرحومین کو اگر اپنے دور میں کوئی آصف بھلی اور نظام الدین پنوہاں ایسے رجائیت پسند دوست مل جاتے تو ان کی ساری عمر یہ سوچ کر کڑھتے نہ گزرتی کہ ان کی تحریریں بے اثر جا رہی ہیں۔ بہرحال ان خطوط سے میرے اندر امید کی ایک نئی کرن پیدا ہوئی ہے۔ اور

میں آج سے اللہ کا نام لے کر حکمرانوں اور اپوزیشن والوں کو مشوروں کا سلسلہ شروع کر رہا ہوں۔

حکمرانوں کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ جلد از جلد جمہوریت نہ سہی پاکستانی طرز جمہوریت ہی کو ملک میں نافذ کریں۔ اور اسے کم از کم پچاس سال تک بغیر کسی مداخلت کے چلنے دیں۔ اس بدترین طرز جمہوریت کے بھی انشاء اللہ بہترین نتائج نکلیں گے۔ ثبوت کے لئے بھارت کی مثال موجود ہے جو بدترین سیاستدانوں اور بدترین جمہوریت کے باوجود محض ایک نظام کے تواتر کی وجہ سے سپر پاور بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر جمہوریت وار انہیں کھاتی تو پھر چینی نظام' سعودی نظام' ایرانی نظام کوئی خالص نظام نافذ کریں۔ تاکہ اس کے خالص نتائج سامنے آئیں۔ اس آدھا تیتر آدھا بٹیر یعنی ملاوٹی نظام نے ہمارے سیاسی معدہ کو خراب کر رکھا ہے اور قوم کا زیادہ تر وقت بیت الخلاء میں گزر رہا ہے۔

اپوزیشن والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنی دوستیاں اور دشمنیاں صرف پاکستان کے حوالے سے رکھیں' کسی شخص کے حوالے سے نہیں۔ کیونکہ اگر پاکستان ہے تو میں اور آپ سب ہیں' اگر یہ نہیں تو پھر نہ سر رہیں گے اور نہ دستاریں۔ گردنوں میں غلامی کی زنار ہوگی اور سروں پہ دستاروں کے بجائے بوریاں! کسی ایک شخص کی دشمنی ہمیں اتنا اندھا نہ کر دے کہ ہم پاکستان کے حال اور مستقبل دونوں کو داؤ پر لگا دیں۔

میرے خیال میں آج کے کالم میں اتنے ہی مشورے کافی ہیں۔ مجھے امید ہے' صبح جب ''نوائے وقت'' کا یہ شمارہ حاکموں اور اپوزیشن والوں کی نظر سے گزرے گا' میرے مشوروں پر عمل شروع ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ آصف بھلی اور دوسرے دوستوں نے یہ مجھے مراونے کی سازش کی ہے۔ چنانچہ اگر یہ دوست چاہتے ہیں کہ میرے دل میں ان کے لئے کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو تو میرے ان مشوروں پر عملدرآمد کے لئے ''میدان کارزار'' میں فوراً اتر آئیں ورنہ ان کی ''مسلمانی'' مشکوک ہو جائے گی کہ بقول شاعر:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

آخر میں ان دوستوں کے خطوط کی روشنی میں ایک بات یہ کہ دنیا کی ہر سیاسی جماعت برسر اقتدار آنے کے بعد اپنے نظریاتی ساتھیوں کی ایک مخصوص تعداد کو بیرون ملک سفیر مقرر کرتی ہے۔ یہ اس حکومت کا حق ہوتا ہے' بس فرق یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی سفیر نااہل ہے تو سمجھ لیں کہ وہ غلط بخشی تھی۔ اور ایسے سفیر کا تقرر ملک اور قوم کے ساتھ زیادتی ہے۔ اور اگر اس کی کارکردگی سے اس کی

قوم مطمئن ہے۔اس کا اپنا ضمیر مطمئن ہے۔تو یہ اس کے کالر میں پھول کا اضافہ ہے۔ میں سوا دو سال سفیر رہا ہوں۔ پاکستان کی وزارت خارجہ' ناروے کی وزارت خارجہ' ناروے اور بنکاک میں مقیم پاکستانی کمیونٹی' دانشور اور صحافی اور دوسرے اہل الرائے طبقوں نے الحمداللہ میری کارکردگی کو تحریری طور پر سراہا۔ اصغر بٹ صاحب کا خط اس ضمن میں ہے' میں نے اگرچہ سفارت مانگی نہیں تھی بلکہ مکتوب نگار دوستوں کی طرح میری رائے بھی یہی تھی کہ مجھے اپنے ملک میں رہنا چاہیے۔ مگر بال آخر مجھے جانا پڑا۔ اس کی تفصیل کبھی پھر بیان کروں گا۔ تاہم اس تجربے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نہ جانے پر بضد رہتا تو بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوتا ایک تو اس لئے کہ ملک اور قوم کی خدمت صرف کالم نگاری ہی سے نہیں کی جاسکتی' یہاں تو آپ صرف مشورے دیتے ہیں' وہاں ملک کی خدمت کر کے دکھاتے ہیں۔ دوسرے ایک بالکل نئی دنیا کا مشاہدہ' جس سے میرے وزن میں اضافہ ہوا۔ اس تجربے کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں اس لئے میاں نواز شریف کا ممنون ہوں۔ اس وقت میاں صاحب (اللہ تعالیٰ ان کی مشکلیں آسان کرے) بھی ایک نئے تجربے سے گزر رہے ہیں۔ اور یہ تجربہ بھی انہیں وہ بصیرت دے گا جو سینکڑوں کتابیں بھی نہیں دے سکتیں۔

◆◆◆

کریکٹر کی کوئی قیمت ہی نہیں.....!

آج سے چارہ ماہ قبل ناروے میں یوم حمید نظامی منایا گیا۔جس کا اہتمام حمید نظامی سوسائٹی کے چیئر مین اور پاکستان مسلم لیگ ناروے کے صدر چوہدری انوار الحق نے کیا تھا۔تقریب کی صدرات لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس خلیل رمدے نے کی جبکہ مہمان خصوصی روزنامہ ''دی نیشن'' کے ایڈیٹر عارف نظامی تھے۔میں نے یہ مضمون یا کالم اس تقریب میں پڑھا تھا۔(قاسمی)

خواتین وحضرات.....!صحافت سے میرا تعلق تقریباً 31 سال پر محیط ہے۔عملی صحافت یعنی سب ایڈیٹری میں نے صرف دو سال کی۔بنیادی طور پر میں ایک فری لانسر کے طور پر کالم نگاری ہی کرتا ہوں۔اور یوں اپنے عزیز دوست عبدالقادر جسٹس کے بقول میں ''نیم صحافی'' رہا ہوں' بالکل اسی طرح جس طرح نیم حکیم ہوتے ہیں۔اور خطرہ جان ہوتے ہیں۔دراصل آج کے دور میں یہ ''نیم'' بہت ہو چکے ہیں۔نیم حکیم' نیم صحافی' نیم ڈاکٹر' نیم سیاست دان' نیم عالم' نیم دانشور' نیم اسلام پسند' نیم سوشلسٹ' نیم انصاف پسند' نیم ایماندار وغیرہ وغیرہ۔تو جس معاشرے میں ''نیم'' اتنا تناور ہو جائے وہاں اس کے کڑوے پھل کی افراط نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ان دنوں ہمارے ہاں نیم خواتین اور نیم مرد بھی خاصی معقول تعداد میں نظر آرہے ہیں۔اور پنجابی میں جنہیں ''نامانیم'' کہتے ہیں' وہ اس کے علاوہ ہیں۔اس صورتحال کا (الحمداللہ) ایک مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے اور وہ یہ کہ اب کوئی کسی کو طعنہ دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ بازار میں ایک شخص طوطے بیچ رہا تھا کہ تھتھا (ہکلا) جسے آپ نیم قوت گویائی کا مالک کہہ سکتے ہیں۔اس طوطے بیچنے والے شخص کے پاس گیا اور ایک طوطے کی طرف اشارہ کر کے ہکلاتے ہوئے پوچھا..... ''کیا یہ طوطا بول سکتا ہے؟''۔۔۔۔۔۔۔پیشتر اس کے کہ وہ شخص کوئی جواب دیتا' طوطے نے اس تھتھے کو مخاطب کیا اور غصے سے کہا۔''تم سے تو بہر حال بہتر ہی بول سکتا ہوں''..... سو صورتحال یہ کہ اگرچہ ہر شخص کے پاس دماغ ہے لیکن نیم دماغ ہے' ہر شخص کے منہ میں زبان ہے اور یا پھر گاؤزبان ہے۔مسئلہ صرف یہاں تک ہوتا تو پھر بھی کام چل سکتا تھا۔پرابلم یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی خود کو ''مرد کامل'' سمجھتا ہے۔وہ ''مرد کامل'' جس کی تلاش اور خواہش میں اقبال ''ساری عمر سرگرداں رہا۔ہم آج قلم ہاتھ میں پکڑتے ہیں اور دوسرے دن خود کو یقین دلانا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم سب سے بڑے رائٹر ہیں۔آج کالج میں لیکچرار لگتے ہیں اور دوسرے دن خود کو پروفیسر کہلوانے لگتے ہیں۔آج داڑھی رکھتے ہیں' اگلے دن اپنے نام کے ساتھ ''علامہ'' لکھ دیتے ہیں۔ایک مکینک کی دکان پر تین مہینے ''استاد کا ہاتھ بٹانے کے بعد ایک چھوٹے نے کہا

..... ''استاد جی! میں کام سیکھ گیا ہوں' اب ساری گاڑی خود کھول لیتا ہوں۔ اور پرزے دوبارہ خود جوڑ بھی لیتا ہوں۔ مگر صرف ایک چھوٹا سا پرابلم ہے۔'' استاد نے پوچھا..... ''وہ کیا''.....؟ چھوٹے نے کہا'' جب گاڑی جوڑ لیتا ہوں تو آخر میں مٹھی بھر پرزے پتہ نہیں کیسے بچ جاتے ہیں۔''

خواتین وحضرات.....! یہ پرابلم ہمارے ہاں لگنے والے مارشل لاؤں میں بھی رہا ہے۔ ہمارے ذہین فوجی آمر ساری گاڑی کھول دیتے تھے۔ اور پھر بند بھی کر لیتے تھے۔ مگر آخر میں گاڑی کے مٹھی بھر پرزے بچ جاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں 1971ء میں گاڑی کا انجن ہی ''سیز'' ہو گیا اور اس کے بعد سے یہ گاڑی اگرچہ دوبارہ چلنا شروع ہوئی لیکن یہ کھٹارا ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ چلتے وقت ہارن کے علاوہ اس کے باقی سارے حصے بجتے ہیں۔ خدا کرے اب یہ کبھی کسی ایسے شاگرد پیشہ کے ہاتھ نہ چڑھے جو استاد سے شکوہ کرے کہ گاڑی تو ٹھیک جوڑ لیتا ہوں۔ لیکن آخر میں مٹھی بھر پرزے پتہ نہیں کیسے بچ جاتے ہیں۔

معذرت خواہ ہوں کہ تمہید قدرے لمبی ہو گئی لیکن یہ تمہید اس شخص کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے ضروری تھی جو صحافت کا ''مرد کامل'' تھا۔ ظاہر ہے کہ میرا اشارہ حمید نظامی مرحوم کی طرف ہے۔ میں آج سے اکتیس بتیس برس قبل جب ''نوائے وقت'' سے وابستہ ہوا اس وقت حمید نظامی جبر و استبداد کے خلاف لڑتے لڑتے حوصلہ تو نہیں' جان ہار چکے تھے۔ لیکن میری تربیت انہی کے اداریوں کے سائے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ جب ان کا قلم حکمرانوں کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ اس وقت میں بطور کالج کے ایک طالب علم آنسو گیس کے شیل اور پولیس کی لاٹھیاں کھانے میں مشغول تھا۔ حمید نظامی نے صرف فوجی آمریت اور جمہوری آمریت کے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ انہوں نے تحریک پاکستان میں پہلے بطور طالب علم اور پھر بطور صحافی بھرپور حصہ لیا۔ پاکستان قیام پاکستان سے پہلے ان کا خواب تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا عشق بن گیا۔ صحیح محبت اور درد پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ماں کو اپنے بچے سے عشق اس لئے ہوتا ہے کہ اس نے اس کے لئے دکھ جھیلے ہوتے ہیں۔ حمید نظامی نے پاکستان کے لئے دکھ جھیلے تھے۔ اس لئے پاکستان کا عشق تھا۔ آج عشق کی یہ آگ بجھی بجھی سی ہے اور اس لئے کہ قیام پاکستان کے بعد جنم لینے والی نسل کو یہ من وسلویٰ بیٹھے بٹھائے حاصل ہو گیا۔ اور اوپر سے انہیں بتایا بھی نہیں گیا کہ اس نعمت کے حصول کے لئے ان کے بزرگوں کو کتنے دکھ جھیلنے پڑے تھے۔ حمید نظامی مرحوم کا عشق اسی لحاظ سے منفرد بھی تھا کہ انہوں نے صرف لیلیٰ سے عشق کیا' لیلیٰ کے کسی کتے سے انہوں نے کبھی کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ چنانچہ انکے قلم کی حمایت مسلم لیگ کے صرف اعلیٰ کاموں کو حاصل تھی' چنانچہ جب کبھی مسلم لیگ نے اپنی پٹڑی سے اترنے کی کوشش کی تو حمید نظامی کا قلم یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ان کا اپنا تعلق بھی اسی جماعت سے ہے'

لوٹوں اور ٹوڈیوں کے لئے شمشیر بے نیام بن گیا۔ نظامی مرحوم نے اپنی زندگی میں جاگیرداروں کو کبھی معاف نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بزرگوں کو جاگیریں انگریزوں کے کتے نہلانے اور مسلمانوں سے غداری کے صلے میں عطا ہوئی تھیں۔ وہ کسی آمر کے سامنے بھی نہیں جھکے' انہوں نے حکومت کے کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کو بھی محض اس کی دنیاوی منصب کی وجہ سے اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ چنانچہ بڑے بڑے پھنے خاں قسم کے لوگ وزراء ان کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کرتے تھے۔ اور انہیں کبھی یہ اجازت ملتی تھی اور کبھی نہیں ملتی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا؟ اور اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں..... اس کا جواب اقبال کے ہاں موجود ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

جب انسان سچے خدا کو اپنا ماباپ و ماوامان کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ تو پھر اسے جھوٹے خداؤں کے سامنے ماتھا رگڑنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حمید نظامی مرحوم کا دامن صاف تھا۔ انہوں نے نہ کسی سے پلاٹ لیا' نہ پرمٹ' نہ ایجنسی اور نہ اپنے یا اپنے اخبار کے لئے کوئی خصوصی مراعات..... تو پھر اس کے بعد وزراء ہی کو دروازے پر بیٹھنا تھا' حمید نظامی مرحوم کو نہیں! مرحوم کی جلائی ہوئی غیرت وحمیت کی یہ شمع آج ان کے بھائی مجید نظامی کے ہاتھ میں ہے۔ اور مجید نظامی نے یہی جوت آگے عارف نظامی کے من میں جگائی ہے۔ اور یوں صحافت کی اولمپک کی شمع اس خاندان کا ورثہ بن گئی۔

خواتین وحضرات.....! آخر میں مجھے آپ سب کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ چوہدری انوار الحق اور ان کے رفقا کا خصوصی شکریہ کہ آج کی تقریب میں سب زیادہ حصہ انہی کا ہے۔ سفارت خانہ پاکستان اوسلو ناروے کے تعاون سے میری موجودگی میں ناروے میں منعقد ہونے والی یہ آخری تقریب ہے کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میری ٹرانسفر تھائی لینڈ ہوگئی ہے۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سب دوستوں کی بے پناہ محبتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جو آپ نے میرے دو سالہ قیام ناروے کے دوران مجھ پر نچھاور کیں۔ میں یہ محبتیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں تو بالکل بے مایہ شخص ہوں۔ میں تو آپ کے لئے وہ کچھ کر ہی نہیں سکا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سوچتا رہتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس عزت کے قابل کیوں سمجھا' مجھے اس کا جواب تو نہیں مل سکا۔ البتہ آخر میں آپ کو ایک لطیفہ سنا کر آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور خدا حافظ کہتا ہوں۔

''ایک شخص گائے خریدنے گیا' اسے بتایا گیا کہ ایک گائے روزانہ دس سیر دودھ اور سال میں ایک وچھا دیتی ہے۔ اس کی قیمت

دس ہزار ہے۔ دوسری گائے نہ دودھ دیتی ہے اور نہ وچھا۔ اس کی قیمت پندرہ ہزار ہے۔ گاہک نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''جو گائے دودھ بھی دیتی ہے اور وچھا بھی اس کی قیمت کم اور جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اس کی قیمت زیادہ کیوں ہے؟'' مالک نے یہ سن کر کہا۔ ''افسوس ہے جناب آپ کی نظروں میں کریکٹروں کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے؟''

◆◆◆

جعلی دوست.....!

ایک عیالدار شخص ایک حاجی صاحب کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ دو ماہ بعد ان کی بیٹی کی شادی ہے اس نے تین لاکھ شادی کے لئے جمع کئے ہوئے ہیں۔ یہ رقم اپنے پاس امانتاً رکھ لیں' وہ دو ماہ بعد ان سے لے جائے گا۔ حاجی صاحب نے رقم لے لی اور کہا'' یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے' آپ جب چاہیں واپس لے جائیں'' دو ماہ بعد وہ شخص واپس حاجی صاحب کے پاس آیا اور اپنی رقم واپس مانگی۔ حاجی صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا'' عزیزم کون سی رقم؟'' اس شخص نے کہا'' جناب جو میں آپ کے پاس رکھوا کر گیا تھا!'' حاجی صاحب نے فرمایا'' عزیزم آپ کو غلطی لگی ہے' آپ نے میرے پاس کوئی رقم نہیں رکھوائی۔'' اس شخص نے کہا'' آپ کیا کہہ رہے ہیں جب میں نے آپ کو تین لاکھ روپے دیئے' اس وقت آپ کے یہ تینوں بیٹے بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے'' حاجی صاحب بولے'' پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا' ان سے پوچھ لیتے ہیں' اگر وہ کہیں کہ ہاں آپ نے رقم دی تھی تو آپ کی امانت آپ کو واپس مل جائے گی'' پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

'' کیوں بھئی حاجی نعیم ان صاحب نے میرے پاس رقم رکھوائی تھی؟''

''نہیں والد محترم!''

'' کیوں بھئی حاجی نسیم' تمہارے سامنے ان صاحب نے مجھے کچھ رقم دی تھی؟'' حاجی صاحب نے درمیان والے بیٹے سے استفسار کیا۔

''نہیں والد محترم' میں تو ان کی شکل ہی آج دیکھ رہا ہوں۔''

''تم بتاؤ محمد حسن' انہوں نے تین لاکھ روپے مجھے دیئے تھے؟'' حاجی صاحب نے آخر میں سب سے چھوٹے سے پوچھا۔

''جی والد محترم' انہوں نے میرے سامنے آپ کو تین لاکھ روپے دیئے تھے.....!''

اس پر حاجی صاحب نے اپنے تینوں بیٹوں کی طرف دیکھا اور کہا۔'' حاجی نعیم' حاجی نسیم' ان صاحب کے تین لاکھ روپے انہیں واپس کرو اور محمد حسن کو فوراً حج پر بھیجو!''

بظاہر یہ لطیفہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اس وقت اس قسم کے جعلی اسلام دوستوں کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے جو عبادت

اور معاملات کو الگ الگ چیزیں سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتا ہے' جعلی ادویات کے کاروبار میں ملوث ہے' کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرتا ہے' سمگلنگ اور ہیروئن فروشی کا ''کاروبار'' اپناتا ہے' رشوت لیتا ہے' قومی خزانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر خرد برد کرتا ہے' کسی کے حقوق غصب کرتا ہے' یتیم اور مسکین کا مال کھاتا ہے' پلاٹوں پر قبضے کرتا ہے' ناجائز منافع اور ذخیرہ اندوزی سے دولت کماتا ہے اور ظالم کا ساتھ دیتا ہے' اللہ تعالیٰ کو اس شخص کی نمازوں اور روزوں سے کوئی غرض نہیں' ناجائز ذرائع سے کروڑوں روپے ڈکارنے والوں کی ڈھائی سو روپے کی دیگ بھی اللہ کو قبول نہیں' جو وہ داتا صاحب جا کر چڑھاتا ہے۔ اللہ کو ایسا مخیر بھی پسند نہیں جو لوٹ مار کے مال میں سے عمرے کرتا ہے اور دینی مدرسوں کو چندے دیتا ہے۔ خدا کے نزدیک وہ آنسو بھی مگرمچھ کے آنسوؤں میں شمار ہوتے ہیں جو اس نوع کے بدکردار لوگ جھوم جھوم کر نعت سننے کے درمیان بہاتے ہیں مگر آپ یقین کریں ہمارا معاشرہ یہ سب باتیں بھول چکا ہے' بعض مذہبی پیشوا انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تم سب حرام کاریاں کرو' بس ہر گناہ کے بعد نماز پڑھ کر اس گناہ کی معافی مانگ لیا کرو اللہ تعالیٰ انہیں دامان رحمت میں جگہ دے گا۔ حالانکہ یہ معافی صرف عبادات میں ہونے والی کوتاہی میں ممکن ہے معاملات میں نہیں' یہی وجہ ہے کہ بعض نیکوکاروں کے علاوہ اول درجے کے ملک دشمنوں اور معاشرے کے روگیوں کی دکانوں اور گھر میں بھی یہی تختی لگی ہوتی ہے ''یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے''

میرے نزدیک یہ توہین رسالت ہے اور ایسے لوگوں کے خلاف توہین رسالت کے قانون کے تحت کاروائی ہونی چاہیے۔

اسلام کے ان جعلی دوستوں کے علاوہ پاکستان کے جعلی دوست بھی ہمارے ہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں بلکہ میرے نزدیک یہ اکثریت میں ہیں۔ ہمارے ذاتی مفادات کے سامنے پاکستان کے مفادات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ سور کو صرف گنے کی گٹھلی کھانا ہوتی ہے اس کے لئے وہ کماد کا سارا کھیت برباد کر دیتا ہے' ہم 14 اگست کو سائیکلوں' موٹر سائیکلوں' کاروں' ویگنوں اور اپنے گھروں پر پاکستان کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد کے حلق شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ عام گفتگو میں ملک کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے حکمران پرچم کشائیاں کرتے ہیں' قوم کو حب الوطنی کا درس دیتے ہیں' اور محب الوطنوں کو غدار قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کا اپنا کون سا عمل ان کے محب الوطن ہونے کی گواہی دیتا ہے؟ صرف پاکستان زندہ باد..... دل دل پاکستان ..... جیوے جیوے پاکستان یہ تو کہنا بہت آسان ہے مگر بقول اقبال:

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اہل سنت کہلوانے والوں میں سے کون ہے جو حضور کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مظلوموں کے لئے میدان میں اترتا ہے؟ اہل حدیث کہلوانے والوں میں سے کون ہے جو حضور کی اس حدیث پر عمل کرتا ہے کہ ''بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے'' حسینیوں میں سے کون ہے جو حضرت حسین کے رستے پر چلتے ہوئے اپنے عہد کے یزید سے ٹکر لیتا ہے؟ اسلام سے محبت کے صرف دعوے پاکستان سے محبت کے دعوے اور اصل محبت صرف اپنے آپ سے؟ ہم سب اسلام اور پاکستان کے جعلی دوست ہیں۔ اگر ہم اسلام دوست ہیں تو نقلی مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کی بربادی کا تماشا کیوں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہے مگر ہمیں پاکستان سے زیادہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات عزیز ہیں۔ اپنا رتبہ اور منصب عزیز ہے۔ حرام ذرائع سے بنایا ہوا مال عزیز ہے۔ یا خدا یہ رتبہ و منصب اور جان اور مال ان سے چھین لے جنہیں یہ رتبہ' جان اور مال پاکستان سے زیادہ عزیز ہے۔

◆◆◆

بھاگ لگے رہن

جب سے شادی بیاہ پر ''کھابوں'' پر پابندی لگی ہے۔ یار لوگوں کو بوتل پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بوتل وہ نہیں جس پر خود ''پیر مغاں'' نے پابندی عائد کی تھی بلکہ یہ بوتل وہ ہے جسے جناب واعظ بھی کھلے بندوں پیتے ہیں اور جس کے لئے انہیں اندھیرا اجالا نہیں دیکھنا پڑتا جس دن بھٹو مرحوم نے ''بوتل'' پر پابندی کا اعلان کیا اس روز رات کو دو بجے ایک مشہور اداکار نے جو مرحوم ہو چکے ہیں' ''نوائے وقت'' کے نیوز روم میں فون کیا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا..... ''لے دے کر ہم ہی اس کے ووٹر رہ گئے تھے' ظالم اب ہمارے ووٹوں سے بھی گیا''..... بہرحال ایک دور میں بوتل پر پابندی لگی دوسرے دور میں کھل گئی فرق یہ ہے کہ یہ ''بوتل'' ذرا دوسری ہے' سو آج کا دور بوتل کا دور ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ سموسہ ساتھ چل جاتا ہے چنانچہ جس جوش وخروش سے لوگ پہلے شادیوں میں شرکت کیا کرتے تھے' اب وہ جوش وخروش ماند پڑ چکا ہے۔ ایک بوتل اور ایک سموسہ پانچ سو روپے میں پڑتا ہے۔ (سلامی کی صورت میں)

گذشتہ روز ایک بزرگ عصا ٹیکتے ہوئے غریب خانے پر تشریف لائے انہوں نے آتے ہی ایک گلاس پانی منگوایا' پانی آنے پر انہوں نے منہ سے بتیسی نکالی اور اسے گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا ''میاں.....! شادی ان دنوں بہت سستی ہوگئی ہے مگر کچھ حاسدوں کی رائے سے اختلاف مناسب نہ سمجھا جس کا غالباً انہوں نے برا منایا اور بتیسی گلاس ہی میں چھوڑ کر عصا ٹیکتے ہوئے واپس چلے گئے! حالانکہ ان کی شادی کی اگر کبھی نوبت آئی بھی تو بقول سٹیج کے ایک اداکار' مسجدوں سے اس کا اعلان کچھ اس طرح ہوگا۔

حضرات.....! ''بزرگوں کی بارات قضائے الٰہی سے آج شام پانچ بجے اٹھائی جائے گی''

میاں نواز شریف کے دور سے شادی بیاہ پر کھانے کی جو پابندی عائد ہے اس کے کچھ مضر اثرات بھی معاشرے پر پڑے ہیں' پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بارات آنے پر نکاح اور کھانے سے پہلے کے دورانئے میں بھانڈ حضرات تشریف لاتے تھے جن کی وجہ سے حاضرین کا وقت خوب گزرتا تھا۔ وہ سیاست اور سیاست دانوں پر جگتیں کرتے' ایک دوسرے کے ہاتھ پر چمڑے کے چھتر مارتے اور ویلیں وصول کرتے۔ ہر ویل پہ ہاتھ فضا میں بلند کر کے ان میں سے ایک ویل دینے والے کو دعائیں دیتا..... ''مولا خوش رکھے ..... بھاگ لگے رہن''..... اور دوسرا جا کر ویل وصول کرتا۔

اب یہ رونقیں ہی نہیں رہیں۔ میں گزشتہ روز جواد فیضی کی شادی میں شرکت کے لئے جوہر ٹاؤن گیا وہاں دولہا میاں اور ان کے سسر ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ کو مبارک باد کہی' ایک چھوہارا منہ میں ڈالا اور باہر نکل آیا۔ میری طرح دوسرے لوگ بھی ان دنوں عموماً ایسے ہی کرتے ہیں لہٰذا بھانڈوں کو اب سیاست اور سیاستدانوں پر جگتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا' چنانچہ اس طرح کی جگتیں سننے کے شوقین حضرات ان دنوں اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں جہاں کوئی نہ کوئی ماہر فن ایک ہاتھ فضا میں بلند کر کے ''مولا خوش رکھے' بھاگ لگے رہن'' کی صدا لگا رہا ہوتا ہے' لیکن یہ صدا بغیر کسی ویل کے ہوتی ہے۔ اس کا مقصد صرف پرانی ویلیں ہضم کرنا ہے۔ جب پرانی ویلیں ''ریگولرائزڈ'' ہو جائیں گی اور ان کی پوچھ گچھ کے بارے میں کوئی خوف نہیں رہے گا تو پھر فن کا مظاہرہ رضا کارانہ نہیں' کافی بہتر شرائط پر ہوگا!

میں اکثر ٹیلی ویژن ڈراموں میں فلموں میں اور پان کھانے کے شوقین دوستوں کے گروہ میں یہ منظر دیکھا کرتا تھا کہ بیگم' میاں کے لئے پان لگانے لگی ہے تو میاں اس سے ضرور کہتا..... ''بیگم چونا ذرا کم لگانا''..... بلکہ یہ ڈائیلاگ پان کی دکانوں پر بھی اکثر سننے میں آتا ہے۔ ایک دن میں نے ایک پان خور دوست سے پوچھ ہی لیا..... ''یار تمہاری بیگم ایک عرصے سے تمہارے لئے پان لگا رہی ہے اس کے باوجود تم ہر واقعہ پہ ہدایت کیوں دیتے ہو..... ''چونا ذرا کم لگانا''..... دوست نے کہا..... ''اس کی وجہ یہ ہے کہ چونا عموماً زیادہ لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے زبان پر چھالے نکل آتے ہیں''..... تاہم میں نے تصدیق کے لئے بھابی سے رجوع کیا تو وہ بولیں..... ''بھائی صاحب آپ بھی ان کی باتوں میں آ گئے' میں ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جب بھی چونا کم لگاتی ہوں یہ ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تمہیں چونا نہیں لگانا آتا تو یہ کام کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا ہے' اس کام کے بہت سے امیدوار ہیں''.....

بہرحال بتانا میں یہ چاہ رہا تھا کہ شادی بیاہ میں کھانے کی پابندیوں سے پہلے بھانڈوں سے بھی ملاقات ہوتی تھی اور کوئی پان فروش بھی شامیانے کے ساتھ لگا مل جاتا تھا۔ اس موقع پر سیاستدانوں کی دھجیاں اڑتے دیکھی جا سکتی تھیں اور یہ ڈائیلاگ بھی سننے کو ملتا تھا..... ''میاں ذرا چونا کم لگانا''..... چونا آج بھی لگایا جا رہا ہے اور..... ''مولا خوش رکھے بھاگ لگے رہن''..... کی صدا بھی سننے کو ملتی ہے' بس جگہ تبدیل ہو گئی ہے اور افراد تبدیل ہو گئے ہیں!

◆◆◆

آپ اپنی چونچ باہر رکھیں.....!

بھارت کے وزیراعظم جناب اٹل واجپائی نے جو شاعری بھی فرماتے ہیں اور شاعری میں ہمارے استاد امام دین گجراتی کے مقلد ہیں' اپنے ایک بیان میں پاکستان کے ''معزول'' وزیراعظم میاں محمد نواز شریف سے اظہار ہمدردی فرمایا ہے۔ انہوں نے ہمدردی کا یہ اظہار دولت مشترکہ کی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے بعد وطن واپسی پر اپنے خصوصی طیارے میں صحافیوں سے باتیں کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ بروقت بین الاقوامی مداخلت نہ ہونے کی صورت میں نواز شریف بھی سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو جیسے انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان میں جمہوریت جلد بحال نہ ہوئی تو اسے دولت مشترکہ سے نکالا جا سکتا ہے۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ دولت مشترکہ اب بھی نواز شریف کو پاکستان کا وزیراعظم تسلیم کرتی ہے لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا بھارت بھی نواز شریف کو وزیراعظم تسلیم کرتا ہے تو انہوں نے کہا یہ ایک مشکل سوال ہے!

واجپائی کا یہ بیان ہندو کے سازشی ذہن اور اس کے دل میں چھپی ہوئی پاکستان دشمنی کی بہترین مثال ہے۔ اگر پاکستان کے منتخب وزیراعظم کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوتی ہے اور جمہوریت کا بوریا بستر گول ہوتا ہے تو اس پر سب سے زیادہ اگر کسی کو خوشی ہوگی تو وہ بھارت ہوگا۔ پاکستان میں علیحدگی کی تحریکیں بھارت کی سرپرستی میں ہمیشہ فوجی آمریت کے دور میں جڑ پکڑتی اور مستحکم ہوتی ہیں اور بری بھلی جیسی بھی جمہوریت ہو اس میں یہ دم توڑ دیتی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک فوجی حکمران ''فیلڈ مارشل'' ایوب خان کے دور میں شروع ہوئی اور جنرل یحییٰ خاں کے دور حکومت میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا۔ سندھو دیش کی تحریک نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں زور پکڑا قوم پرست تحریک ایم کیو ایم کا سہرا بھی جنرل ضیاء الحق ہی کے سر ہے مگر جب وطن عزیز میں جمہوریت کا احیاء ہوا ہے' سب علیحدگی کی تحریکیں دم توڑ گئیں۔ بھارت سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا' اس نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو پاکستانی عوام میں پاک فوج کے خلاف نعرے اور پاکستانیوں کو پاکستان کے مستقبل سے مایوس کرنے کے لئے استعمال کیا اور کئی سادہ لوح پاکستان کے حوالے سے سرد مہری کا رویہ اختیار کیا اور بہت کم ایسے تھے جنہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کسی ادارے کو مجرم سمجھنے کی بجائے صرف ان کو مجرم سمجھا جو مجرم تھے۔

بھارت اب اسی ٹریجیڈی کا ''ایکشن ری پلے'' چاہتا ہے اس کی خواہش ہے کہ پاکستان کے ایک اور منتخب وزیراعظم کے ساتھ

یہی کھیل کھیلا جائے تا کہ پاکستانیت کی حامل جن قوتوں نے اس دور میں آرمی کے خلاف پیدا ہونے والے جذبات اور پاکستان کے بارے میں پیدا ہونے والی بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت کا مقابلہ کیا تھا۔ اس دفعہ وہ بھی بے بس ہو کر رہ جائیں اور یوں بھارت اپنی اس مذموم خواہش کو عملی جامعہ پہنا سکے جو ''اکھنڈ بھارت'' کی صورت میں 1947ء ہی سے اس کے دل میں مچل رہی ہے۔ جناب واجپائی کا بیان اس سلسلے کی کڑی ہے' وہ اس طرح کے بیانات سے ان محب وطن طبقوں کے دلوں میں بھارت کے لئے جگہ بنانا چاہتے ہیں' جو میاں نواز شریف کو ان کی تمام تر کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود پاکستانی قوم کی یکجہتی کی علامت سمجھتے ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ سادہ لوح پاکستانیوں کو ''نواز شریف واجپائی بھائی بھائی'' کا تاثر بھی دینا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح گجرال نے ایک اور انداز سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی' مقصد یہ کہ پاکستانی عوام بھی پاکستان کے ان اپوزیشن لیڈروں کی آواز میں آواز ملا کر نواز شریف کو سیاست سے آؤٹ کریں جن لیڈروں کو یقین ہو چکا ہے کہ نواز شریف کی موجودگی میں انہیں برسر اقتدار آنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو اس روز بھارت میں گھی کے چراغ جلیں گے۔

ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن میں بہر حال یہی سمجھتا ہوں کہ صرف بھارت نہیں' اہل مغرب بھی (زبان سے خواہ جو مرضی کہیں) اپنی پاکستان دشمنی کے حوالے سے وہی کچھ چاہتے ہیں جو حضرت واجپائی کی خواہش ہے واجپائی کا مقصد پاکستان کے وجود کو ختم کرنا ہے۔ اہل مغرب شاید اسے کمزور اور ناتواں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جناب واجپائی کا متذکرہ بالا بیانات کے حوالے سے ایک فوری مقصد پاکستان اور پاکستان آرمی کے خلاف پوری دنیا میں فضا ہموار کرنا بھی ہے اور اس کام میں اہل مغرب پوری ''مذہبی اسپرٹ'' کے ساتھ پہلے دن سے مشغول ہیں' موجودہ فوجی حکومت کے بارے میں حسن ظن یہ بھی ہے کہ اس نے بحالی جمہوریت کے لئے ابھی تک بات چیت کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بہر حال جناب واجپائی سے میری گزارش یہ ہے کہ وہ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں' سیاست دان بھی ہمارے ہیں فوج بھی ہماری اپنی ہے۔ ہم اپنا مسئلہ خود حل کریں گے۔ واجپائی صاحب کی مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی سے اہل پاکستان کے لئے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم ہندو کی سوچ سے بھی واقف ہیں اور اس کے عمل سے بھی' لہٰذا اٹل واجپائی صاحب آپ اپنی چونچ ہمارے داخلی معاملات سے باہر رکھیں۔ آپ منہ سے جتنا مرضی رام رام کہیں' آپ کی بغل میں چھپی چھری ہمیں صاف نظر آ رہی ہے!

◆◆◆

نادہندگان.....!

آج کے ''نوائے وقت'' میں ایک سنگل کالمی خبر ''30 کروڑ روپے کا نادہندہ تہجد پڑھتے ہی گرفتار'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس کے مطابق ایک صنعت کار ذکریا غنی جو بینکوں کے 30 کروڑ روپے کے نادہندہ تھے' تہجد پڑھ کر فارغ ہوئے تو حکومت کے اہلکاروں نے انہیں آدبوچا اور گرفتار کر کے لے گئے۔

یہ خبر بہت دلچسپ ہے اور میرے اس کالم سے ''ٹیلی'' کرتی ہے جو میں نے دو روز قبل ''جعلی دوست'' کے عنوان سے لکھا تھا اور جس میں کہا تھا کہ ان لوگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں جو قومی خزانے کے کروڑوں روپے ڈکار جاتے ہیں اور اللہ اور اس کے بندوں کو دھوکا دینے کے لئے نماز' روزے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ تاہم واضح رہے میں فی الحال ذکریا غنی صاحب کو محض ملزم سمجھتا ہوں' مجرم نہیں۔ اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ کہ ان پر نادہندگی کا جو الزام ہے وہ درست ہے بھی کہ نہیں؟ لیکن اس طرح کے لوگ ہمارے معاشرے میں کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہے۔ لاہور میں ایک شاہ صاحب ہیں جو اپنی ''رزق کی جگہ'' پر بیٹھنے سے پہلے اپنی بنائی ہوئی مسجد میں سارے ملازمین کو اکٹھا کرتے ہیں وہاں ذکر کی محفل ہوتی ہے اس کے بعد خلق خدا کو دھوکا دینے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ قبلہ شاہ صاحب پر کروڑوں کے فراڈ کے بیسیوں مقدمے درج ہیں' ان کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ موصوف چہرے پر بہت خضوع و خشوع طاری کر کے نماز پڑھنے میں مشغول تھے' ان کا ایک کارندہ پاس کھڑا' ایک ''اسامی'' کو ان کے تقوے کا قائل کرتے ہوئے بتا رہا تھا ''شاہ صاحب نے کبھی نماز قضا نہیں کی' سارے روزے رکھتے ہیں اور تین عمرے بھی کئے ہیں'' یہ سن کر قبلہ شاہ صاحب نماز کے دوران ہی بول اٹھے ''میں نے دو حج بھی کئے ہیں'' ظاہر ہے یہ محض لطیفہ ہے واقعہ نہیں ہو سکتا مگر اس طرح کے حالات میں اس طرح کے لطیفوں کا جواز بھی نکل ہی آتا ہے۔

آج کے اخبار میں صرف اس تہجد گزار ہی کی خبر نہیں ہے بلکہ بے شمار دنیاداروں کی بھی خبریں ہیں جو کروڑوں کے نادہندہ ہیں اور اس وقت حوالات میں فرش پر اکڑوں بیٹھے دال روٹی کھا رہے ہیں جس میں دال اور روٹی کم اور روڑے زیادہ ہوتے ہیں' قوم کے دیگر افراد کی طرح مجھے بھی ان لوگوں کے گرفت میں آنے کی دلی خوشی ہے یہ لوگ کئی کئی گھنٹوں سے چلچلاتی دھوپ میں بس اسٹاپوں پر کھڑے غریب اور بے بس عوام کے سامنے سے اپنی مہنگی گاڑیوں پر گرد اڑاتے ہوئے گزرتے تھے اور ان کی اس ذلت پر دل میں

ایک کمینی سی خوشی محسوس کرتے تھے' آج عوام بھی انہیں برے حال میں دیکھ کر دل میں خوش ہیں۔ ان میں سے جو واقعی قومی خزانہ لوٹنے کے مجرم ہیں' ان کے لئے عمر قید کی سزا بھی کم ہے' میرے لئے بہت مشکل ہے کہ میں اس ضمن میں مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی' پیپلز پارٹی اور غیر پیپلز پارٹی' سیاسی اور غیر سیاسی کی تمیز کر سکوں۔ بس اتنا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونی چاہیے ورنہ یہ سارا عمل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

اس موقع پر ایک بات کی یاددہانی بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ڈوبی ہوئی رقوم کی واپسی پاکستان کا واحد مسئلہ نہیں ہے' ہم لوگ بے شمار قومی اور بین الاقوامی مسائل کے بھنور میں گھرے ہوئے ہیں مگر پوری قوم اور پوری انتظامیہ کی توجہ اس وقت صرف اس مسئلے پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہے۔ کشمیر' افغانستان' چیچنیا سب بھول گئے ہیں' ڈاکے اور قتل اس تواتر سے ہو رہے ہیں' بے روزگاری' مہنگائی' سرخ فیتہ اور دیگر تمام مسائل آج بھی عوام کے لئے جان لیوا ہیں۔ انڈیا اپنے دانت تیز کر رہا ہے۔ مغربی پریس ہمارے قومی وجود پر مسلسل حملہ آور ہے اور ہمارے ٹی وی پر ''ریفرنڈم'' ہو رہا ہے کہ قوم کے خیال میں کونسی اداکارہ یا اداکار پہلے نمبر پر آتا ہے' بہرحال میرے خیال میں لٹیروں کے پکڑے جانے پر اظہار مسرت کے علاوہ اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سارے عمل کے نتیجے میں خطرے کی سوئی تک پہنچی ہوئی ہماری معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسائل جذبات سے نہیں سوچ بچار سے حل کئے جاتے ہیں اور آج سوچ بچار کی شدید ضرورت ہے!

◆◆◆

یہ اجنبی سے لوگ.....!

قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں بلکہ چھٹی دہائی تک گڑھی شاہو لاہور میں ''اینگلو انڈین'' رہا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے ''پاپا'' یا ''ماما'' ہندوستان پر غاصبانہ طور پر قابض گروہ میں سے تھے یعنی ان ''اینگلو انڈین'' کی والدہ ماجدہ یا والد ماجد انگریز تھے باقی سارا خاندان دیسی بلکہ خالص دیسی ہوتا تھا۔ مرد حضرات تنگ مہری والی پتلونیں پہنتے تھے' انگریزی دھنیں سنتے تھے اور انگریزی دھنوں پر ڈانس کرتے تھے۔ خواتین اسکرٹ پہنتی تھیں اور اپنی کالی کالی ٹانگوں کے ساتھ مال روڈ پر سیر کو نکلا کرتی تھیں۔ یہ خود کو ''یورپین'' سمجھتے تھے اور لوگ انہیں ''چوڑ پین'' کہتے تھے۔ یہ جعلی انگریز بڑے دلچسپ لوگ تھے۔ ان کے حوالے سے ان دنوں اک لطیفہ بہت مشہور تھا جو اس ڈائیلاگ کی صورت میں تھا۔

''ٹانگے والے تم بھاٹی گیٹ جانا مانگتا؟''

''بیٹھو میم صاحب!''

''تم بھاٹی گیٹ کے کتنے پیسے مانگتا۔''

''آٹھ آنے میم صاحب۔''

''بے ایمان ناہووے تے میں تے روز چوانی دے کے جانی آں۔''

لوگ ان پر ہنستے تھے اور مجھے ہمیشہ ان پر ترس آتا تھا کہ یہ وہ بدنصیب تھے جو اپنوں میں رہتے ہوئے بھی اپنوں کے لئے اجنبی اجنبی سے تھے۔

ان دنوں ہمارے درمیان یہ ''اینگلو انڈین'' تو نہیں ہیں لیکن ان سے ملتی جلتی نسل گذشتہ باون برس میں ہمارے ہاں پروان چڑھی ہے۔ یہ مشنری اداروں اور حرام مال میں پلی ہوئی جنریشن ہے جس نے آہستہ آہستہ اقتدار میں آ کر ملک کے نوے فیصد دیسی عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کو اپنے پاس گروی رکھ لیا ہے ان کے والد اور والدہ بھی پاکستانی ہیں' مسلمان ہیں لیکن ان کی روزمرہ کی زبان اور رہن سہن مغربی ہے۔ یہ انگریزی لکھتے' انگریزی بولتے اور انگریزی پڑھتے ہیں۔ این جی اوز چلاتے ہیں اور مال کماتے ہیں۔ این جی اوز کے ذریعے مغربی ممالک میں اسی تاثر کو عام کرتے ہیں جو تاثر وہاں کا میڈیا وہاں پھیلانا چاہتا ہے۔ یہ لوگ ناشتے

میں ایک سینکا ہوا توس' ایک بغیر زردی کے ابلا ہوا انڈا اور ایک کپ چائے بغیر چینی کے پیتے ہیں۔ جب بہت زیادہ دیسی ہونے کو جی چاہے تو پٹھان کی ریڑھی سے گرم ریت میں دھنسی ہوئی چھلی بھی کھا مرلیتے ہیں' اپنے گھر کے ڈرائینگ روم میں رنگین چھابا لٹکا کر پاکستانی عوام سے اظہار خیر سگالی کی کوشش کرتے ہیں۔ بلھے شاہ کو بھی اس کے ''مسجد ڈھادے مندر ڈھادے'' والے کلام کی وجہ سے برداشت کر لیتے ہیں۔ وارث شاہ کو بھی اپنے کلچر کا حصہ سمجھتے ہیں۔ کبھی بین ڈالنا پڑے تو انگریزی سروں میں ڈالتے ہیں۔ انہیں نواز شریف صرف اس لئے ناپسند تھا کہ وہ انگریزی ان کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے نہیں بولتا تھا اور اس کی دوستی صرف مختلف ملکوں کے ایلیٹس ہی سے نہیں اپنے ملک کے ماجھے گاموں سے بھی تھی کہ یہی ماجھے گامے اصل عوام ہیں۔

مجھے اس کلاس کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کا ذکر میں آج کے کالم میں کر رہا ہوں۔ یہ لوگ جسمانی طور پر صرف اس وقت تک پاکستان میں رہنا پسند کرتے ہیں جس حد تک ان کی مجبوری ہے' جب ان کا مشن یا لوٹ کھسوٹ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے یہ اپنے وطن مالوف امریکہ کو سدھار جاتے ہیں۔ یہ ایک بریف کیس کے ساتھ پاکستان آتے ہیں اور دو بریف کیس پکڑ کر واپس امریکہ چلے جاتے ہیں۔ ان میں بیشتر کے پاس دوہری قومیت (جسے میں دوغلی قومیت کہتا ہوں) ہے۔ وفاداری کی اس نوعیت کو یقیناً کوئی نیا نام دینا چاہیے۔ ان میں سے قدرے مذہبی ہیں وہ سگار دانتوں میں دبا کر رومن رسم الخط میں قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں اور اگر کوئی اچانک اوپر سے آ جائے تو کہتے ہیں۔

''MUHAMMAD SAYS?''I THOUGHT LET,S SEE WHAT

یہ حقیر سی اقلیت ہیں مگر ان کا حکم ملک کی اکثریت پہ چلتا ہے!

ان دنوں یہی اقلیت جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت کی نیشنل سکیورٹی کونسل کے سویلین ارکان سے لے کر مرکز اور چاروں صوبوں میں بننے والی حکومتوں تک میں خاصی اکثریت کے ساتھ سامنے آئی ہے اور پھر ان کے ذریعے جو دوسری پوسٹنگز ہوئی ہیں ان میں بھی چن چن کر ایسے لوگوں کو اہم جگہوں پر لگایا گیا ہے جن کا اس ملک کے عوام کی سوچوں اور رہن سہن سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ صرف تین چار نام ایسے ہیں جو ''دیسی'' ہیں یا یوں کہہ لیں یہ جیٹری میں پھنسے ہوئے چند ''شیدے'' ہیں اور انہیں واپس اپنے ''شیدوں'' میں آنا ہی پڑے گا۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارا نہیں جا سکتا۔

◆◆◆

ایک طوطا طوطی اور الو کی حکایت!

جناب جسٹس (ر) رفیق تارڑ جب صدر پاکستان نہیں تھے انہوں نے نہایت خوبصورت حکایت بیان کی تھی۔ یہ حکایت میں ایک دفعہ پہلے بھی اپنے قارئین کو سنا چکا ہوں' پس ایک دفعہ اور سنانا چاہتا ہوں۔ شاید یہ ان دلوں پر اثر کرے جو گداز ہیں جن میں نرمی ہے اور پاکستان سے محبت ہے

ایک طوطا طوطی کا گزر ایک ویرانے سے ہوا' وہ ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

طوطے نے طوطی سے کہا۔ ''لگتا ہے یہاں سے کسی الو کا گذر ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ بستی ویران ہوگئی ہے۔''

طوطی نے سر ہلا کر طوطے کی اس بات کی تصدیق کی۔

ایک الو کسی دوسری ٹہنی پر یہ باتیں سن رہا تھا' وہ اڈاری مار کر ان کی طرف آیا' ان کا حال پوچھا اور پھر کہا۔ ''آپ میرے علاقے میں آئے ہیں' میری خواہش ہے کہ آج آپ میری طرف کھائیں۔'' طوطا طوطی نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

کھانے کے بعد جب یہ جوڑا رخصت ہونے لگا تو الو نے طوطی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا..... ''تم کہاں جا رہی ہو؟.....

طوطی پریشان ہوگئی اور بولی..... ''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے' میں اپنے خاوند کے ساتھ واپس جا رہی ہوں''.....

الو یہ سن کر ہنسا اور کہا ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو' تم تو میری بیوی ہو''.....

اس پہ طوطا طوطی الو پہ جھپٹ پڑے اور گرما گرمی شروع ہوگئی۔

الو بولا..... ''ہمارے اس طرح جھگڑے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا' تم اپنے دعوے پر جمے رہو گے' میں اپنے دعوے پر جما رہوں گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم عدالت سے رجوع کرتے ہیں' جو فیصلہ عدالت کرے گی' وہ مجھے منظور ہوگا''.....

عدالت میں ججوں نے پوری تفصیل سے یہ کیس سنا اور بال آخر فیصلہ سنایا کہ طوطی' الو کی بیوی ہے' لہٰذا اسے الو کے حوالے کیا جائے۔

یہ سن کر طوطا روتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

پیچھے سے الو نے اسے آواز دی۔ ''اکیلے کہاں جا رہے ہو' اپنی بیوی تو ساتھ لیتے جاؤ''.....

طوطے نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا..... ''اب میرے زخموں پہ نمک نہ چھڑکو عدالت کے فیصلے کے مطابق طوطی میری نہیں تمہاری بیوی ہے۔''

یہ سن کر الو نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا..... ''نہیں میرے دوست! طوطی میری نہیں تمہاری ہی بیوی ہے۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بستیاں الو ویران نہیں کرتے بلکہ بستیاں تب ویران ہوتی ہیں جب ان بستیوں سے انصاف اٹھ جاتا ہے۔''

یہ حکایت صاحبان قلم، صاحبان عدل اور صاحبان اقتدار کے لئے ہے جن کا کام انصاف قائم کرنا ہے.....!

◆◆◆

اسلام آباد کا قبرستان اور منیرا پہلوان!

میں دو دن اسلام آباد گزار کر آیا ہوں' کیا خوبصورت شہر ہے' مارگلہ کی پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ شہر یورپ کے کسی شہر کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہاں دامن کوہ ہے جہاں سے شہر کا نظارہ کیا جائے تو یہ شہر ایک خوبصورت خواب کی طرح لگتا ہے۔ یہ شہر مرحوم جنرل ایوب خان نے بسایا تھا۔ مگر اس کے باسی بھی اب انہیں یاد نہیں کرتے البتہ کبھی کبھار ہزارہ سے آنے والے کسی ٹرک پر مرحوم جنرل کی تصویر نظر آ جاتی ہے جو مرحوم سے زیادہ پینٹر کی اپنی تشبیہ سے مماثل ہوتی ہے' یہاں فیصل مسجد ہے جس کے دامن میں مرحوم جنرل ضیاء الحق برائے نام دفن ہیں مگر یہاں کوئی اسلام آبادی فاتحہ پڑھنے نہیں آتا یہ شہر جانے والوں کو یاد نہیں کرتا' یہ صرف آنے والوں کو پہاڑوں کی طرح یاد کرتا ہے!

اس دفعہ میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے ساتھ اسلام آباد کے قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لئے بھی گیا' فاتحہ خوانی کے علاوہ یہاں آنے کا ایک مقصد مرے اور سہمے ہوئے لوگوں کی بجائے زندہ لوگوں سے ملاقات کرنا بھی تھا چنانچہ یہاں میری ملاقات قدرت اللہ شہاب' جوش ملیح آبادی' ممتاز مفتی' منصور قیصر' احسن علی خان اور پروین شاکر سے ہوئی۔ اس قبرستان کے دامن میں اکیڈمی آف لیٹرز ہے قبرستان میں دفن لوگ آج بھی زندہ ہیں مگر چلتے پھرتے نظر آنے والے لوگ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کب کے فوت ہو چکے ہوتے ہیں' صرف انہیں دفنایا نہیں جاتا۔ اسلام آباد میں رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کے باوجود جس مخصوص بو کا احساس ہوتا ہے' وہ انہی چلتے پھرتے بے ضمیر مردہ جسموں سے اٹھتی رہتی ہے! اسلام آباد سے واپسی پر مجھے وزیر آباد آنا تھا جہاں گورنمنٹ ظفر علی خان کالج کے پرنسپل شبیر صاحب نے یوم ظفر علی خان کے حوالے سے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ میرے حافظے نے کمال یہ دکھایا کہ میں ایک روز قبل وزیر آباد پہنچ گیا' یہ شاید اس شہر کی غیر شعوری کشش تھی جس میں میرا بچپن گزرا ہے۔ چنانچہ اگلے روز ملک شفیق صاحب کی معیت میں ایک بار پھر وزیر آباد گیا۔ یہاں مہمان مقررین میں ڈاکٹر مسکین حجازی' چودھری قدرت اللہ اور وقار ملک شامل تھے۔ ان دنوں یوم ظفر علی خان کی اپنی ہی معنویت ہے۔ مولانا ظفر علی خان غاصب انگریز کے خلاف ساری عمر برسرپیکار رہے' کتنی دفعہ جیل میں گئے کتنی ہی مرتبہ ان کا روزنامہ زمیندار بند ہوا اور کتنی دفعہ اس کی ضمانتیں ضبط ہوئیں مگر اس مرد مجاہد نے ہندوستان پر انگریز کے غیر قانونی قبضے کو تسلیم کرنے اور انگریز غاصبوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ آج ہم مصلحتوں اور ''لفافوں'' کے

اسیر ہو کر رہ گئے ہیں' اس ماحول میں مولانا ظفر علی خان' مولانا حسرت موہانی' مولانا محمد علی جوہر اور حمید نظامی کا نام زبان پر لاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ملک کو برباد ہوتے دیکھتے ہیں' سرعام آئین اور قانون کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ اور ہم میں سے کچھ لوگ اس بات پر بھنگڑا ڈالتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ اگرچہ کچھ نہیں آیا لیکن ہمسائے کی ہانڈی تو ٹوٹی!

مولانا ظفر علی خان کے پچھواڑے میں مجید پہلوان کا اکھاڑہ تھا جہاں کبھی میں بھی زور کرنے جایا کرتا تھا' مجھے فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ اکھاڑہ بھی تو بند نہیں ہو گیا مگر حافظ منیر اور عزیز نعمانی نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں' مجید پہلوان فوت ہو گیا ہے مگر اکھاڑہ اب بھی موجود ہے چنانچہ میں دوستوں کے ساتھ اس اکھاڑے کی ''زیارت'' کے لئے گیا۔ وہاں مجید کا بھائی منیر پہلوان لنگوٹ باندھے اور جسم پر تیل لگائے' ورزش سے فارغ ہوا تھا یا ورزش کی تیاری میں تھا۔ ایک اور پہلوان کونڈی میں سردائی گھوٹنے میں مشغول تھا۔ منیر پہلوان اپنے وقت کا چوٹی کا پہلوان تھا۔ اب اس کے ڈولے بھی عمر رفتہ کو آواز دیتے نظر آتے ہیں۔ ویسے بھی ان دنوں ڈولے حریف کے ساتھ پنجہ آزمائی کا کام نہیں آتے بلکہ ان سے صرف سردائی گھوٹی جاتی ہے!

قوموں پر یہ وقت بھی آیا کرتا ہے اور یہ وقت برا ہوتا ہے!

◆◆◆

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے.....!

چند برس پیشتر گورنمنٹ کالج لاہور میں عزیز مکرم پروفیسر عابد تہامی نے مجھے شعبہ صحافت میں لیکچر کے لیے بلایا' لیکچر کے بعد مجھے طلبہ نے گھیر لیا اور میری تحریروں کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی' ان میں سے ایک خوبرو نوجوان نے مجھے مخاطب کیا اور کہا'' آپ کی تحریروں میں بالواسطہ بات کہنے کا جو اسلوب ہے' مجھے لگتا ہے وہ غالب سے شعار لیا گیا ہے'' میں نے چونک کر اس نوجوان سے پوچھا وہ..... ''وہ کیسے'.....؟ بولا'' غالب کہتے ہیں

ہم کہاں کے دانا تھے' کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

تو اس کا وہ مطلب نہیں جو بظاہر نظر آتا ہے بلکہ غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ زمانہ ان کا دشمن ان کی دانائی اور ہنر میں یکتائی ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہی رنگ آپ کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے' آپ بھی اپنے علامتی کالموں میں بظاہر جو کہہ رہے ہوتے ہیں' باطن میں اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔''

آج کے دور میں جب دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کا شعبہ بھی زوال کی زد میں ہے۔ کالج کے ایک طالب علم کی زبان سے اس طرح کی گفتگو میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تھی۔ چنانچہ میری حیرت کو جانچتے ہوئے عابد تہامی نے چائے کی میز پر مجھے بتایا کہ جس نوجوان نے آپ کے کالموں کے حوالے سے غالب کا حوالہ دیا تھا' اس کا نام حسین نواز ہے اور وہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کا بیٹا ہے۔

یہ حسین نواز سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد دو دفعہ میں نے انہیں اور دیکھا مگر یاد نہیں کہاں دیکھا۔ اب پچاس دنوں سے ان کے والدین بہن اور بھائیوں' دادا دادی کسی نے انہیں نہیں دیکھا' کسی کو یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے' صرف والد میاں نواز شریف کا یہ بیان سامنے آیا ہے کہ گورنر ہاؤس مری میں اسیری کے دوران انہیں ایک نوجوان خوش گلو قاری کی تلاوت کی آواز کہیں دور سے سنائی دیا کرتی تھی اور نہیں یقین ہے یہ ان کے بیٹے حسین نواز کی آواز تھی۔ بعد میں یہ خبر بھی چھپی کہ یہ

نوجوان گورنمنٹ ہاؤس مری کے گیراج میں بند ہے۔ ۱۲ اکتوبر کی کارروائی کے بعد وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد میں موجود نظر بندوں کو بھی یہی آواز علی الصبح سنائی دیتی تھی جو سورۂ رحمن کی صورت میں ان کے کانوں میں رس انڈیلتی چلی جاتی تھی۔ ''پس تم اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے'' دینی ماحول میں پرورش پانے والا یہ نوجوان شاید آزمائش کے ان لمحوں کو بھی اپنے اللہ کی رضا جان کر اسے نعمت تصور کرتا ہے۔ وہ اگر اب تک زندہ ہے تو کسی تنگ و تاریک سیل میں خدا پر یقین کی روشنی ہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے' ورنہ پچاس دن کی قید تنہائی زندگی کو ایک تہمت بنا کر رکھ دیتی ہے۔

میں اسے اتفاق نہیں' حسن اتفاق سمجھتا ہوں کہ اس وقت پاکستان کے وزیر داخلہ معین الدین حیدر ہیں۔ سندھ میں اپنی گورنری کے دوران انہوں نے نیک شہرت کمائی ہے۔ جب انہیں اس عہدے سے تبدیل کیا گیا تو میرے منہ سے بے ساختہ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کے الفاظ ادا ہوئے تھے۔ بعض دوسرے جرنیلوں اور فوجی افسروں کی طرح وہ بھی ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور ممکن ہے میں غلطی پر ہوں مگر میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ادب سے تعلق رکھنے والا شخص بہرصورت دوسروں سے بہت بہتر ہوتا ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ادب انسان کی تہذیب کرتا ہے۔ اس حسن ظن کی بناء پر میں جناب معین الدین حیدر سے درخواست کروں گا کہ وہ حسین نواز کے جرم سے عوام کو آگاہ کریں اور انہیں عدالت میں پیش کریں۔ صرف حسین نواز نہیں بلکہ ابھی تک جن سیاسی اسیروں کو عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ان سب کو قانونی ضابطوں سے گزاریں' ابھی تک مشاہد حسین' اسحاق ڈار اور پرویز رشید کے بارے میں بھی متضاد قسم کی خبریں آ رہی ہیں' اسی طرح کچھ دوسرے لوگ ہیں' جنہیں 12 اکتوبر کے بعد حراست میں لیا گیا ہے' ان سب پر عائد الزامات کے بارے عوام کو کچھ نہیں بتایا گیا' ان سب کو عدالتی مراحل سے گزارا جائے اسی طرح ان دنوں سیف الرحمان کے بارے میں خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ وہ جیل میں بھی کبھی رونے لگتے ہیں' کبھی اچانک کھلانے لگے ہیں' کبھی کوئی خیالی مچھر مارتے ہیں' ممکن ہے کچھ لوگوں کے لئے یہ خبریں ہنسنے کا موقع فراہم کرتی ہوں مگر وہ لوگ بہت ظالم ہیں جو اس طرح کی خبروں پر ہنس سکتے ہیں۔ سیف الرحمان کی یہ ذہنی کیفیت بہت تشویشناک ہے اگر یہ خبریں سچ ہیں اور کردار کشی کی غرض سے نہیں پھیلائی گئیں تو پھر انہیں فوری طور پر ہسپتال میں داخل کروانا چاہیے اور ان اصحاب و ارباب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں جو کل تک نواز شریف اینڈ کو ..... ''کو'' سے مراد کمپنی ہے کی شان میں قصیدہ نگاری کا ایک ناغہ بھی نہیں کرتے تھے اور آج اینڈ کو کو پھانسی سے کم سزا دینے کا مطالبہ دہرانے میں کسی روز بھی چھٹی نہیں کرتے۔ میری بریگیڈئر قریشی کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ ان احباب کے اداریے اور کالم ایک فائل کی صورت میں اپنے باس محترم کو بھجوا دیں۔

اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے' میں جب کبھی اس طرح کے واقعات پڑھتا یا سنتا ہوں' مجھے وہی طوطا طوطی والی حکایت یاد آتی ہے جو میں نے ایک گذشتہ کالم میں بیان کی تھی اور جس کا لب لباب یہ تھا ''بستیاں الو ویران نہیں کرتے' بستیاں اس وقت ویران ہوتی ہیں جب وہاں سے انصاف اٹھ جاتا ہے۔''

◆◆◆

زیر تربیت خوشامدی!

میں نے دیکھا کہ ایک خوش پوش' خوش رو نوجوان جس کی عمر 35 اور 40 کے درمیان ہے' ایک بڑا سا تھال ہاتھوں میں تھامے میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں قدم رنجہ فرماتا ہے' نام اس نوجوان کا عبدالغفور ہے' قلمی نام اسکندر ابن اسکندر ہے' میں اسے برس ہا برس سے جانتا ہوں اور وہ مجھے زیادہ برس ہا برس سے جانتا ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں تھال دیکھا تو پوچھا ''عزیزم! یہ کیا اٹھائے پھرتے ہو؟'' بولا ''شاگرد بیٹھنے آیا ہوں' تھال میں گڑ' پگڑی اور سوا روپیہ ہے' جو آپ کی نذر ہے!''

میں نے پوچھا ''عزیزم' شاگردی کس شعبے میں درکار ہے' یہ ہمچدان طب وحکمت' رمل ونجوم شرعی وغیر شرعی غرض کہ تمام شعبوں میں خدا کے فضل وکرم سے طاق ہے۔''

بولا ''میں خوشامد کے سلسلے میں جناب کی شاگردی اختیار کرنے آیا ہوں' اس فن میں طاق ہو گیا تو باقی تمام شعبوں کا استاد خود بخود تسلیم کر لیا جاؤں گا!''

میں نے کہا ''برخوردار' اس فن میں تمہارا نام انشاء اللہ ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے' میں تو خود اس سلسلے میں تم سے رجوع کرنے والا تھا۔''

اسکندر ابن اسکندر نے میرے پاؤں چھوتے ہوئے کہا ''استاد' مجھے شرمندہ نہ کریں' جو کچھ سیکھا ہے' آپ کے قدموں کی طفیل سیکھا ہے لیکن ان دنوں صورت حال قدرے مختلف ہے' نئے لوگ ہیں' نیا ماحول ہے' انہیں سابقہ حکومتوں سے میرے تعلقات اور معاملات کا بھی علم ہے' لہٰذا اپنے پچاس سالہ تجربے کی روشنی میں مشورہ دیں کہ ان حالات میں خوشامد کے لئے کیا لائن اختیار کرنی چاہیے!''

میں نے شفقت سے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا ''عزیزم ان دنوں خوشامد کا جو بحران پیدا ہوا ہے' اس سے ہم سب متاثر ہو رہے ہیں' اس سے پہلے اس شعبے میں صرف دو چار نام سامنے آئے تھے' یہ خاندانی لوگ تھے' ان کا خاندان کئی پشتوں سے حاکمان وقت کی خوشامد کے سلسلے میں بہت نیک نام گردانا جاتا تھا' اب تو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا خوشامدی بننے کے چکر میں ہے جس کی وجہ سے یہ فن

بدنام ہورہا ہے Out put بھی وہ نہیں جو ہونا چاہیے!''

یہ سن کر اسکندر ابن اسکندر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا' اس نے ایک دفعہ پھر میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی' میں نے اس کی سہولت کے لئے گھٹنا اوپر اٹھالیا'' مرشد! آپ تو سارا مسئلہ ہی سمجھ گئے ہیں' اب بتائیں میرے لیے کیا ہدایت ہے۔''

اس پر میں نے اسے ایک لمبا لیکچر دیتے ہوئے کہا۔'' دیکھو برخوردار' تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' تم بہت کم عمر میں اس فن کی طرف متوجہ ہوئے ہو' لوگ عموماً پچاس سال کے بعد بے غیرت ہونا شروع ہوتے ہیں' تم نے ماشاءاللہ تیس سال کی عمر ہی میں اس سلسلے کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں' لہٰذا تمہارا روشن مستقبل ہر نئے دور میں تمہارا منتظر ہے۔ ان دنوں تمہارے لئے خوشامد کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہ لکھو بلکہ کچھ امور پر اختلاف کا اظہار شروع کر دو مثلاً یہ کہ نواز شریف کو پھانسی دینا عاقبت نا اندیشی ہوگی لہٰذا انہیں عمر قید دی جانی چاہیے' اس سے ایک تو سادہ لوح لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ تم نواز شریف کے جانی دشمن نہیں ہو اور دوسرے تم لوگوں کو موت دکھا کر بخار کے لئے تیار کرنے کی پالیسی میں مدد و معاون ثابت ہو گے اور یوں بظاہر خوشامد کئے بغیر متعلقہ حلقوں میں تمہارے درجات بلند ہوں گے۔''

'' یہ تو صرف ایک کام ہوا' اس سے تو کام نہیں چلے گا'' اسکندر ابن اسکندر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

'' ذرا صبر سے کام لو'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا'' دوسرا کام کرنے کا یہ ہے کہ ہر برائی سابقہ حکومت کے ساتھ منسوب کرتے چلے جاؤ' اس سلسلے میں جھوٹ کی پرواہ نہ کرو' تمہیں اندازہ نہیں کہ جھوٹ میں کتنی طاقت ہے' اس کے ساتھ ساتھ ایک کام اور بھی کرنے کا ہے اور وہ یہ کہ ان دنوں نواز شریف' شہباز شریف' ان کے اہل خاندان اور دوسرے سیاسی اسیروں یا بغیر مقدمے کے کسی نامعلوم مقام پر قید جو لوگ ہیں' تم ان زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاؤ اور اس سے ایک بار پھر تمہاری انصاف پسندی ظاہر ہوگی مگر جو الزامات تم ان پر لگا چکے ہو گے' اس کے بعد عام لوگوں اور متعلقہ افراد کے دلوں میں اسیروں کے لئے ہمدردی کی بجائے ان کے خلاف مزید زیادتی کی خواہش پیدا ہوگی' اس ضمن میں اپوزیشن جماعتوں کے رہنماؤں کے بیانات تمہارے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ اور بھی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ نواز شریف کی حکومت میں بھی نواز شریف کے خلاف تھے' ان کی تحریریں بھی مشکوک ہو جائیں گی' یہ بھی ضروری ہے تاکہ کوئی عزت دار عزت دار نہ رہے۔''

یہ سن کر اسکندر ابن اسکندر نے ایک لمبا سانس لے کر کہا'' اگر لوگوں کو سابقہ حکومت کے وہ بے شمار اچھے کام یاد آ گئے جن کا ذکر میں خود اپنی تحریروں میں کرتا رہا ہوں تو پھر صورت حال کیا ہوگی؟''

یہ سن کر میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا ''عزیزم' میں سمجھتا تھا کہ تم خوشامد کے سارے اسرار و رموز سمجھتے ہو مگر تمہاری اس بات سے اندازہ ہوا کہ تم ابھی کچے ہو۔ میاں' ایک تو لوگوں کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور دوسرے پینترا بدلتے ہوئے اگر کوئی خوشامدی سوچ میں پڑتا ہے تو اس کا مطلب ہے' اس کی ریاضت نامکمل ہے۔ تمہیں واقعی وقفے وقفے بعد میرے پاس آنے کی ضرورت ہے۔ یہ جو تم میرے لئے تھال میں نذرانہ لے کر آئے ہو' میں اسے قبول کرتا ہوں۔ تم آج سے زیر تربیت خوشامدی ہو!''

◆◆◆

ماما جی دی عدالت.....!

مکمل غور فکر اور سنجیدگی سے سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمام ملکی عدالتیں ادارے اور مختلف ایجنسیاں ختم کر دینا چاہئیں اور ان اداروں کے افراد کو بے روزگاری سے بچانے کے لئے انہیں مختلف محکموں پر بطور چیف ایگزیکٹو متعین کر دینا چاہیئے۔ حال ہی میں تیس کے قریب چیف ایگزیکٹو محکمہ تعلیم میں مقرر ہونے کی خبر آئی ہے جن میں سے چودہ کا تعلق فوج کے محکمہ سے ہے۔ ملک میں پھیلائی جانے والی رنگ برنگی افواہوں میں سے ایک افواہ کے مطابق ان میں سے ہر چیف ایگزیکٹو کی تنخواہ پچاس ہزار روپے ماہوار ہوگی۔ میں بہت عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارا معاشرہ خدا کے فضل و کرم سے اداروں اور افراد کے کڑے احتساب کی ذمہ داری رضا کارانہ طور پر اپنے ہاتھوں میں لے چکا ہے۔ اس کی اعلیٰ کارکردگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کی مختلف ایجنسیاں' حساس ادارے اور تفتیشی ٹیمیں برس ہا برس کی محنت سے جن حقائق تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں ہمارے لوگ چشم زدن میں ان تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً محترمہ بے نظیر بھٹو جب وزیر اعظم تھیں انہوں نے نواز شریف فیملی کے حسابات اور کھاتوں پر جاسوسوں کی فوجوں کے ساتھ حملہ کر دیا تھا' ان کی کرپشن عوام کے سامنے لانے کے لئے نئے محدب شیشے ایجاد کئے تھے' اسی سالہ میاں شریف کو ایف آئی اے کے حکام دھکے دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے اور کئی دن ''سیف ہاوس'' میں رکھ کر تفتیش کا حربہ آزمایا تھا' ان کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد بھی شدید قسم کے دباؤ اور حراست میں رکھے گئے بلکہ جس شخص کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ گزرا کہ وہ شریف فیملی کے ہیر پھیر کے بارے میں کوئی معمولی سی اطلاع بھی دے سکتا ہے اسے حراست میں لے لیا گیا مگر ان تمام کارگزاریوں کے باوجود کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ نئی حکومت بھی اس کام میں مگن ہے۔ مگر دو مہینے گزر گئے ہیں ابھی تک کچھ سامنے نہیں آیا۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ شریف خاندان معصوم ہے' کیونکہ اخبارات میں روزانہ ان کی کرپشن کے بیسیوں واقعات شائع ہوتے ہیں' ابھی گذشتہ دنوں ایک مذہبی جماعت کے لیڈر کا یہ بیان اخبار میں شائع ہوا ''لاہور اسلام آباد موٹروے کی تعمیر میں چار سو ارب روپے خورد برد کئے گئے'' حالانکہ اس موٹروے کی تعمیر پر ٹوٹل چالیس ارب روپے کے قریب رقم خرچ ہوئی ہے مگر اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ مذکورہ مذہبی لیڈر کا بیان غلط ہے' ایک مذہبی پیشوا نے اگر الزام لگایا ہے تو وہ یقیناً صحیح ہوگا چنانچہ چار سو ارب

کیسے کھائے گئے اور اگر یہ پتہ چلانا ممکن نہ ہو تو بھی اس مذہبی پیشوا کا احترام ہم پر فرض ہے کہ اس نے ایک ایسے راز سے پردہ اٹھایا جو اس کائنات کے راز سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے' آج انہوں نے یہ معمہ حل کیا ہے' کل وہ کائنات کا معمہ بھی اسی انداز میں حل کریں گے اور اگر یہ ممکن نہ ہوا تو شمع معمہ تو بہر حال حل کر ہی لیں گے' سنا ہے اس پر لاکھوں کا انعام ہے۔

بات خواہ مخواہ ایک مذہبی پیشوا اور ایک خاندان کی طرف چلی گئی' اللہ گواہ ہے کہ میں یہ کالم عمومی صورتحال کے بارے میں لکھنا چاہ رہا تھا اور عمومی صورت حال یہ ہے کہ کافی عرصے سے آپ کسی بھی شخص پر کوئی الزام عائد کر سکتے ہیں اور اس کے لئے کسی ثبوت کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ معاشرہ آپ سے اس کا کوئی ثبوت طلب کرتا ہے۔ آپ موجودہ حکومت کے کسی بھی اہلکار کے بارے میں یہ بات وثوق سے نہایت ذمے دار لوگوں کے درمیان بیٹھ کر کہہ سکتے ہیں کہ حکومت چاند تک ایک سڑک تعمیر کر رہی ہے' صرف اس کی ڈیزائننگ پر بیس کروڑ روپے خورد برد کر لئے گئے ہیں اور نہایت گھٹیا میٹریل استعمال کیا جا رہا ہے' جسکے نتیجے میں کئی ویگنیں آدھے راستے سے زمین پر آن گریں گی۔ آپ یقین کریں یا رلوگ اس خبر پر یقین کر لیں گے اور ہیرا پھیری کرنے والوں پر لعن طعن شروع کر دیں گے اور انہیں رشک کی نظروں سے بھی دیکھیں گے کہ خدا ایسا موقع ہمیں کیوں عطا نہیں کرتا؟ میرا ایک دوست ہے جو سائیکل پر دفتر آتا جاتا ہے' اس کا گھر بھی نہایت معمولی ہے' اس کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ کروڑ پتی ہے' اس دن سے خود میں اس سے متنفر ہو گیا ہوں کہ کیا گھٹیا آدمی ہے' کروڑ پتی ہوتے ہوئے گذشتہ دو برس سے میرے تین سو روپے واپس نہیں کر رہا جو اس انے اپنی علالت کے دوران مجھ سے ادھار لئے تھے۔

ایک وقت تھا کہ کسی سے انتقام لینا ہوتا تھا اور اسے معاشرے میں اچھوت بنانا مقصود ہوتا تھا تو اسے کسی مردود فرقے سے منسوب کر دیا جاتا تھا' اب اسے کرپٹ قرار دے دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی شخص اخبارات میں بیان دے سکتا ہے جو باسانی شائع ہو جائے گا' اس کے بعد وہ شخص دیواروں کے ساتھ ٹکریں مارتا پھرے اور ثبوت طلب کرتا پھرے اور اگر مقدمہ عدالت میں ہے فیصلہ کا انتظار کرنے کے لئے کہا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' بس کہہ دیا لوٹ کر کھا گیا ہے تو بس لوٹ کر کھا گیا ہے۔ بعض اخبارات خود ہی الزام لگاتے ہیں' خود ہی سزا سناتے ہیں اور لوگ اس الزام کو جنگل کی آگ کی طرح پورے معاشرے میں پھیلا دیتے ہیں۔ ہم میں سے یقیناً کوئی ہے جو پورے معاشرے کو بے وقار اور بے اعتبار ثابت کرنا چاہتا ہے تاکہ مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور ہم سب جانتے ہیں انتہا کو پہنچنے والی مایوسی کے بعد کون سی طاقتیں ہیں جو اس سے فائدہ اٹھایا کرتی ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں ظریف مرحوم کی ایک فلم دیکھی تھی۔ اس فلم میں ظریف کو سارا گاؤں ''ماما جی'' کہتا تھا اور اس ماما جی کی ایک عدالت تھی جو ایک

چارپائی پر مشتمل تھی۔ جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا' ماما جی کی عدالت بچھا دی جاتی اور فیصلہ سنا دیا جاتا۔ چنانچہ میرے نزدیک آج بھی کسی عدالت کی ضرورت نہیں ہر قسم کے مقدمے کے لئے ''ماما جی دی عدالت'' کافی ہے کہ کسی ثبوت وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑا جاتا' دو منٹ کی سماعت کے بعد موقع پر ہی فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

◆◆◆

آج.....اور.....کل

ان دنوں اخبارات میں جیلوں اور جیلوں میں دی جانے والی اذیتوں کا ذکر عام ہے۔اس حوالے سے مجھے کچھ باتیں یاد آ رہی ہیں موازنہ آپ خود کر لیجئے کہ تب..... اور.....اب میں کیا فرق ہے۔

والد ماجد مولانا پیرزادہ بہاء الحق قاسمی کو قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد بھی جیل جانے کا اتفاق ہوا۔ قیام پاکستان سے قبل انگریز کے خلاف باغیانہ تقریروں کے سلسلے میں دو مرتبہ جیل گئے اور قیام پاکستان کے بعد جنرل اعظم کے مارشل لاء میں پہلے شاہی قلعہ لے جائے گئے اور پھر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

انگریز کے زمانے کی جیل کوئی آسان جیل نہیں تھی' سیاسی قیدیوں سے بھی مشقت لی جاتی تھی' صرف یہی نہیں بلکہ انہیں سخت ذہنی جسمانی اذیتوں سے بھی گزارا جاتا تھا مگر یہ وہ قیدی ہوتے تھے جنہیں سخت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ان خطرناک قیدیوں میں ایک شورش کاشمیری مرحوم و مغفور بھی تھے۔جنہیں عین شب عروسی میں انگریز کے تنخواہ دار ہندوستانی سپاہی گرفتار کر کے لے گئے' اس مرد مجاہد نے اپنے شباب کے آٹھ سال قید و بند میں گزارے' یہ وہ لوگ ہیں' ہم آزاد پاکستان میں رہنے والے جن کا احسان کبھی نہیں اتار سکتے کہ پاکستان ہمیں ان لوگوں کی عدیم المثال قربانیوں کے نتیجے میں بھی حاصل ہوا۔امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری کا بھی یہ عالم تھا کہ بقول ان کے ''میری آدھی عمر ریل (مختلف شہروں میں تقریروں کے لئے کئے جانے والے سفر کی وجہ سے) میں اور آدھی عمر جیل میں کٹ گئی'' والد مرحوم بتایا کرتے تھے کہ شورش کاشمیری کو جیل میں شدید اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔حتیٰ کہ ان کے منہ پر غلاظت باندھ دی جاتی تھی مگر آزادی کے اس متوالے کے پائے استقلال میں رتی بھر لغزش نہیں آئی۔

امرتسر میں ہمارے مکان کے باہر سی آئی ڈی کا ایک اہلکار مستقل بیٹھا کرتا تھا' والد ماجد جہاں جاتے' وہ سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتا مگر والد ماجد کے کوئی خفیہ عزائم نہیں تھے۔انہوں نے جو کہنا ہوتا تھا' وہ بھرے جلسے میں کہہ دیتے تھے چنانچہ کچھ عرصے بعد سی آئی ڈی کا یہ اہلکار کافی RELEXED محسوس کرنے لگا' بلکہ کچھ عرصے بعد والد ماجد کے کردار کی وجہ سے اس کے دل میں ان کی عقیدت بڑھتی چلی گئی اور پھر وہ گاہے گاہے ہمارے لئے بازار سے سودا سلف بھی لینے چلا جاتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد غالباً 1953ء میں اینٹی قادیانی تحریک کا آغاز ہوا' جس کے نتیجے میں جنرل اعظم خان کا مارشل لاء نافذ ہوا'

میری عمر اس وقت صرف دس سال تھی۔

والد ماجد اور دوسرے علما کو مسجد وزیر خان سے گرفتار کیا گیا اور تفتیش کے لئے شاہی قلعے لے جایا گیا۔ شاہی قلعے کا تہہ خانہ کسی زمانے میں پاکستان کا سب سے بڑا ٹارچر سیل تھا' ہم گھر والوں کو ڈیڑھ ماہ تک کچھ پتہ نہیں تھا کہ ابا جی کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ میں تو بچہ تھا لیکن باقی گھر والے اس عرصہ میں جس اذیت سے گزرے' اس کا احوال وہ آج بھی بیان کرتے ہیں تو پریشان ہو جاتا ہوں' تفتیش کے دوران والد ماجد کو شدید اذیتیں دی گئیں' انہیں کھانا کھلانے کے بعد ایک کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا اور سر پر نہایت تیز روشنی کا بلب جلا دیا جاتا' کرسی کے پیچھے ایک سنگین بردار کھڑا ہو جاتا' تفتیش کے دوران والد ماجد پہ جب جب غنودگی طاری ہونے لگتی تو وہ پیچھے سنگین کی نوک چبھوتا اور کہتا ''مولانا! جاگتے رہیں'' اس طرح مسلسل تین راتیں ابا جی سونے نہیں دیا گیا۔ اس طرح کی دیگر اذیتوں کے بعد ایک دن انہیں ٹارچر سیل کے انچارج کے حضور پیش کیا گیا' اس نے والد ماجد کو دیکھتے ہی کہا۔ ''مولانا! آپ اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے تا کہ آپ کی میت آپ کے گھر والوں کے سپرد کی جا سکے'' والد ماجد نے پورے سکون سے جواب دیا۔ ''ایڈریس آپ کے پاس ہوگا' لیکن لکھ لیجئے کہ میری زندگی کا ایک لمحہ بھی آپ نہ گھٹا سکتے ہیں اور نہ بڑھا سکتے ہیں'' یہ استقامت دیکھ کر انچارج نے کہا ''میرا مطلب تھا' خدانخواستہ اگر آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے'' یہ کہتے ہوئے اس نے قلعے کے ایک اہلکار کو ایک عالم دین کا نام لے کر انہیں لانے کے لئے کہا۔ والد ماجد بتاتے ہیں کہ وہ مولانا کمرے میں داخل ہوتے ہی سیدھے انچارج کے پاؤں میں گر گئے اور زار و قطار رونا شروع کر دیا اور معافی مانگنا شروع کر دی۔ انچارج نے طنز بھری نظروں سے والد محترم کی طرف دیکھا اور پھر اہلکار سے ان مولانا کو واپس لے جانے کے لئے کہا۔ جب والد محترم نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں ان سے ان عالم دین کا نام پوچھا مگر والد ماجد نے اپنی آخری سانسوں تک ان کا نام نہیں بتایا۔ اس کے جواب میں ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ ایک تو اسلام ہمیں پردہ داری کا حکم دیتا ہے اور دوسرے خدا جانے ان پر کس درجہ مظالم ہوئے تھے کہ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج تک کسی ایسے شخص پر ہنس نہیں سکا اور نہ اس پر طعن پسند کیا جو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد کسی کمزوری کا مرتکب ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ کسی کو امتحان میں نہ ڈالے۔ والد ماجد کردار کی استقامت کے سلسلے میں مولانا عبدالستار خان نیازی کی بہت تعریف کرتے تھے۔ جب والد محترم شاہی قلعہ سے جیل میں منتقل کئے گئے تو ان دنوں فوجی عدالت نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو موت کی سزا سنائی' وہ پھانسی والے لباس میں جب قیدیوں کی بیرک کے سامنے سے گزرے تو کچھ قیدیوں نے اس عالم میں انہیں دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ مولانا نے انہیں اپنی شیر جیسی آواز میں مخاطب کیا اور کہا ''روتے کیوں ہو..... اللہ پر بھروسا رکھو!''

آخر میں میرے عزیز دوست اور صاحب طرز نگار جاوید چوہدری کے ایک حالیہ کالم کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''یقین فرمایئے..... پاکستان میں شاید ہی ایسا تھانہ ایسا پولیس سٹیشن ہو جس میں ایسے لوگوں کی قبریں نہ ہوں جنہیں پولیس نے شک کے ''جرم'' میں گرفتار کیا تھا۔ اور جو تفتیش کی تاب نہ لا کر دم توڑ گئے تو انہیں جپ چاپ تھانے ہی کے صحن میں بغیر غسل' بغیر کفن اور بغیر جنازے کے دفن کر دیا گیا' آپ کے شہر کے قبرستان میں ایسی بیسیوں قبریں ملیں گی جو پولیس کے اہلکاروں نے رات کے سناٹے میں کھودیں' بھریں اور پھر ان پر ''خبردار جو زبان کھولی'' کی سل رکھ دی۔ ہماری سیکرٹ ایجنسیوں کے سیف ہاؤسز کے صحنوں میں بھی ایسے درجنوں گوشے' ٹوئے اور بے ہیں جن کے نیچے بے گناہوں کا لہو آج بھی چیخ رہا ہے۔ اور جن میں دفن ٹوٹی کچلی ہڈیاں آج بھی اپنا حق مانگ رہی ہیں۔ اور اس ملک کا شاید ہی کوئی شہر' قصبہ اور گاؤں ہو جس کی گلیوں کی دیواروں سے پولیس مقابلے میں مارے جانے والوں کی چیخیں نہ چپکی ہوں' یہ چیخیں' یہ ہڈیاں' یہ لہو اور یہ بے نام و نشان قبریں بھی اپنا حق مانگتی ہیں۔ یہ بھی پکار پکار کر کہتی ہیں' ہماری مائیں بہنیں اور بیٹیاں تھیں' ہمارا نام بھی حسین تھا' ہمارے پاس بھی پاکستان کا شناختی کارڈ تھا اور ہمیں بھی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔ لیکن افسوس کسی نے آج تک ان لوگوں کے حقوق کی بات نہیں کی۔''

میں بھی برادرم جاوید چوہدری کے اس دردمندانہ احتجاج میں اپنی نحیف سی آواز شامل کرتا ہوں کہ میں اس خاندان کا سپوت ہوں جو قید و بند کی صعوبتوں اور اذیتوں سے صدیوں سے گزرتا چلا آ رہا ہے.....!

◆◆◆

اوپر، نیچے اور درمیان!

میاں نواز شریف برسر اقتدار تھے تو مختلف طبقوں کو ان سے مختلف شکایات تھیں اور اخبارات کے صفحے کے صفحے ان شکایات سے بھرے ہوتے تھے۔ ہر اخبار کی شہ سرخی شاہ کی نیند میں خلل ڈالنے والی ہوتی تھی۔ چند ایک شکایات درج ذیل تھیں:۔

پڑھے لکھے نوجوانوں کو شکایت تھی کہ وہ کئی برسوں سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں بغل میں دبائے دفتروں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ مگر انہیں نوکری نہیں ملتی کہ حکومت نے نوکریوں پر بین لگایا ہوا ہے۔

دو تین ہزار روپے ماہوار کی کمائی والے خاندان کو شکایت تھی کہ ان پیسوں میں صرف دو وقت کی روٹی کھانا بھی ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ گھر بھی کرایہ پر لیا جائے۔ بچوں کو تعلیم بھی دلائی جائے۔ اور دوسرے اخراجات بھی پورے کئے جائیں۔

دس پندرہ ہزار روپے ماہوار کمانے والوں کو شکایت تھی کہ بجلی اور ٹیلیفون کے بلوں اور ان پر لگائے گئے سرچارج نے ان کے لئے وضعداری کا بھرم رکھنا ناممکن بنا دیا ہے۔

اخبارات غربت اور افلاس کے مارے ہوئے افراد کی خودکشیوں کی خبر سے بھرے ہوتے تھے۔

تھانوں اور کچہریوں میں عوام پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی ہوتی ہے۔

مذہبی طبقے ٹیلی ویژن پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ ادارہ فحاشی کے کلچر کو فروغ دے رہا ہے۔ چنانچہ خواتین کے سروں پر دوپٹہ نہیں ہوتا اور ٹی وی اسکرین پر رقص و سرود کی محفلیں جمائی جاتی ہیں۔

انڈیا کو پاکستان کا دشمن نمبر ایک سمجھنے والے میرے جیسے لوگ انڈیا کے ساتھ بغیر کسی واضح یقین دہانی کے کشمیر پر ہونے والے بظاہر بے مقصد مذاکرات اور بیک ڈور ڈپلومیسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

کارگل سے واپسی کے فیصلے پر بھی کچھ حلقوں کو اعتراض تھا ان کا خیال تھا کہ کشمیر کی فتح کا نادر موقع گنوا دیا گیا ہے۔ تاہم کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ہم کارگل سے آگے نہیں جا سکتے تھے۔ البتہ دوستوں کے خیال میں وسائل کی کمی اور بین الاقوامی برادری کی بھرپور مخالفت کے باوجود وہاں مزید کچھ عرصہ قیام کر کے پوری دنیا کو بھرپور طریقے سے مسئلہ کشمیر کی سنگینی کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔

ملک کولوٹ کر کھا جانے والے نادہندگان کے خلاف اخبارات مسلسل شعلہ فشانی کرتے تھے۔اس ضمن میں کی جانے والی حکومتی کوششوں کو ناکامی قرار دیا جاتا تھا۔

قانون اور آئین کی بالادستی کے قائل طبقے نواز شریف پر الزام لگاتے تھے کہ وہ سارے اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر کے یہ فرد واحد کی حکمرانی قائم کر رہے ہیں۔

عوام کی شکایت تھی کہ ان کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔اخبارات بتاتے تھے کہ چوریاں' ڈاکے اور بموں کے دھماکے شہریوں کا امن وسکون غارت کئے ہوئے ہیں۔

کاروباری طبقہ پریشان تھا کہ بقول ان کے کاروبار بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔

ماہرین اقتصادیات ملک کی اقتصادی حالت کو تشویش ناک قرار دیتے تھے۔

ان ساری شکایات کے حوالے سے کوئی فیصلہ سنانا میرے لئے ممکن نہیں کہ اس سے پہلے مجھے ان کی وجوہات میں جانا پڑے گا۔ اور پھر کالم' کالم نہیں مقالہ بن جائے گا۔ بلکہ میرے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں حتمی طور پر عوام اور خواص کو ان کے مسائل کے حل ہونے کی خوشخبری یا نہ ہونے کی وعید سنا سکوں۔ چنانچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ نوکریوں پر سے پابندی اٹھی ہے کہ نہیں اور یوں بے روزگار نوجوان کس حال میں ہیں' اللہ بہتر جانتا ہے۔

دو تین ہزار ماہوار کمائی والے خاندانوں کی ابھی تک سنی گئی ہے۔ یا وہ اسی طرح پریشان ہیں' بجلی' ٹیلی فون اور پیٹرول کی قیمتوں میں کمی یا اضافے کا بھی مجھے علم نہیں۔ ماضی میں حالات کے مارے ہوئے لوگ خودکشی پر مجبور ہو گئے تھے ان دنوں شاید وہ نہیں کرتے تھانوں اور کچہریوں میں ہونے والے مظالم کا خاتمہ بھی شاید ہو گیا ہو۔ مجھے علم نہیں کہ سودی نظام تا حال ختم ہوا ہے کہ نہیں۔ اسی طرح ٹیلیویژن پر ہونے والی فحاشی کے خاتمے کے بارے میں بھی میں بے خبر ہوں۔ بیک ڈور ڈپلومیسی شاید ابھی تک جاری ہے یا ممکن ہے ختم ہو گئی ہو۔ کشمیر کی فتح کے سلسلے میں ہونے والی کسی پیش رفت کا بھی مجھے علم نہیں۔ نادہندگان کے بارے میں اب کوئی خبر نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ ان سے ڈھائی سو ارب روپے وصول کر لئے گئے ہوں۔ قانون اور آئین کی حکمرانی قائم ہو چکی ہو۔ اور اب پاکستان پر فرد واحد کی حکمرانی نہ ہو۔ ممکن ہے دہشت گردی' ڈاکوؤں اور قتل و غارت گری پر قابو پا لیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کاروبار چل پڑے ہوں۔ اور ملکی معیشت بہتر ہو گئی ہو۔

میں پہلے کی طرح ان معاملات میں پورے یقین سے کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں اس لئے نہیں ہوں کہ ان سارے

معاملات سے اخبارات کی شہ سرخیاں ہمیں آگاہ اور بے چین رکھا کرتی تھیں۔ اور بقول شخصے ان سے کسی مسیحا کی آمد کا اشارہ بھی ملتا تھا لیکن اب صورتحال مختلف ہے۔ جبکہ پہلے میں ملک سے باہر تھا۔ اس لئے ان سرخیوں اور معاملات سے زیادہ باخبر نہیں تھا۔ ان دنوں نمبر ون طیارہ کیس ہے باقی خبریں اب معمولی نوعیت کی ہیں۔

چنانچہ ان کی اوقات کہیں اندر کے صفحات میں سنگل کالمی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان دنوں میں آپ اور ہم سب صرف طیارہ کیس کی خبریں پورے شوق سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ جانتا ہے کہ اوپر کیا ہو رہا ہے اور نیچے کیا ہو رہا ہے۔ درمیان میں ہم عوام ہیں اور عوام کے متعلق غالب نے کہا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

◆◆◆

خواب دیکھنا منع ہے

گذشتہ روز سے اخبارات میں سو بچوں کے قتل کا تذکرہ ہو رہا ہے' مجھے اس حوالے سے اپنے دو دکھوں کا اظہار کرنا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے درمیان ایسے درندے بھی موجود ہیں جن کے لئے انسانی قتل خصوصاً معصوم بچوں کا قتل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور وہ روزانہ ایک بچہ قتل کر کے اس کے جسم کے ٹکڑے تیزاب والے ڈرم میں پھینک دیتے ہیں۔

میرا دوسرا دکھ اس دکھ سے کہیں زیادہ ہے اور وہ یہ کہ ہمارا معاشرہ اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ اسے چونکانے کے لئے کم سے کم سو بچوں کا قتل ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ ہم جب صبح گھر سے نکلتے ہیں اور شام کو گھر واپس آتے ہیں تو ان چند گھنٹوں میں ہماری آنکھیں جو مناظر دیکھتی ہیں' وہ ایک نارمل انسان کا دل ہلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ گھر سے دفتر جاتے ہوئے میلے کچیلے بچے' آوارہ کتوں اور بلیوں کے ساتھ کوڑے کے ڈھیر میں سے اپنی خوراک تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں پاؤں اور ٹانگوں سے معذور کوئی شخص گھسٹ گھسٹ کر سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ اچھرہ موڑ اور شہر کے کئی دوسرے چوراہوں میں سینکڑوں کی تعداد میں مزدور ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کی کدال یا رنگ سازی کا سامان ان کے ساتھ دھرا ہوتا ہے۔ جب ان کے نزدیک کوئی کار آ کر رکتی ہے تو وہ سب بھاگ کر اس کی طرف جاتے ہیں کہ شاید ان کے بچوں کے لئے آج کی روزی کا وسیلہ غیبی فرشتے کی صورت آن پہنچا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ کی یہ آس پوری ہوتی ہے باقی پھر ایڑیاں اٹھا اٹھا کر کسی فرشتے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ مگر شام کو جب وہ اپنے تنگ و تاریک گھروں کو لوٹتے ہیں تو ان کی آنکھیں ویران اور ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ ورکشاپوں' ہوٹلوں اور اس طرح کے دوسرے "ٹارچر سیلوں" میں ننھے منے خوبصورت بچے دس پندرہ روپے دیہاڑی پر "استاد" کی گالیاں سنتے اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

مگر ہم میں سے کسی کی آنکھیں ان مناظر پر نم نہیں ہوتیں۔ میں ایک روز ایک پٹرول پمپ پر پٹرول ڈلوانے کے لئے رکا تو میں نے دیکھا کہ سروس اسٹیشن کا "استاد" ایک "چھوٹے" کو سڑک کی دوسری جانب سے' ٹانگوں سے گھسیٹتا لایا۔ اور "ہودی" میں پھینک دیا۔ جس میں گاڑیوں کا گندہ موبل آئل جمع کیا جاتا ہے۔ اس "دلچسپ" منظر پر وہاں کھڑے تماشائی بہت محظوظ ہوئے۔ اس طرح ایک دن میری آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ دن بھر مشقت کے بعد ایک ورکشاپ کا استاد اور اس کے دو ساتھی فٹ بال سے دل

بہلا رہے تھے۔ اور یہ ''فٹ بال'' ساتھ آٹھ سال کا ایک ''چھوٹا'' تھا جس کی کمر میں استاد لات مارتا اور وہ لڑک کر دوسری جانب چلا جاتا دوسری جانب سے پھر اسے لات پڑتی اور وہ لڑھکتا ہوا دوبارہ استاد کی لاتوں کی زد میں آ جاتا۔ میں نے دیکھا کہ پہلے یہ چھوٹا ان بڑوں کے اس کھیل کا مزا کرکرا نہ ہونے کے خیال سے اپنے تکلیف سے کھنچے ہوئے چہرے پر ایک نہایت دردناک مسکراہٹ بکھیرتا رہا۔ تاہم کھیل اس کے باوجود جاری رہا' نہ تماشائی بدمزا ہوا' نہ زمیں پھٹی' نہ آسماں گرا' صرف ایک آنکھ میں آنسو تھے اور یہ اس چھوٹے کی آنکھ میں تھے جسے اپنے سے بھی چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی دو وقت کی روٹی اس ''ٹارچر سیل'' میں کھینچ لائی تھی۔

اس بے رحم' سفاک' سنگدل اور بے حس معاشرے کو شاید دو سو بچوں کا قاتل ہی تھوڑا بہت چونکا سکتا تھا۔

میں اس وقت معاشرے کی اس سنگدلی کی نفسیاتی وجوہ کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن ہمیں سوچنا پڑے گا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ظالم ہی نہیں مظلوم بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ آخر کیا وجہ ہے؟

ایک معصوم سا پرندہ بھی
اپنی جاگیر میں شکاری ہے

غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرصہ سے موجود ظالمانہ نظام میں ظلم سہتے سہتے ہم سب ظالم ہو گئے ہیں۔ انتقام ہمارا موٹو بن چکا ہے۔ اور چونکہ یہ انتقام ہم اس کے ذمہ داروں سے نہیں لے سکتے' اس لئے ایک دوسرے سے لیتے رہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنے بچاؤ کی فکر میں ہے۔ اور اس کے لئے ہم دوسرے کو مٹانے کے درپے ہیں۔ ایک دوست ملے وہ نواز شریف کو ایک مصلح اور پاکستانی قوم کا نجات دہندہ قرار دیا کرتے تھے۔ مگر اب وہ ان کی حکومت کے خاتمے پر بہت خوش تھے۔ میں نے سوچا ان سے اس کی وجوہات پوچھنا چاہئیں۔

لیکن انہوں نے وجوہات کی بجائے اس کی صرف ایک وجہ بتائی اور وہ یہ کہ ایک ایم پی اے ان کی ٹرانسفر کرانے کے درپے تھا۔ نواز حکومت جانے سے ٹرانسفر رک گئی ہے۔

جب معاشرے کی سوچ اپنی ذات سے آگے نہ جائے وہاں سانحے ہوا ہی کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات! اس محفل میں ماہرین نفسیات اور دانشور حضرات جمع ہیں۔ وہ ہمارے ان رویوں کی بہتر طور پر تشریح اور وضاحت کر سکتے ہیں۔ میں اپنے طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ان رویوں کی وجہ ہمارا خوابوں سے ناطہ ٹوٹنا ہے۔ ہم نے ایک عرصے سے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے ہیں۔ اور یوں دن بدن ''حقیقت'' ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

کبھی ہمارا خواب کشمیر کو بزورِ شمشیر آزاد کرانا تھا مگر دانشوروں نے ہمیں سمجھایا کہ یہ غیر حقیقت پسندانہ خواب ہے۔ کبھی ہم ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے'' والا خواب دیکھا کرتے تھے لیکن یہ خواب بھی ہماری حقیقت پسندیوں نے چکنا چور کر دیا ہے۔ کبھی ہمیں یقین تھا کہ ہم پاکستان کو ایک فلاحی مملکت بنائیں گے۔ اور یہ عالم اسلام کا ایک ماڈل ہوگا۔

مگر ہمارے دانشوروں نے یہی بتایا کہ پاکستان تو ایک ناکام ریاست ہے اور یہ پیشین گوئیاں کیں کہ یہ چند برسوں سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ جناب والا! آج تک جتنی بھی سائنسی ترقی ہوئی ہے' اس کا پہلا مرحلہ خواب دیکھنا ہی تھا..... اگر کوئی خواب ترقی میں معاون نہ بھی ثابت ہو' تو بھی وہ انسان کی کوئی ناآسودہ خواہش ضرور پوری کرتا ہے۔ مجھے ایک دفعہ ڈاکٹر رشید چوہدری نے بتایا تھا کہ پاگل پن کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو خواب آنے بند ہو جاتے ہیں۔ میں آخر میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ صرف فرد نہیں جب کوئی معاشرہ بھی خواب دیکھنا بند کر دے تو وہ بھی پاگل ہو جاتا ہے۔

اور اپنے مستقبل سے مایوس کئے گئے ایک معاشرے میں سو بچوں کا قتل کوئی ایسی اہم بات نہیں کہ ہم اس پر مذاکرے کراتے پھریں.....!

◆◆◆

(فاؤنٹین ہاؤس لاہور کے زیر اہتمام سو بچوں کے قتل پر ہونے والے مذاکرے میں پڑھا گیا)

شیخ اور شیخانی!

آج کی ایک اہم خبر یہ ہے کہ سابق وزیر شیخ رشید احمد کی مبینہ بیوی شہناز شیخ آج (اتوار) گیارہ بجے دن لیاقت باغ سے کمیٹی چوک تک احتجاجی واک کریں گی۔ شہناز شیخ نے راولپنڈی اسلام آباد کے شہریوں سے اپیل کی ہے وہ اس واک میں بھرپور شرکت کریں۔ اس موقع پر انتظامیہ اور پولیس نے کسی قسم کی ممکنہ گڑبڑ کے خدشہ کے پیش نظر حفاظتی اقدامات مکمل کر لیے ہیں۔

میرے اس کالم کی اشاعت تک ظاہر ہے یہ ریلی منعقد ہو چکی ہوگی۔

میرے خیال میں طیارہ کیس کے بعد یہ دوسرا اہم مقدمہ ہے جو مسلم لیگ کے کسی لیڈر کے خلاف دائر کیا گیا ہے۔ شہناز شیخ کا کہنا ہے کہ شیخ رشید ان کے شوہر ہیں جب کہ شیخ رشید کا کہنا ہے کہ شہناز شیخ ان کی بیوی نہیں ہیں۔ پنجاب کے وزیر قانون اور ممتاز قانون دان ڈاکٹر رانجھا خالد نے طیارہ کیس والا مقدمہ دائر ہوتے ہی ٹی وی پر آ کر اعلان کیا تھا کہ اس کیس میں ''ملزم'' نواز شریف کو پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔ جب کسی رانجھے کی ہیر وزارت ٹھہرے تو پھر ایسی ''ماورا عدالت پیش گوئیاں'' ممکن ہو جاتی ہیں۔ شہناز شیخ نے اپنا مقدمہ غالباً عدالت میں پیش نہیں کیا۔ وہ اس کی بجائے عوامی عدالت میں گئی ہیں اور ان کے ''وکیل'' خالد رانجھا کی بجائے علامہ طاہر القادری ہیں جو شہناز کی پہلی پریس کانفرنس میں ان کے شانہ شبانہ بیٹھے تھے حالانکہ ان کی جگہ عاصمہ جہانگیر کو ہونا چاہیے تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں مظلوم خواتین کو عاصمہ جہانگیر کا متبادل علامہ طاہر القادری کی صورت میں مل گیا ہے۔ یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لئے! اتحاد سے میری مراد شہناز شیخ اور علامہ طاہر القادی کا اتحاد ہے۔ یہ نیا زمانہ مردانہ اتحاد شاید اس لئے وجود میں آیا کہ علامہ طاہر القادی اپنے سیاسی اتحادیوں سے مایوس ہیں اور ان کے سیاسی اتحادی ان سے نالاں نظر آتے ہیں! ویسے آپس کی بات ہے کہ مجھے شیخ رشید اور شہناز شیخ یعنی ''شیخ اور شیخانی'' کا یہ جھگڑا کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آیا۔

شہناز کہتی ہیں کہ شیخ رشید میرے شوہر ہیں' اس کے جواب میں شیخ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ ہاں میں نے شادی کی تھی مگر طلاق دے دی تھی کہ شرعی طور پر زبانی طلاق بھی' طلاق ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح شہناز شیخ کو بھی یہ منوانے کی کیا ضرورت ہے کہ شیخ صاحب ان کے شوہر ہیں اگر شادی ہوئی بھی تھی اور طلاق بھی نہیں ہوئی تب بھی علیحدگی تو بہرحال ہو چکی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مسئلہ صرف نان نفقہ کا رہ جاتا ہے اور شیخ صاحب ماشاء اللہ خوشحال شخص ہیں' ان کے لئے اپنی ''سابقہ بیوی'' کو ہر ماہ کچھ رقم دینا کچھ ایسا

مشکل مسئلہ نہیں کہ اسے خواہ مخواہ سکینڈل کی شکل دی جائے۔ چنانچہ ان ''ٹھوس دلائل'' کی بنیاد پر میرے ایک وہمی دوست کا خیال ہے کہ یہ سراسر نورا کشتی ہے جو شہناز شیخ اور شیخ رشید احمد کی رضامندی سے جاری ہے۔ شیخ رشید دراصل عوام کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے بارے میں افواہوں پر کان نہ دھرا کریں' وہ شادی بھی کرلیا کرتے ہیں!

بہرحال اس کالم کی اشاعت تک اسلام آباد میں شیخ رشید کے خلاف شہناز شیخ کی واک ختم ہوچکی ہوگی۔ ممکن ہے اس میں اسلام آباد اور راولپنڈی کے ہزاروں شہری شریک ہوئے ہوں یا ہوسکتا ہے کہ اس میں صرف شہناز شیخ اور علامہ طاہر القادری ہی ہوں' دونوں صورتوں میں یہ بات طے ہے کہ کہ شیخ رشید خوش قسمت انسان ہیں' بے نظیر کے زمانے میں انہیں کلاشنکوف جو مرحوم جنرل ضیاء الحق کے زمانے سے ہر شریف آدمی کے پاس ہوتی تھی کے جرم مین کئی برس جیل میں گزارنا پڑے اور عوام اس بے وہودہ الزام پر ہنستے رہے' اب شہناز شیخ ان پر شادی کا ''الزام'' لگا رہی ہیں اور عوام اس الزام پر بھی ہنستے ہیں کہ وہ جانتے ہیں ہمارے شیخ صاحب ایسے نہیں ہیں۔

خیر' یہ معاملہ دو شیخوں کے درمیان ہے اور خاصا ذاتی قسم کا معاملہ ہے۔

دوسرا اہم کیس طیارہ کیس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ طیارہ کیس اور شہناز شیخ کیس دونوں کو عوامی نہیں بنانا چاہیے تھا۔ یہ دونوں کیس آپس میں بیٹھ کر طے کرنے کے ہیں۔ بقول شاعر

مسئلہ دونوں کا ہے طے بھی کریں گے دونوں
شہر کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟

◆◆◆

THE ULTIMATE CRIME

جس طرح پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ ورلڈ بنک کا مقروض ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ پیدا ہوتے ہی انڈیا کا بھی مقروض ہوتا ہے۔ اسے انڈیا کا وہ قرض چکانا ہے جو 16 دسمبر 1971ء سے اس کے ذمے ہے۔ یہ وہ قرض ہے جب ''ٹائیگر'' جنرل نیازی نے لاکھوں کے مجمع میں بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے اور ہمارے 93 ہزار فوجی بھارت کے قیدی بن گئے تھے۔

بھارت کو پاکستان کے ساتھ جو کرنا تھا وہ اس نے کیا کہ پاکستان کا وجود اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی دل سے مانا۔ لیکن ہمارے اپنوں نے جو ہمارے ساتھ کی' اس بے وفائی کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ شیخ مجیب' بھٹو' جنرل یحییٰ' جنرل نیازی اور جی ایچ کیو میں بیٹھے ان کے دوسرے ہمنوا! شیخ مجیب کو اس کے کئے کا بدلہ مل گیا۔ بھٹو کو جن حالات میں پھانسی دی گئی' اب ان کے بارے میں کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ جنرل نیازی ابھی تک زندہ ہے اور پگ باندھ کر پھرتا ہے۔ یحییٰ طبعی موت مرا۔ کیا اسے طبعی موت مرنا چاہیے تھا؟ مجھے اس کے طبعی موت مرنے سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ اسے پوری فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا۔

میں نے ان دنوں پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس چوہدری سردار محمد کی کتاب THE ULTIMATE CRIME پڑھی ہے۔ اس دور کی سیاسی قیادت کے ساتھ جنرل یحییٰ خان کا جو انداز فکر تھا اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے (ترجمے کی ذمہ داری میری ہے) ''میں ان چند لوگوں میں سے تھا جو جنرل یحییٰ کو راولپنڈی ائر پورٹ پر الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ جہاں سے انہوں نے الیکشن کے بعد پہلی مرتبہ براستہ کراچی مشرقی پاکستان جانا تھا۔ ڈھاکہ جانے سے پہلے جنرل یحییٰ کراچی میں سردار یوسف چانڈیو کے ہاں مہمان تھے۔ یہاں وہ ایک جھیل کے کنارے شکار کرنے گئے۔ سردار چانڈیو مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر ممبر اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔ صدر کے ہمراہ سکیورٹی گارڈ کے فرائض انجام دینے کے لئے میرے سٹاف سے ڈی ایس پی مرزا انور بیگ موجود تھے۔ انہوں نے صدر اور چانڈیو کی یہ گفتگو سنی۔

یوسف: سائیں اب کیا ہوگا.....؟ الیکشن نے ایک طرف سور (مجیب) کو لا کھڑا کیا ہے اور دوسری طرف شکاری کتے (بھٹو) کو.....!''

یحییٰ: بچو فکر نہ کرو' بس تماشا دیکھو' میں ایسا جال بچھاؤں گا کہ یا تو سور کتے کو ختم کر دے گا یا شکاری کتا سور کو..... اور یہ شیر (یحییٰ)

دونوں کو ختم کرے گا.....!

اس کتاب سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''ہر کوئی ملک کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھا' سوائے جنرل یحییٰ خان اور ان کے جرنیلوں کے ٹولے کے ..... کیوں کہ حالات کی بگڑی ہوئی صورت حال ان کے مارشل لاء کے جواز فراہم کرتی تھی۔ ایوان صدر میں ایک جنرل نے کہا'' بنگالی تمام حدود پھلانگ چکے اب قابو میں آئے ہیں'' اس نے جنرل یحییٰ خان کی ''بہترین حکمت عملی'' کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ''اسلام کی عمدہ خدمت'' انجام دے رہے ہیں۔

اور ان دنوں اسلام کی جو خدمت یحییٰ خان انجام دے رہے تھے۔ چوہدری سردار محمد کی کتاب میں اس کی بھی کئی مثالیں درج ہیں۔'' وہ اتنی نازیبا ہیں کہ کوئی اردو اخبار ان کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ یہ گھروں میں چھوٹے بڑے سب پڑھتے ہیں۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ'' بلیک بیوٹی'' جو ایک گریڈ 22 کے افسر مسٹر حسین کی بیوی تھی' جرنیل صاحب کو پسند آ گئی۔ اور وہ تین دن اور تین راتیں اس کے گھر قیام پذیر رہے۔ اور اس کے دوران گمشدگی کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ تین دن کے بعد صدر جنرل یحییٰ نے انہیں ایوان صدر ہی میں بطور ماہر زیبائش ملازمت دے دی اور ان کے شوہر کو سفیر بنا کر سوئٹزرلینڈ بھیج دیا۔ موصوف اکثر رات اس بلیک بیوٹی کے ساتھ لمبی چوڑی ڈرائیو پر نکلتے تھے اور سیکورٹی کے عملہ کے سامنے کھلی کار میں کھڑے ہو کر بعض نازیبا حرکات فرماتے تھے کہ جس کا مسلح گارڈز کو شدید دکھ تھا۔ کتاب کے مصنف نے اپنے باس ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم کو اس صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ چیز صدر کے سیکورٹی کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ اس پر ڈی آئی جی نے جواب میں کہا کہ صدر مملکت کے سر پر بہت بھاری ذمہ داریاں ہیں۔'' آخر وہ بھی انسان ہیں' انہیں بھی ریلیکسیشن کی ضرورت ہے۔''

اور اب آخر میں صدیق سالک کی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں سے ایک اقتباس:

''جنرل نیازی اور جنرل اروڑا وہاں سے سیدھے رمنا گراؤنڈ گئے۔ جہاں سرعام جنرل نیازی سے ہتھیار ڈلوانے کی تقریب منعقد ہونا تھی۔ جس کا نظارہ کرنے کے لئے لاکھوں بنگالی جمع تھے' یوں لگتا تھا کہ جنرل نیازی کی تذلیل کا منظر دیکھنے کے لئے سارا شہر امڈ آیا تھا۔ ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوط مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ریوالور نکال کر اروڑا کو پیش کر دیا۔ اس موقع پر جنرل اروڑا نے پاکستانی سپاہیوں کی گارڈ آف آنر کا معائنہ کیا جو اس بات کی علامت تھا کہ اب وہی ''گارڈ'' ہیں اور وہی آنر کے مستحق۔

باخدا.....! یہ 16 دسمبر کا دن ہر سال کیوں آ جاتا ہے۔ میرے مولا پاکستانی قوم کو اس دن کی نحوست ختم کرنے اور اپنی توہین کا بدلہ لینے کی طاقت عطا فرما!..... اور اے رب ذوالجلال اس مبارک ساعت کے آنے تک اس توہین کے ذمہ داروں میں سے جو ابھی تک زندہ ہیں، انہیں ہماری نظروں سے دور کر دے کہ ہماری آنکھوں کے لئے تو اور بھی بہت دکھ ہیں!

◆◆◆

مگر تاریخ مختلف ہوتی.....!

آج 16 دسمبر ہے۔ یہ دن ہم پاکستانیوں کے لئے دیوار گریہ بھی ہے۔ اور یوم عزم کی حیثیت بھی رکھتا ہے 16 دسمبر اپنے خونی گناہوں کی معافی مانگنے کا دن بھی ہے اور اس عہد کی تجدید کا بھی اس روز پوری ملت اسلامیہ کے منہ پر جو کالک ملی گئی تھی۔ ہم نے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ ہمارے چہروں سے صدیوں تک جو روشنی پھوٹتی رہی دنیا کو اس روشنی کے تسلسل کی ضرورت ہے۔ اس روز ہماری ایک آنکھ میں آنسو اور ایک میں خوبصورت دنیاؤں کا خواب ہونا چاہیے۔ ہمیں آنسوؤں اور خوابوں کے درمیان سے اپنے لئے راستہ نکالنا ہے۔

میں نے ان دنوں ایک دفعہ پھر سقوط مشرقی پاکستان کی دلدوز داستان پڑھی ہے۔ یہ داستان فوجیوں کی بھی لکھی ہوئی ہے اور سویلین مصنفوں کی بھی۔ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا کہ بنگالی بھائی ہم سے علیحدگی پر تلے ہوئے تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں صوبے کو ان کے حقوق دینے کی تحریک کا آغاز ہوا جو شیخ مجیب کے چھ نکات پر آ کر رک گیا۔ ان چھ نکات کو پوری بدنیتی سے خود حکومت نے ہوا دی۔ جنرل یحییٰ خان اور جی ایچ کیو میں بیٹھے ہوئے اس وقت کے بزرجمہروں نے اپنے فیصلوں سے ملک دو لخت ہونے کی طرف دھکیلا۔ ان کے جو افعال عام حالات میں ذاتی نوعیت کے سمجھے جا سکتے تھے۔ وہ قومی امور میں غفلت' کمزوری اور نالائقی دکھانے کے باعث بن گئے۔ جب جنرل نیازی نے 10 اپریل کو مشرقی پاکستان میں کمانڈ ایسٹرن کمان کے عہدے کا چارج سنبھالا اور جنرل خادم راجہ فوج کی کمان ان کے سپرد کر چکے تو بقول بریگیڈئر صدیق سالک انہوں نے جنرل راجہ سے پوچھا۔

''اپنی داشتاؤں کا چارج کب دو گے؟''

لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسائل سیاسی نوعیت کے تھے اور سیاسی طریق کار ہی سے حل ہونا تھے۔ جب کہ فوج کو فوجی تربیت دی جاتی ہے' سیاسی تربیت نہیں۔ اس کی بہترین صلاحیتیں حالت جنگ میں سامنے آتی ہیں۔ گمبھیر سیاسی مسائل کا حل ان کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے فوجیوں نے نہایت بہادری اور پامردی سے دنیا کی مشکل ترین جنگ لڑی۔ ہم 65ء کی جنگ کے ہیروز کو یاد کرتے ہیں۔ ہمیں 71ء کی جنگ کے شہیدوں اور غازیوں کی دلیری' جوان مردی اور جذبہ شہادت کو محض اس طرح فراموش نہیں کر دینا چاہیے کہ ہم جنگ ہار گئے تھے۔ دنیا کے ماہرین حرب کے مطابق ہماری

فوج کی جتنی نفری مشرقی پاکستان میں تھی فی مربع فٹ کے لحاظ سے اس سے سات گنا نفری کی ضرورت تھی۔ اور اگر مقامی آبادی کے معاندانہ رویے اور مشرقی پاکستان کے دریاؤں اور گھنے جنگلات کو بھی مدنظر رکھا جائے تو اس سے کہیں زیادہ نفری ملکی دفاع کے لئے درکار تھی۔ مگر ہماری فوج انتہائی کم مقدار' ناقص اور ناکافی ہتھیار' غلط فیصلوں اور غلط جنگی حکمت عملی کے باوجود جتنی دیر دشمن کے سامنے ٹھہر سکتی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ عرصہ تک وہ اس کے سامنے ڈٹی رہی۔ لہٰذا بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذمہ داری ہمارے جوانوں اور افسروں پر عائد نہیں ہوتی اس کے ذمہ دار وہ تھے جو خود کو عقل کل سمجھتے تھے۔

بریگیڈئر صدیق سالک کی کتاب میں سے یہ پہرا ملاحظہ ہو۔

..... ''ہاتھی کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے راولپنڈی سے پانچ ہزار افراد پر مشتمل پولیس اور کوئی دو درجن سی ایس پی افسر بھیجے گئے۔ یہ کمک بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ کیوں کہ ان کی تربیت ایک باقاعدہ انتظامی شعبے کو چلانے تک محدود تھی۔ جب کہ ضرورت لخت لخت جسم کو یکجا کر کے اس میں روح پھونکنے کی تھی۔ بے شک نوکر شاہی سے مسیحائی کی توقع عبث تھی یہ کام سیاستدانوں اور مدبروں کا تھا مگر افسوس کہ مارشل لاء کے خارزاروں میں ایسے پھول نہیں کھلا کرتے.....''

آخر کار وہ منحوس دن آن پہنچا۔ یحییٰ اینڈ کمپنی کے اپنے اقتدار بچانے کے لئے مصلحتوں اور مفاد کے تحت کئے گئے فیصلوں کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو گیا۔ اس جدائی کا غم اپنی جگہ لیکن یہ صدمہ نہیں بھولا جا سکتا کہ اس وقت نااہل اور بدقماش حکمرانوں نے دنیا کی بہترین فوج کو اپنے ازلی دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے دوچار کیا۔ حالات آخری چارہ کار کے طور پر علیحدگی کے عمل کا آبرومندانہ طریقہ بھی سامنے آیا تھا جسے رد کر دیا گیا۔

ہمارے 93 ہزار فوجی بھارت کے جنگی قیدی بن گئے۔ میں آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان لکھی ہوئی اس داستان کا اختتام اس گفتگو پر کرتا ہوں۔ جو بھارتی قید کے دوران جنرل نیازی اور بریگیڈئر صدیق سالک کے درمیان ہوئی.....

سوال: کیا آپ نے جنرل یحییٰ یا جنرل حمید کو کبھی صاف صاف بتایا کہ آپ کو جو وسائل دیئے گئے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے ناکافی ہیں؟

جواب: کیا وہ سویلین ہیں؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اندرونی و بیرونی خطرات سے مشرقی پاکستان کو بچانے کے لئے تین انفنٹری ڈویژن ناکافی ہیں۔

سوال: مگر یہ الزام تو ہمیشہ آپ پر ہی رہے گا کہ آپ مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کر سکے۔ اگر کم وسائل کے پیش نظر آپ کے خیال

میں دفاعی قلعوں والی اسٹریٹجی بہترین حکمت عملی تھی تو کیا وجہ ہے کہ آپ نے ڈھاکہ کو دفاعی قلعہ نہ بنایا' جہاں فوج کی ایک کمپنی بھی نہ تھی؟

جواب: یہ سب راولپنڈی والوں کا قصور ہے۔ انہوں نے مجھے نومبر کے وسط میں آٹھ پلٹنیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا مگر صرف پانچ بھیجیں میں باقی تین کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو انہیں ڈھاکہ کے دفاع کے لئے استعمال کروں گا۔

سوال: لیکن 3 دسمبر کو جب آپ پر واضح ہو گیا کہ اب مزید نفری آنا ناممکن ہے تو آپ نے کیوں نہ اپنے وسائل میں سے کچھ جمعیت ڈھاکے کے لئے مخصوص کر لی؟

جواب: دراصل اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کسی محاذ سے ایک کمپنی نکالنا بھی مشکل تھا۔

سوال: جو تھوڑے بہت وسائل آپ کے پاس ڈھاکہ میں موجود تھے اگر آپ ان کو بھی صحیح طور پر استعمال کرتے تو جنگ کچھ دن جاری رہ سکتی تھی؟

جواب: مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ گلیوں میں لاشوں کے انبار لگ جاتے' نالیاں اٹ جاتیں' شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی' لاشوں کے گلنے سڑنے سے طاعون اور دوسری بیماریاں پھوٹ پڑتیں۔ اس کے باوجود انجام وہی ہوتا۔ میں 90 ہزار بیواؤں اور لاکھوں یتیموں کا سامنا کرنے کے بجائے 90 ہزار قیدی واپس لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سوال: اگرچہ انجام وہی ہوتا مگر تاریخ مختلف ہوتی.....!

جنرل نیازی یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

◆◆◆

فرمانبردار!

آج اپنی نئی کتاب کے لئے مواد کی تلاش کے دوران میرا ایک پرانا کالم برآمد ہوا جو آج سے چھ سال قبل یعنی 18 نومبر 1993ء کو ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا تھا۔ آج میں ''بڈحرامی'' کے موڈ میں ہوں' چنانچہ قارئین اس ''آؤٹ آف ڈیٹ'' کالم پر ہی گزارا کریں۔ یہ کالم ایک لفظ کی کمی بیشی اور کسی تبصرے کے بغیر من وعن یہاں درج کیا جا رہا ہے' چھ سال پرانا یہ کالم ملاحظہ فرمائیں اور مجھے یہ بتائیں کہ کیا یہ کالم واقعی پرانا ہے؟

خدا جانے وہ کون سا ملکی یا غیر ملکی ہے جسے پاکستان میں مقبول سیاسی قیادت کا وجود ایک عرصے سے کھلتا چلا آ رہا ہے چنانچہ اس کی یہ کوشش ہو رہی ہے کہ پاکستان میں امور حکومت غیر نمائندہ افراد چلاتے رہیں' اس کا ایک ثبوت پے در پے مارشل لاء کا نفاذ ہے اور ان سیاسی جماعتوں کو کچلنے کا رویہ ہے جن کی جڑیں عوام میں مضبوط ہوتی ہیں یا مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرحوم ضیاء الحق کے زمانے میں پیپلز پارٹی کو کچلنے کے لئے تمام حربوں کے استعمال کے علاوہ ایک حربہ لسانی جماعتوں کو شہ دینے کی صورت میں بھی آزمایا گیا۔ چنانچہ جئے سندھ اور ایم کیو ایم کے پودوں کو پانی دے کر تناور درخت بنانے کی کوشش کی گئی۔ جب ان حربوں کے باوجود پیپلز پارٹی کا وجود قائم رہا تو اس قومی جماعت کے مقابلے میں ڈمی پیپلز پارٹی کی بنیادیں رکھی گئیں۔ جس کے لئے غلام مصطفیٰ جتوئی' غلام مصطفیٰ کھر وغیرہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک عرصے تک منصوبہ ساز یہ کوشش کرتے رہے کہ پارٹی کی قیادت مقبول ہاتھوں سے نکل کر غیر مقبول ہاتھوں میں چلی جائے لیکن پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ تاہم اس منصوبے کو 1993ء کے انتخابات میں بڑی خوبصورتی سے روبہ عمل لایا گیا اور اب صورتحال منصوبہ سازوں کی خواہشات کے عین مطابق ہے۔ اس وقت بظاہر پیپلز پارٹی کی حکومت ہے' قیادت بھی مقبول ہاتھوں میں ہے لیکن درحقیقت حکومت اور قیادت دونوں ڈمی ہیں' اصل حکومت اقلیتی جماعتوں کی ہے۔ صدر ان کی مرضی سے بنا ہے' وزیراعظم ان کی مرضی سے بنا ہے' وزارتیں ان کی مرضی سے تشکیل پا رہی ہیں' گورنر ان کی مرضی سے آئیں گے۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ اقلیتی پارٹی کے ہیں اور پیپلز پارٹی کے جیالے اور جیالیاں سڑکوں پر بھنگڑے ڈال رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی اقتدار میں آ گئی۔ جو کام مرحوم ضیاء الحق پورے گیارہ سال کے عرصے میں تمام تر جبر و تشدد کے باوجود انجام نہیں دے سکتے تھے' وہ کام منصوبہ سازوں نے آج پوری مہارت سے کر دکھایا ہے' قیادت میں تبدیلی بھی نہیں کی گئی اور ایک تابعدار پیپلز پارٹی وجود

میں آ گئی۔ پارٹی کا زہر نکال کر اسے گنڈویا بنا دیا گیا اور اب گنڈویا (کیچوا) شکاریوں کے کام آئے گا۔

اس سے پہلے 1988ء میں پیپلز پارٹی کو اس حسن ظن کے ساتھ برسر اقتدار لایا گیا کہ شاید پارٹی ''بھلے مانس'' بن چکی ہے لیکن جب یہ اندازے غلط ثابت ہوئے اور پارٹی نے اپنی ''خودی'' کا مظاہرہ کرنا چاہا تو اسے اس کی ''اوقات'' یاد دلا دی گئی۔ اس وقت میاں نواز شریف کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ ایک امیر زادہ ہے' اقتدار کا شوقین ہے' سیاست سے واجبی سا تعلق ہے چنانچہ اس کی صورت میں ایک فرمانبردار قسم کا حکمران مل سکتا ہے لیکن وزیر اعظم بنتے ہی اس ''امیر زادے'' نے بھی جب پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے اور عوام میں ان کی مقبولیت کا گراف بہت اونچا چلا گیا تو منصوبہ سازوں نے انہیں بھی ان کی ''اوقات'' یاد دلا دی مگر نواز شریف کو اقتدار سے بھونڈے طریقے سے الگ کر دیا گیا۔ انہیں گرانے کے لئے اور ان کی طاقت زائل کرنے کے لئے جو حربے اور ہتھکنڈے استعمال کئے گئے' منصوبہ ساز اس میں وہ سلیقہ برقرار نہ رکھ سکے جو ان کا خاصا ہے۔ جس کے نتیجے میں عوام پر حقیقت حال پوری وضاحت کے ساتھ آشکار ہو گئی اور وہ نواز شریف کے لئے میدان میں ڈٹ گئے۔ آج منصوبہ ساز ایک دفعہ پھر پریشان ہیں کیونکہ پیپلز پارٹی کو عملی طور پر عضو معطل بنانے کے بعد نواز شریف میں دوسری مقبول قیادت ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔ ان دنوں اس قیادت کو کارنر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لئے وہ تمام حربے استعمال کئے جا رہے ہیں جو پیپلز پارٹی کی مقبول قیادت کو پیچھے دھکیلنے کے لئے استعمال کئے گئے تھے' کیونکہ منصوبہ سازوں کو پاکستان میں کسی بھی صورت مقبول قیادت کا وجود منظور نہیں اور آج کل ایک تابعدار مسلم لیگ تلاش کی جا رہی ہے جس کا صدر نواز شریف کے علاوہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کے لئے بھی حضرت معین قریشی کی خدمات امریکہ سے مستعار لے لی جائیں۔

جہاں معاملات اتنے بالائی سطح پر طے پا رہے ہوں' وہاں ظاہر ہے ہم ایسے کیڑوں مکوڑوں کی کون سنتا ہے۔ لیکن تمام حجت کے لئے یہ کہنے میں کیا حرج ہے کہ قومی جماعتوں اور قومی رہنماؤں کو ذلیل اور رسوا کرنا اور حکومت کی باگ ڈور غیر نمائندہ ہاتھوں میں دینے کا عمل نہ کبھی ماضی میں ''مثبت نتائج'' کا حامل رہا ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ایسا ہو گا۔

بے نظیر کو ''راہ راست'' پر لانے کے بعد ان دنوں نواز شریف کو ''پدھرا'' کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ کسی غیر معمولی دباؤ کا شکار نظر آتے ہیں۔ وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ بھی ان حالات کے اسی دباؤ کا نتیجہ تھا جو ان کے گرد جالے کی طرح بن دیئے گئے تھے اور اس کے بعد سے اب تک ان کے گرد دیواریں چننے کا عمل نہ صرف جاری ہے بلکہ لگتا ہے کہ تیز کر دیا گیا ہے۔ میاں نواز شریف صاحب یہ تاثر دینے میں مشغول ہیں کہ ان پر دباؤ نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ دباؤ موجود ہے اور وہ یہ دباؤ قبول کرتے چلے آ رہے ہیں'

خدانہ کرے کہ انہیں بالکل دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے کیونکہ اس کے بعد مزید پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ یہ صورتحال ملک وقوم کے لئے مفید نہیں ہوگی' اس لئے بہتر یہی ہے کہ میاں صاحب قوم کو اعتماد میں لیں۔ اسے صورتحال سے آگاہ کریں' جمہوری نظام کے استحکام کے لئے اسے تیار کریں اور خود بھی تیار ہوں۔ سیاست صرف اقتدار کی پھولوں بھری سیج کا نام نہیں' قربانیوں کے کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کا نام بھی ہے۔ ابھی صرف لوٹے وفاداریاں بدل رہے ہیں جبکہ عوام نواز شریف اور ان کی مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لیکن اگر عوام کو بروقت اعتماد میں نہ لیا گیا اور انہیں ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب نہ ملا تو نواز شریف ان خطرات کی زد میں بھی پوری طرح آ جائیں گے جو انہیں خاموشی کی راہ گزر پر چلا رہے ہیں اور خاموشی کے اس سفر میں عوام کا ساتھ بھی ان سے چھوٹ جائے گا۔ تابعدار پیپلز پارٹی کے بعد فرمانبردار مسلم لیگ کے قیام کی کوشش قومی سیاست میں ایک سانحے سے کم نہیں..... خدارا قوم کو اس سانحے سے بچالیں.....!

◆◆◆

ایک خطرناک رجحان

گذشتہ کچھ ہفتوں سے قارئین کے خطوط میں خاصا اضافہ ہوگیا ہے۔جس پر مجھے بہت تشویش ہے۔

اس تشویش کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے قارئین کے خطوط کی بڑی تعداد ان مسائل کے حوالے سے ہوتی تھی جو ہمارے ہاں برسہابرس سے رائج ظالمانہ نظام کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں۔ یا جو قدرے کھاتے پیتے لوگ تھے وہ کشمیر' افغانستان اور سی ٹی بی ٹی وغیرہ پر خط لکھا کرتے تھے۔ یہ سب مسائل اب بھی جوں کے توں ہیں۔ان میں سے کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوا۔لیکن اب عوام کی توجہ ان مسائل سے ہٹ کر نواز شریف مشرف چپقلش اور طیارہ کیس کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ کمیونسٹ مذہب کو افیم قرار دیتے تھے کہ اس کی ایک گولی سے عوام اپنے بنیادی مسائل بھول کر ''عقائد کی بھول بھلیوں'' میں گم ہوجاتے ہیں۔ اور اس دوران حکمران اپنا ایجنڈا پورا کر جاتے ہیں۔اب وہ مذہب کو الزام نہیں دے سکتے کہ اس دفعہ لوگ طیارہ کیس کی بھول بھلیاں میں گم ہوکر اپنے ذاتی وقومی مسائل بھولتے چلے جارہے ہیں اور حکمران کے ایجنڈے سے غافل ہوگئے ہیں۔

میری تشویش کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نوے فیصد خطوط میں فوج اور نواز شریف کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہوتا ہے۔ان نوے فیصد میں سے 85 فیصد مکتوب نگار اپنا نام نہیں لکھتے اور اگر نام لکھتے ہیں تو پتہ نہیں لکھتے اور یوں انکی حیثیت گمنام خطوط کی سی ہے۔ یہ صورتحال شدید خوف و ہراس کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ ابھی تک فوجی حکومت کا نزلہ صرف میاں نواز شریف' ان کے خاندان' وزیراعظم ہاؤس کے متوسلین اور دو تین جانباز قسم کے ایم پی ایز اور دس بارہ نادہندہ حضرات پر ہی گرا ہے۔تاحال لکھنے والے بھی آزادی (خوامحدود آزادی ہی سہی) سے لکھ رہے ہیں۔ مسلم لیگی قیادت بھی اپنی (محدود) سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن عوام الناس کا اس درجہ سہم جانا کسی آنے والی زمینی آفات کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ زمینی آفات کا پتہ سب سے پہلے حشرات الارض کو لگتا ہے۔

اس سارے معاملے میں تشویش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کبھی خدانخواستہ ملک پر کوئی بیرونی حملہ ہو تو اصل دفاع تو فوج کے علاوہ عوام ہی کو کرنا ہوتا ہے اور اگر ہم نے عوام کی رگوں میں خون منجمد کر دیا تو یہ ''عوامی فوج'' دفاع کے قابل نہیں رہے گی۔ جنرل پرویز مشرف کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو بولنے پر اکسائیں اور جو بول رہے ہیں۔ان پر مقدمات دائر کرنے کے بجائے انہیں ''ہلال

جرات'' عطا کریں کہ قوم کے لیے کبھی جان دینے کا وقت آیا تو یہی بہادر لوگ اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے۔ جبکہ ان کے مقابلے میں ہر آنے والے حاکم کے سامنے کورنش بجالانے والے بیرونی حملہ آوروں کو بھی خوش آمدید کہا کرتے ہیں۔ طوائف کے لئے کسی مذہب یا اس کی وطنیت اہم نہیں ہوتی۔ صرف اس کا گاہک ہونا اہم ہوتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے ضمیر کے مطابق موجودہ حکومت کے خلاف یا حق میں بولتے اور لکھتے ہیں وہ محب وطن ہیں۔ اور جو کسی لالچ' مفاد' مصلحت' دھڑے بندی یا خوف کے تحت اپنی رائے چھپاتے ہیں یا اپنی رائے میں تحریف کرتے ہیں وہ ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ ایجنسیوں کو چاہیے کہ وہ محب وطن افراد پر نظر رکھنے کی بجائے ضمیر کے ان مجرموں پر کڑی نظر رکھیں۔

قارئین کے خطوط کی بڑی تعداد جمہوری بساط کے لپیٹے جانے کے اقدام کے خلاف ہوتی ہے۔ اس پر تین طرح کے لوگ اظہار خیال کرتے ہیں۔ ایک وہ جو میاں نواز شریف کی حکومت کے بارے میں رائے رکھتے ہیں کہ ان کی حکومت ملک کی معروضی صورتحال میں ممکن حد تک ٹھیک ہی کام کر رہی تھی۔ اس کو جس طریقے سے گھر بھیجا گیا ہے اس سے قومی وقار اور قومی استحکام کو سخت دھچکا لگا ہے۔ قارئین کا ایک طبقہ وہ ہے جو میاں نواز شریف کی پالیسیوں کا مخالف تھا اور ہے۔ لیکن وہ ملکی سیاست میں فوجی مداخلت کے بھی خلاف ہے (اور یوں ان کے خطوط میں حالیہ تبدیلی پر کڑی تنقید ہوتی ہے۔ لیکن قارئین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے حوالے سے مجھے تشویش کا اظہار کرنا ہے۔ اس طبقے کے خطوط میں فوج کو اس کے سیاسی کردار کے حوالے سے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ تاہم یہ بدنیت نہیں جذباتی لوگ ہیں۔ جو عمل کے بعد ردعمل کا شکار ہوئے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس طرح کا ردعمل ہمارے ازلی دشمن انڈیا کی دیرینہ خواہش رہی ہے۔ چنانچہ اس ردعمل کے اظہار اور اس کے بتدریج پھیلاؤ سے ہم اپنے سوا کسی کو کمزور نہیں کر رہے۔ کچھ ''قارئین'' یہاں میں نے یہ لفظ دانستہ انورٹڈ کوماز میں لکھا ہے۔ کیونکہ جن ''قارئین'' کا میں اب ذکر کرنے والا ہوں یہ دراصل ''سپونسرڈ'' لوگ ہیں۔ یہ دشمن کے لیے یا نادانستہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی زہریلی تحریریں ایسی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا بھی میرے نزدیک ملکی مفاد میں نہیں ہے۔

میں قارئین کی آخری قسم کے خطوط میں جس رجحان کی ابھی نشاندہی کی ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سو یہ کام کسی ادارے کو کرنا چاہیے۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔ اگر ردعمل منفی ہے تو عمل پر نظر ثانی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پاکستان' جمہوریت اور پاک فوج' ہمیں تینوں عزیز ہیں۔ تینوں کی بقا ہمیں یکساں عزیز ہے۔ کسی ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

◆◆◆

آپ تو خیر سے مرد ہیں.....!

مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب فاروق عبداللہ نے سرینگر میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں کا دوسرے جنم کا عقیدہ صحیح ہے تو وہ اگلے جنم میں عورت بننا پسند کریں گے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ عورتیں جس طرح اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں' اس کے نتیجے میں لگتا ہے کہ آئندہ بچے بھی مردوں ہی کو جننا پڑیں گے۔ چنانچہ فاروق عبداللہ کے بقول وہ عورت بننے کو ترجیح دیں گے تاکہ ان تمام مراعات اور سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں جو آئندہ عورت کو ملنے والی ہیں۔

میرے خیال میں فاروق عبداللہ کی یہ خواہش بہت جینوین ہے۔ اور ممکن ہے بے شمار لوگوں کی بھی یہی خواہش ہو کہ فاروق عبداللہ آئندہ جنم میں بھی خود کو مرد کہلانا چھوڑ دیں' صرف یہی نہیں بلکہ انہیں عورت سمجھا جائے اور ان سے سلوک بھی عورتوں والا ہی کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عورتوں کو ان کے حقوق ملنے کے باعث یہ سلوک قدرے بہتر انداز میں ہوگا' جیسے کسی عام آدمی کو صاحب بہادر کہہ کر ذلیل کیا جائے۔

اس خطرے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ فاروق عبداللہ خاصے فیاض واقع ہوئے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس تقریب میں انہوں نے یہ تقریر کی' اس میں بے شمار لوگوں کو سرکاری خرچ پر مدعو کیا گیا تھا۔ اور یوں اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔ عورت بننے کے بعد بھی اگر ان کی شہرت یہی رہی کہ وہ بہت ''فیاض خاتون'' ہیں تو ان کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں' لہٰذا ان کے حق میں بہتر ہوگا کہ عورت بننے کے بعد وہ ''میانہ روی'' سے کام لیں۔

فاروق عبداللہ نے عورت بننے کی خواہش کا اظہار تو کیا ہے لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ کس قسم کی عورت بننا پسند کریں گے۔ کہ عورت کی ایک قسم تو وہ ہے جسے ہم ''خاتون خانہ'' کہتے ہیں۔ اور عورت کی دوسری قسم وہ جسے ''خاتون خانہ خراب'' کہا جاتا ہے۔ فاروق عبداللہ سیاست میں ایک عرصے سے جس طرح کرائے پر چلتے آ رہے ہیں۔ اور جس طرح ان کی حیثیت بھارتی حکومت کی سیاسی داشتہ کی سی رہی ہے۔ اس کے مطابق لگتا تو یہی ہے کہ جون بدلنے کے بعد وہ ''خانہ خراب'' ہی کو ترجیح دیں گے بقول شاعر:

اہلیہ آید بہ رکشہ
داشتہ آید بہ کار

موصوف ایک عرصے سے کار پر سوار ہیں۔ دوسرے جنم میں وہ سواری کے لئے رکشہ کہاں پسند کریں گے؟

محترم کو اس بات کا یقیناً علم ہوگا کہ ہندو عقیدے کے مطابق اگلا جنم پہلے جنم کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر انسان نے پہلے جنم میں نیک کام کئے ہوں تو اس کا دوسرا جنم کسی بہتر صورت میں ہوگا۔ اور اگر وہ پہلے جنم میں برا آدمی تھا تو دوسرے جنم میں وہ کسی حقیر اور قابل نفرت جانور وغیرہ کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ فاروق عبداللہ کے دامن پر لاکھوں کشمیری حریت پسندوں کا خون ہے۔ اور ان کی پشت پر غداری کی مہر چسپاں ہے۔ لہٰذا بادی النظر میں اگلے جنم میں ان کی عورت بننے کی خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اگر وہ اگلے جنم میں واقعی عورت بننا چاہتے ہیں تو اپنے سے پہلے جنم میں انہیں ''بندہ'' بن کر دکھانا ہوگا۔

بننا تو ''بندے کا پتر'' چاہیے تھا لیکن کچھ معاملات میں انسان بے بس و مجبور ہوتا ہے۔ کہ یہ خدائی کام ہیں' جسے جس گھر میں چاہے پیدا کر دے۔!

آخر میں فاروق عبداللہ سے ایک سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جناب والا! عورت تو اللہ تعالیٰ کی حسین ترین مخلوق ہے۔ جس کے وجود سے بقول اقبال ''تصویر کائنات میں رنگ'' ہے۔ آپ کی اس سے کیا دشمنی ہے کہ عورت بن کر اس کی ریپوٹیشن خراب کرنے پر تل گئے ہیں۔

اگر آپ محض اس خوف سے عورت بننے کی خواہش کر رہے ہیں کہ آئندہ زمانے میں کہیں مردوں کو بچے بھی نہ جننے پڑیں تو یہ خوف دل سے نکال دیں۔ آپ نے کشمیر کی طویل وزارت عالیہ کے دوران کون سا تخلیقی کام کیا ہے کہ آپ سے بچہ جننے جیسا عظیم تخلیقی کام لیا جائے؟ آپ سے یہ کام نہ ہوگا نہ آپ سے اس کام کی توقع کی جائے گی۔ اس تخلیقی کام کے لئے تو عورت کا دل گردہ چاہیے۔ اور آپ تو خیر سے مرد ہیں!

◆◆◆

آپ بکواس کرتے ہیں.....!

جنرل پرویز مشرف نے کہیں کہہ دیا کہ اسمبلیوں کی بحالی اور مسلم لیگ سے مذاکرات کی باتیں وغیرہ سب بکواس ہیں' ان کی یہ بات ٹھیک تھی کیونکہ جب ''بحالیات'' کا کوئی کام ہی نہیں ہو رہا تھا۔ تو پھر اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کا کیا فائدہ؟ لیکن سیاسی حلقے اس بیان میں سے ''بکواس'' کے لفظ پر چیں بہ جبیں ہیں اور دبے لفظوں میں تنقید کر رہے ہیں۔ حکماء کے نزدیک بھی آرمی چیف کے بیان پر دبے لفظوں میں تنقید ہی مریض کی صحت کے لئے کم خطرات کا باعث ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر لفظ ''بکواس'' پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیونکہ جنرل صاحب ادیب نہیں ہیں کہ لفظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں (لفظ بھی تو لفظ ہی ہیں' علامہ طاہر القادری تو نہیں ہیں) وہ فوجی ہیں اور حالت جنگ میں ان کی ٹریننگ ''بزن'' کی ہے۔ لہٰذا ان سے لفظوں کے استعمال وغیرہ کے ضمن میں الجھنا مناسب نہیں۔

میں تین روز قبل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی لٹریری تقریب میں بطور مہمان مدعو تھا۔ وہاں لٹریری سوسائٹی کے نگران اور بین الاقوامی شہرت کے حامل اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون نے اپنی تقریر میں ایک واقعہ سنایا۔ کہ ایک بار وہ اپنے ڈاکٹر دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیاحت کے لئے گئے۔ وہاں ان کے گائیڈ ایک خان صاحب تھے۔ جنہیں اردو اتنی ہی آتی تھی جتنی موجود حکومت کے بیشتر عہدیداروں کو آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے محض خان صاحب کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لئے کہا ..... ''خان صاحب' آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔''..... اس پر خان صاحب بہت خوش ہوئے اور انکسار سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ..... ''نہیں جناب! آپ یونہی بکواس کرتے ہیں''

ظاہر ہے خان صاحب کی نیت وہ نہیں تھی جو ان کے استعمال کردہ لفظ سے ظاہر ہوئی۔ لہٰذا ان کی بات کا کسی نے بھی برا نہیں مانا۔ اسی طرح مسلم لیگ والوں کو بھی جنرل صاحب کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ البتہ جنرل صاحب کو میرا یہ مشورہ ہے کہ چونکہ متذکرہ بیان سے یہ بات بہرحال واضح ہوگئی کہ ان کا جلدی جانے کا کوئی ارادہ نہیں' لہٰذا وہ اپنے عرصہ اقتدار کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اردو کا ''دورانیہ'' بھی اس کے مطابق طے کریں۔ اور اس کے لئے معین الدین حیدر کو ٹیوٹر رکھ لیں' ان کی اردو اور ان کا اردو ادب سے لگاؤ دونوں ان کے کام آسکتے ہیں۔ ویسے بھی ''ادب'' زندگی کا پہلا قرینہ ہے۔ آئی ایس پی آر میں بھی اردو ادب سے تعلق رکھنے والے کچھ

لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ بے نظیر بھٹو کے پاس ہوتے تو انہیں بھی بہت فائدہ ہوتا' وہ ان سے پوچھ سکتی تھیں کہ ''اذان بج رہا'' ہوتا ہے یا ''اذان ہو رہی'' ہوتی ہے۔ ویسے تو ایک لاہوریے سے کسی نے پوچھا تھا کہ ''بلبل مذکر ہے یا مونث؟'' اس نے کہا۔ ''مذکر مونث کو دفع کرو تم کسی عالم سے یہ پوچھ کر مجھ بتاؤ کہ بلبل حلال ہے یا حرام؟''

آخر میں مجھے برادرم اعجاز الحق سے ان کے فارمولے کی ناگہانی وفات حسرت آیات پر اظہار تعزیت کرنا ہے' اس موقع پر مجھے ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے'' والا گھسا پٹا شعر ہی یاد آ رہا ہے۔ امید ہے وہ قبول فرمائیں گے۔ اور آئندہ خاندانوں کے بزرگوں سے مشورے کے بغیر فوج اور سیاست کے رشتے کی بات شروع نہیں کریں گے کہ بعد میں خواہ مخواہ ندامت ہوتی ہے!

ویسے چلتے چلتے ایک سنجیدہ بات! اور وہ یہ کہ فریقین کو غصہ تھوک کر اور کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنائے بغیر ملک کو دوبارہ جمہوریت کی پٹڑی پر چلانے کے لئے لازمی اور فوری طور پر مذاکرات کی طرف پیش قدمی کرنا چاہیے۔ اگر اس میں دیر ہوئی تو وقت اپنا فیصلہ سنانے میں بہرحال دیر نہیں کرے گا! وقت گزرنے کے بعد اگر کوئی مورخ اس دیر کی توجیہ' توضیح یا عذر بیان کرنے کی کوشش کرے گا تو وقت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے گا۔ ''جناب! آپ بکواس کرتے ہیں۔'' ہم اس بے ہودہ وقت کا انتظار کیوں کریں؟

◆◆◆

داتا دربار سے امریکہ تک!

امریکہ میں بیس برس سے مقیم ایک پاکستانی فیملی' جو ہماری ''فیملی فرینڈ'' ہے' گذشتہ دنوں لاہور میں ہماری مہمان تھی۔ ڈاکٹر آفاق احمد اور ان کی بیگم ڈاکٹر غزالہ آفاق امریکہ میں پریکٹس کرتے ہیں' ان کی تیرہ سالہ بیٹی سمیہ پاکستان میں پیدا ہوئی اور دو سال کی عمر میں امریکہ چلی گئی۔ اس فیملی کا تعلق اٹک (سابقہ کیمبل پور) سے ہے۔ ڈاکٹر غزالہ آفاق کے والد فیض محمد مشرقی پاکستان میں نوائے وقت کے نمائندے ہوتے تھے' ان کے بیٹے قاضی خالد محمود تا حال اٹک ہی میں مقیم ہیں!

ڈاکٹر غزالہ گیارہ سال بعد اور انکی تیرہ سالہ بچی سمیہ پہلی دفعہ پاکستان آئے تھے۔ لاہور کے سفر میں قاضی خالد محمود بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سمیہ کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا گیا ہے اور وہ اتنی کم عمر میں امریکی اخبارات میں اسلام اور مسلمانوں کے حق میں خط لکھتی رہتی ہے۔ اسے پاکستان لانے کا مقصد بھی عزیز و اقرباء سے ملاقات کے علاوہ اسے یہ بتانا بھی تھا کہ اب اگرچہ وہ ''امریکی'' ہے لیکن اس کی جڑیں پاکستان ہی میں ہیں چنانچہ اسے ٹیکسلا اور لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر بھی کرائی گئی۔

میں اس فیملی کو داتا دربار بھی لے گیا وہاں زائرین کی ایک بہت بڑی تعداد دیکھ کر سمیہ بہت حیران ہوئی' اس نے مجھے سے پوچھا ''انکل یہ داتا صاحب کون تھے؟ میں نے کہا ''بیٹی' وہ بہت بڑے ولی اللہ تھے'' سمیہ نے پوچھا ''انکل یہ ولی اللہ کیا ہوتا ہے؟'' میں سوچ میں پڑ گیا' بال آخر میں نے کہا ''سمیہ بیٹی' ولی اللہ سینٹ کو کہتے ہیں۔''

''اچھا اچھا'' اسے میری بات کچھ سمجھ میں آئی ''مگر یہ اتنے سارے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ برصغیر کے لوگ ہندو مذہب کو ماننے والے تھے۔ حضرت داتا گنج بخش اور بعض دوسرے بزرگ یہاں تبلیغ کے لئے آئے' جن کی کوششوں کے نتیجے میں آج پاکستان اور بھارت میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں' چنانچہ ہم سب یہاں ان کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس موقع پر سمیہ نے ایک دلچسپ سوال پوچھا ''انکل اتنی پاپولیریٹی کی وجہ سے یہ بزرگ تو الیکشن میں بھی کھڑے ہوئے ہوں گے۔''

اس دلچسپ سوال کا جواب سمیہ کے ماموں قاضی خالد نے اسے دیا اور کہا ''بیٹی ایک تو اس زمانے میں الیکشن نہیں ہوتے تھے' دوسرے اسلام میں کسی عہدے کے لئے امیدوار بننے کی اجازت نہیں ہے۔ تیسرے' اسلام میں کلرجی ازم بھی نہیں ہے' یہی وجہ کہ نبی کریم کے زمانے میں اصحاب صفہ' جو قرآن اور حدیث کے جید عالم تھے' کی موجودگی میں خلفائے راشدین کا انتخاب ان لوگوں سے

کیا گیا' جن کا شمار مدبروں میں ہوتا تھا۔''

سمیہ کو یہ بات شاید پوری طرح سمجھ نہیں آئی' جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہوا۔

ہم اس دوران داتا دربار سے ملحقہ گلی میں سے گذر رہے تھے' جہاں باورچیوں کی قطار اندر قطار دکانیں اور تیار دیگیں نظر آتی ہیں۔ یہاں پھولوں' دستاروں' پھل مکھانوں اور ٹوپیوں وغیرہ کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ اسی اثناء میں ایک ملنگنی نے آگے بڑھ کر سمیہ کے گلے میں ہار ڈالا' جس پر سمیہ بہت خوش ہوئی اور اس نے اپنی والدہ سے پوچھا ''اس عورت نے میرے گلے میں یہ ہار کیوں ڈالا؟''

ڈاکٹر غزالہ نے کہا ''وہ تمہیں یہاں ویلکم کہہ رہی ہے۔''

اس پر سمیہ نے فرط مسرت سے دو تین دفعہ اسے ''تھینک یو تھینک یو'' کہا اس ملنگنی نے جواب میں اپنے ہاتھ آگے پھیلا دیئے۔

یہاں لولے' لنگڑے' صحت مند' ہر طرح کے فقیر ایک ہجوم کی صورت میں موجود تھے۔ سمیہ ایک دفعہ پھر حیران ہو رہی تھی کہ یہ لوگوں سے کیوں مانگ رہے ہیں' اپنا حق حکومت سے کیوں نہیں مانگتے۔

میں نے عذر لنگ پیش کیا ''بیٹی یہ پروفیشنل فقیر ہیں' ہوم لیس لوگوں کے لئے لاہور میں کچھ گھر بنائے گئے۔ انہیں وہاں لے جایا جاتا ہے مگر یہ وہاں سے بھاگ آتے ہیں' یہاں انہیں تین وقت کی روٹی مفت مل جاتی ہے اور کیش بھی کافی ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں بھی تو اس طرح کے ہوم لیس لوگ موجود ہیں۔''

یہ مثال سمیہ کی سمجھ میں شاید آ گئی ہو' میری اپنی سمجھ میں نہیں آئی!

فاتحہ خوانی سے فراغت اور گداگروں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد ہم واپس جانے کے لئے مڑے تو ڈاکٹر غزالہ آفاق داتا دربار کی اس نئی عمارت اور اس بدلے ہوئے گردوپیش کو دیکھتے ہوئے ٹھٹک کر رہ گئیں ''ہم تو کار سے نکل کر سیدھا گلی میں چلے گئے' میرا دھیان تو اس تبدیلی کی طرف جا ہی نہ سکا۔ یہ تو سارا علاقہ ہی بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟''

میں نے جواب دیا ''صاحب مزار کی برکت سے ہوا۔ ابھی پچھلے سال ہی یہ منصوبہ مکمل ہوا ہے۔''

کار کی طرف جاتے ہوئے سمیہ بیٹی کا دوپٹہ اس کے سر سے قدرے ڈھلک گیا قریب سے گذرتے ہوئے آدھی دھوتی میں ملبوس ایک باریش بزرگ نے اس بچی کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا ''اگر دربار میں آئی ہو تو سر بھی ڈھانپ کر رکھو۔''

سمیہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی!

دن میں شالیمار باغ' شاہی قلعہ اور شاہی مسجد دیکھنے کے بعد شام کو اس فیملی کو شاپنگ کے لئے جانا تھا' لاہور کی کشادہ اور روشنیوں سے جگمگ جگمگ کرتی سڑکوں پر سے گذرتے ہوئے سمیہ بیٹی نے کہا'' مجھے تو پتہ ہی نہ تھا کہ لاہور اتنا خوبصورت ہے۔ یہ تو بالکل امریکہ کی طرح ہے۔ ہم اٹک سے لاہور موٹر وے پر آئے ہیں THAT WAS ALSO VERY IMPRESSIVE خود ڈاکٹر غزالہ آفاق بھی حیران ہو رہی تھیں کہ جب انہوں نے پاکستان کو خیر باد کہا تھا اس وقت لاہور کی شکل و صورت یہ نہ تھی' ان کی حیرت میری اہلیہ نے دور کی'' صرف لاہور نہیں' راولپنڈی' گوجرانوالہ' کراچی اور جو دو ایک دوسرے شہر میں نے دیکھے ہیں' وہاں بھی بہت ترقیاتی کام ہوا ہے' ابھی یہ کام جاری تھا کہ حکومت چلی گئی۔''

'' کیوں' ایسا کیوں ہوا؟'' سمیہ نے بے تابی سے پوچھا؟

'' بیٹے اس کی بہت سی وجوہات ہیں'' میں نے کہا'' کچھ لوگوں کو سابقہ حکومت سے بہت سی شکایات تھیں۔''

تو پھر لوگ' حکومت کو بدلتے' آخر.....''

مگر اس کی امی نے اسے ٹوک دیا'' بیٹے بہت لمبی بات ہے اور ہم یہاں سیر کرنے آئے ہیں!''

یہ فیملی جو اپنے عزیز و اقارب سے ملنے اور امریکہ میں پرورش پانے والی اپنی بچی کو اس کے آبائی وطن پاکستان اور اس کے کلچرل روٹس سے متعارف کرانے پاکستان آئی تھی' غالباً امریکہ واپس چلی گئی ہے کیونکہ مجھے سمیہ بیٹی کے شکریے کا خط موصول ہوا ہے اور ساتھ اس کی ایک انگریزی نظم بھی جو اس کے آبائی وطن پاکستان کے حوالے سے اس کے خوبصورت جذبات کی عکاسی ہے' نظم درج ذیل ہے:

In my dreams I Walk among
The beauty of those still young
Their happy faces
Take me to a thousand places
How I wish they could see
The joy that comes with being free
But cry and can not speak
Everything just seems to bleak
They can see yet thy are blind
They searh and can not find
They look and look and they explore
But they do not know what they are looking for.

◆◆◆

شرطیہ علاج

معاشیات کے ماہرین کی رائے کے مطابق اس وقت پاکستانی عوام غربت' افلاس' بے روزگاری' مہنگائی اور ان کی وجہ سے رشوت ستانی' تھانے کچہریوں کے مظالم' سرخ فیتہ اور جن دوسری ناانصافیوں کا شکار ہیں' ان کا فوری ازالہ نہ ماضی کی کسی حکومت کے بس میں تھا اور نہ آج ممکن ہے۔ یہ ایک لمبا راستہ ہے جو ٹیکس کی وصولی' سرمایہ کاری' صنعتیں لگنے اور کرپشن کے خاتمہ ہی سے طے ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کاری کیوں نہیں ہو رہی' صنعتیں کیوں نہیں لگ رہیں؟ ٹیکس کیوں وصول نہیں ہو رہا؟ کرپشن کا خاتمہ کیوں نہیں ہوتا؟ اس سوال کے بھی کئی گھڑے گھڑائے جواب مل جاتے ہیں۔ میں ماہر معاشیات نہیں ہوں تاہم میرے پاس کچھ تجاویز ہیں جن پر عمل کرنے سے عوام کے تمام مصائب صرف ایک سال کے اندر ختم ہو جائیں گے اور اس ایک سال ہی میں ارباب اختیار اور ماہرین ایسے رستے نکالیں گے کہ فوری طور پر سرمایہ کاری بھی ہو گی' صنعتیں بھی لگیں گی' ٹیکس بھی وصول ہو گا اور کرپشن کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ بس شرط یہ ہے کہ میری تجاویز پر من وعن عمل ہو اور اس ضمن میں کسی کو ڈنڈی نہ مارنے دی جائے۔ تجاویز درج ذیل ہیں۔

1 ..... صرف ایک سال کے لئے گریڈ 17 سے گریڈ 22 تک کے تمام سویلین اور نان افسروں سے کاریں واپس لے لی جائیں' اس دوران انہیں ذاتی کار استعمال کرنے کی اجازت بھی نہ دی جائے۔ یہ لوگ اس مختصر مدت کے لئے بارش' دھوپ' آندھی غرضیکہ ہر طرح کے موسم میں ان لوگوں کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر بس اور ویگن کا انتظار کریں جو پیدائش سے وفات تک اس جاں گسل مرحلے سے گزرتے ہیں! ان میں سے کوئی بیمار ہے تو بھی رحم کی کوئی گنجائش نہیں کہ رحم سب کے لئے ہوتا ہے' کسی ایک کے لئے نہیں!

2 ..... تمام صاحب ثروت لوگوں کی جائیدادیں' بینک بیلنس اور لاکرز وغیرہ ایک سال کے لئے' فریز کر کے' ان کے اور ان کے کنبے کی رہائش کے لئے ایک ایک کمرے کا کوارٹر الاٹ کر دیا جائے اور دو ہزار روپے ماہانہ الاؤنس دیا جائے جس میں یہ علاج معالجے' بچوں کے تعلیمی اخراجات' گیس بجلی اور پانی کے بل ادا کریں' نیز کچن کا خرچہ بھی چلائیں۔

گریڈ 17 سے گریڈ 22 تک کے افسروں کو بھی یہ ''ریفریشر کورس'' کرایا جائے۔

3 ..... ان سب لوگوں کو ایک سال کے دوران کسی بے گناہی کے جرم میں دو تین دفعہ تھانے لے جایا جائے اور وہ سب کچھ ان سب کے ساتھ ہو جو تھانوں میں ہر بے گناہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی کوئی فائل گم کر کے انہیں دفتروں کے چکر بھی لگوائے جائیں' نیز

متذکرہ سال میں کم از کم ایک دفعہ انہیں بغیر مقدمے کے ان کے گھر سے اٹھایا جائے اور کسی نامعلوم مقام پر واقع کسی پنجرے میں بند کر دیا جائے' ان کے لواحقین کو کافی عرصہ تک پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ بعد میں انہیں انصاف کے نام پر ملنے والی ناانصافیوں کے تجربہ کے لئے کچہریوں کے چکر میں ڈالا جائے!

4 ..... سال میں صرف تین مہینے مراعات یافتہ طبقے جن میں صاحب ثروت سیاست دان بھی شامل ہیں کو جون' جولائی کے مہینے میں بھٹیوں میں کام پر لگایا جائے یا دسمبر اور جنوری فروری کے مہینے میں انہیں فجر کی اذان سے پہلے کھیتوں میں کام کے لئے بھیجا جائے' ان کی بیگمات گھروں میں چکی پر آٹا پیسیں' ٹوکے سے جانوروں کے لئے چارہ کاٹیں' دودھ بلوئیں' اپلے تھاپیں' باہر کھالے پر جا کر کپڑے دھوئیں اور بچے چلچلاتی دھوپ میں فصل کی کٹائی میں حصہ لیں یا کسی ورکشاپ پر استاد کی جھڑکیں اور مار کھائیں یا صبح اخبار بیچ کر گھر والوں کا ہاتھ بٹائیں!

5 ..... ایک سال کے لئے مذہبی' سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور گدی نشینوں سے ان کی پجیرو گاڑیاں' مسلح گارڈ اور عقیدت مند چھین کر انہیں قریبی مسجدوں میں موذن لگا دیا جائے وہ دو وقت کا کھانا محلے والوں کے گھروں پر دستک دے کر وہیں باہر بیٹھ کر کھائیں یا اپنے ساتھ اپنے حجرے میں لے جائیں' بیماری وغیرہ کی صورت میں دم درود کر لیا جائے' پہننے کے لئے محلے والوں کی اترن مل جائے گی۔

6 ..... تین ماہ کے لئے صحافیوں کو ان کے اخبارات سے علیحدہ کر کے انہی اخبارات میں ان کے سیکنڈلز شائع کئے جائیں اور ہر دوسرے چوتھے دن ان کے بارے میں کوئی من گھڑت خبر تین کالمی سرخیوں کے ساتھ شائع کی جائے۔ اگر اس کی تردید کرنا پڑے تو سنگل کالم تردید کافی ہوگی۔

عوام کے مصائب دور کرنے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے ضمن میں تجاویز تو اور بھی میرے ذہن میں ہیں لیکن انہی تجاویز پر عمل کیا جائے جو میں نے بیان کی ہیں تو آپ یقین جانیں ایک سال کے اندر اندر عوام کی ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی اور معیشت کی بحالی کے سارے رستے کھل جائیں گے۔ مراعات یافتہ طبقہ اور ارباب اختیار جب اس نظام کا خود شکار بنیں گے' جسے وہ حیلے بہانے سے ہر دفعہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں' تو اس نظام کے خاتمے کے لئے ان کا زرخیز ذہن ایسے منصوبے بر سر کار لائے گا کہ اس رستے کی تمام مشکلات چشم زدن میں ختم ہو جائیں گی' بس ایک دفعہ میری تجاویز پر عمل کر کے دیکھیں' اللہ نے چاہا تو نتیجہ سو فیصد ہوگا!

◆◆◆

یکم جنوری 2000ء

آج یکم جنوری 2000ء ہے۔ میرے جیسے قدامت پسند کافی عرصے تک نیا سن ڈھلتے وقت پرانا سن لکھ دیں گے کہ آئین نو سے ڈرتے اور طرز کہن پہ اڑنے والوں کے لئے یہی منزل کٹھن ہوتی ہے تاہم یہی مسئلہ حل طلب ہے کہ اکیسویں صدی کا آغاز سن 2000ء سے ہو چکا ہے یا سن 2001ء سے ہوگا لیکن چونکہ مسائل افہام وتفہیم سے حل نہیں ہوتے بلکہ طاقت کے زور پر حل ہوتے ہیں لہٰذا امریکہ اور یورپ کی طاقتور قوموں نے فیصلہ سنا دیا ہی کہ 21ویں صدی شروع ہو چکی ہے۔ ہم مسلمانوں کی اکیسویں صدی تو ابھی چار سو سال بعد شروع ہوگی جبکہ تھائی لینڈ والوں کی اکیسویں صدی ان کے کیلنڈر کے مطابق چار سو سال پہلے شروع ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہم مسلمان اپنے کیلنڈر کے مطابق پندرھویں صدی میں زندہ ہیں۔ صرف کیلنڈر کے مطابق نہیں بلکہ ہم دنیا بھر کے مسلمان عملی طور پر ابھی تک پندرھویں صدی میں ہیں۔ ہمارے تو بڑے بڑے فیصلے طاقتور اقوام کے اشارے پر ہوتے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی والا فیصلہ تو کوئی فیصلہ ہی نہیں' اس صدی میں صرف داخل ہی تو ہونا ہے' کون سا اس کے تقاضوں کے مطابق اپنا لائحہ عمل مرتب کرنا ہے؟ چنانچہ آپ سب کو مبارک ہو' آپ کو کوئی ٹیسٹ دیئے بغیر اکیسویں صدی میں داخلہ مل گیا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے گزشتہ رات اسلام آباد' انقرہ' بغداد' ریاض اور دوسرے اسلامی ممالک کے دارالحکومتوں کے عشرت کدوں میں کھلم کھلا یا باپردہ جشن منائے گئے ہوں گے کہ طاقتوروں نے ہمارے دوسرے حقوق چھینے ہیں۔ اپنی پسماندگی اور بربادی کا جشن منانے کا حق تو انہوں نے ہم سے کبھی نہیں چھینا۔

اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت اسلام خصوصاً پاکستان کے مسلمانوں کو بعض بڑے بڑے مسائل کا سامنا ہے ہمارے مختلف فرقے ایک دوسرے کو مشرک' مرتد گستاخ رسول اور کافر جیسے القابات سے نوازتے رہتے ہیں۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان کفار اور مشرکین کے بعد پاکستانی اقلیتوں میں مسلمان کس نمبر پر آتے ہیں۔ میرے خیال میں ہماری تعداد چند لاکھ رہ جاتی ہے اور اس تفریق کے بعد اکثریت پاکستانی مسیحیوں اور ہندوؤں کی قرار پاتی ہے۔ اگر یہ اقلیتیں چاہیں تو سپریم کورٹ میں یہ رٹ دائر کر سکتی ہیں کہ انہیں اقلیت کی بجائے اکثریتی اسٹیٹس دیا جائے۔

پاکستانی مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ بھی بہت گمبھیر ہے۔ انہیں یہ مشکل فیصلہ بھی کرنا ہے کہ پاکستان پر حکومت کا حق ان فوجی اور

سیاسی اقلیتوں کا ہے جن کا پاکستان کے قیام میں کوئی کردار نہیں' یا ان سیاست دانوں کا ہے جن کے پیشروؤں نے ووٹ کی بنیاد پر پاکستان حاصل کیا تھا؟ اس حوالے سے منتخب حکومتوں کے بارے میں بھی ہم نے سوچنا ہے کہ ان کی ساری خرابیاں اور برائیاں اس وقت سامنے کیوں نہیں آتی ہیں جب کوئی بالادست مسیحا ان کا بوریا بستر گول کر دیتا ہے اور یہ کہ نتیجہ کے انتظار میں ہم بارہا تعریفی نوٹ' اداریے اور کالم لکھ چکے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے کا ایک اور ضروری مسئلہ بھی حل طلب ہے اور وہ یہ کہ تمام لوگ جو ان عبوری حکومتوں کو جو سیاست دانوں کا گند صاف کرنے کے لئے آتی ہیں' بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کے جاتے ہی وہ ان کی تباہ کاریوں پر کتابیں لکھتے ہیں اور قلمی واویلا کیوں کرتے ہیں۔ ثبوت کے لئے ایوب خان' یحییٰ خان' ضیاء الحق اور معین قریشی کی آمد اور ان کے جانے کے بعد والی تحریروں کا موازنہ اور مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اکیسویں صدی میں ہم پاکستانی مسلمانوں کو ایک اور بڑے مسئلے کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ ہمیں عورتوں کو ان کے وہ حقوق دینے چاہئیں' انہیں جو اسلام نے دیئے ہیں؟ اسلام کی تعلیمات سر آنکھوں پر' لیکن ہمیں اس نوع کے فیصلے تو عرب معاشرے کو نہیں اپنے ''ہندی'' معاشرے کو سامنے رکھ کر کرنے ہیں۔ اس فیصلے میں بس یہی چھوٹی سے الجھن حائل ہے!

اکیسویں صدی میں مغربی قوتوں کے اپنے مسئلے ہیں' انہوں نے ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا سلسلہ جاری رکھنا ہے لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ کیا ہم اسکول جانے کا حق ان پاکستانی بچوں کو بھی دیں جو' میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں یا صرف ان بچوں کو جو صاف ستھرے لباس میں ملبوس ہوتے اور صاف ستھرے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ابھی یہ فیصلہ بھی ہونا ہے کہ کس بچے کے ہاتھ میں کھلونے اور کس کے ہاتھ میں اوزار ہونے چاہئیں۔ اسی طرح کا کلیہ ہمیں علاج معالجے وغیرہ کی سہولتوں کے حوالے سے بھی سوچنا ہے۔ ویسے جس طرح ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس کے پیش نظر علاج کی سہولتیں بچوں کو نہیں دی جا سکتیں۔

اس کا مستحق وہی ہے جو درج بالا اصول کے مطابق خود کو اس کا مستحق ثابت کرے۔ ہمیں انصاف سستا اور آسان کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ مگر ہمارے پاس ان تمام مسائل کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہے' ہم بہت مصروف قوم ہیں اور ان سے کہیں بڑے مسئلوں کے حل میں مشغول ہیں جن کا ذکر میں نے شروع کیا ہے۔ مسیحیوں کے پادری اپنے زوال کے زمانے میں اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ بائبل کی روشنی میں گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں' قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے کہا ''اس معاملے میں بائبل کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے' گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت گن لو!''

آج یکم جنوری 2000ء ہے۔ ہمیں گھوڑے کا منہ کھول کر اس کے دانت گننے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح کے فیصلے ہماری برادری یا معاشرے کی طرح فارغ نہیں ہیں جس کا منہ کوئی بھی اور کسی بھی وقت کھول کر اس کے دانت گن سکتا ہے! ہم اپنے مسئلے اسی طرح حل کریں گے جس طرح صدیوں سے حل کرتے آ رہے ہیں اور اگر اس ضمن میں اکیسویں صدی نے مداخلت کی بھی تو ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟

◆◆◆

جسے اللہ رکھے

بیسویں صدی میں یوں تو بہت سے محیر العقول واقعات رونما ہوئے جن میں سائنس' سیاسی' معاشی اور معاشرتی احوال وواقعات شامل ہیں تاہم گزشتہ صدی میں ہونے والے بعض قتل بھی ایسے ہیں جو بہت حیرت انگیز ہیں کیونکہ ان شخصیت کی حفاظت کے لیے ایک پورا نیٹ ورک کام کر رہا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود تمام دکھائی دینے والے نہ دکھائی دینے والے حفاظتی اقدامات کے باوجود گزشتہ صدی میں امریکی صدر جان ایف کینیڈی' بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور انکے صاحب زادے راجیو گاندھی' پاکستانی وزیر اعظم خاں لیاقت علی خاں' جنرل ضیاء الحق اور انکے ساتھیوں اور سابق وزیر اعظم پاکستان کے سگے بھائی مرتضی بھٹو کو ان کی بہن کے وزارت عظمی کے عین دوران قتل کر دیا گیا' یہ سارے قتل اس لیے حیرت انگیز ہیں کہ ایسی شخصیات کی حفاظت کے لیے ہر ممکن طریقہ بروئے کار لایا جاتا ہے' بیسویں صدی میں قتل ہونے والوں میں یوں تو ہمارے پاکستان سے چودھری ظہور الٰہی' حکیم محمد سعید' مولانا صلاح الدین' نواب محمد احمد خاں' ریٹائرمنٹ کے بعد ملک امیر محمد خان اور دوسرے بے شمار لوگ شامل ہیں مگر انہیں قتل کرنا آسان تھا کہ اس طرح شخصیات کی حفاظت کے لیے کوئی غیر معمولی انتظام نہیں کیا جاتا!

مگر میں جس بات پر حیران ہوں اور شکرانے کے طور پر میں نے گزشتہ روز بیس نفل پڑھے' وہ نواز شریف حکومت کے طے شدہ پلان کے باوجود اور اس کام کے لئے خفیہ ایجنسی کے ایک اہلکار کی تعیناتی کے باوصف سیاسی تجزیہ نگار ارشاد احمد حقانی اور میرے عزیز دوست اور کالم نگار ہارون الرشید کے قتل کی سازش کامیاب نہ ہو سکی' حقانی نے اس منصوبے کا انکشاف اپنے کالم میں ''متوقع'' قاتل کے گمنام خط جس کا لفافہ ان کے پاس محفوظ ہے کی اشاعت سے کیا ہے اور اس خط کے مندرجات پر تبصرہ کرتے ہوئے لگتا ہے کہ انہیں اس خط کے مندرجات پر سو فیصد یقین ہے جب کہ برادرم ہارون الرشید کا ''غیب'' پر ایمان کمزور لگتا ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر ہی اس مبینہ منصوبے کے بارے میں کوئی رائے دے سکتے ہیں۔ خفیہ ایجنسی کے اہلکار نے اپنے گمنام خط میں لکھا ہے کہ وہ تمام تر کوشش کے باوجود حقانی صاحب کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ وہ جس اخبار میں کام کرتے ہیں' وہاں دکھائی نہ دینے والے حفاظتی اقدامات کا اہتمام کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ بچ گئے نیز ایک آدھ دفعہ قاتل خود گھبرا گیا۔ ایک آدھ دفعہ نشانہ خطا ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ اس اہلکار ایجنسیوں پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ ملک میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرتی ہیں!

بہر حال اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ شدید حفاظتی اقدامات کے باوجود دینا کے کئی ملکوں کے سربراہ صدر کینڈی سمیت ایک چیونٹی کی طرح مارے گئے' مگر اس نے ہمارے حقانی صاحب کو محفوظ رکھا' اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حقانی صاحب قسمت کے دھنی ہیں' ورنہ ایسے کاموں کے لئے حکومتیں انتہائی سفاک قاتلوں کو متعین کرتی ہیں' جنہوں نے اس سے پہلے کئی قتل کئے ہوتے ہیں اور یوں ان کے لئے کسی کی جان لینا مرغی ذبح کرنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر حقانی صاحب خوش قسمت ہیں کہ ان کے قتل کے لئے انتہائی انسان دوست اور نرم دل قسم کے قاتل ڈیوٹی لگائی گئی' اس سے پہلے اسے قتل کا کوئی تجربہ نہ تھا ورنہ اپنے خط میں اس نے جہاں حقانی صاحب سے درخواست کی ہے وہ انہیں معاف کر دیں' وہ اس خط میں ان سب حضرات سے بھی معافی مانگتا ہے جنہیں وہ پہلے قتل کر چکا ہے یا قتل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے' اس کے گھبرانے اور نشانہ خطا ہونے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زیر تربیت (اپرنٹس) قاتل تھا' مجھے یقین ہے اس ناکامی کے بعد ابھی تک اس کی نوکری کنفرم نہیں ہوئی ہوگی۔

محترم حقانی صاحب کی خوش قسمتی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے قتل پر صرف ایک شخص کو مامور کیا گیا ہے' حالانکہ ایسے کاموں کے لئے پوری میدان جنگ کی اسٹرٹیجی عمل میں لائی جاتی ہے' دو آدمی ایک کونے میں کھڑے ہوتے ہیں' کوئی موٹر سائیکل سوار کسی اور جگہ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے' کسی کار میں ذرا فاصلے پر کوئی اور شخص ساری کاروائی مانیٹر کر رہا ہوتا ہے۔ بسا اوقات واردات میں کامیابی پر قاتل کو موقع ہی پر مارنے کے انتظامات مکمل ہوتے ہیں' مگر اللہ تعالیٰ کو دشمنوں کا منہ کالا کرنا تھا' سو ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی اور انہوں نے اتنی بڑی شخصیت کے قتل کی انتہائی بوگس اور ناقص منصوبہ بندی کی۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ حقانی صاحب اپنے فکر انگیز تجزیوں اور ہماری راہنمائی کے لئے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے کالم میں اس دور کی حکومت کے خلاف ارادہ قتل کی ایف آئی آر تو لکھا دی لیکن میرے ایسے عقیدت مندوں کی خواہش ہے کہ جس طرح علامہ طاہر القادری اس حکومت کے پہلے دور میں خود پر قاتلانہ حملہ کا کیس عدالت میں لے گئے تھے (اور پھر عدالت کے نازیبا ریمارکس پر عدالت کا بائیکاٹ کر دیا تھا) اس طرح حقانی صاحب بھی اخبارات میں الزام لگانے کی بجائے عدالت سے رجوع کریں کہ ویسے بھی میاں نواز شریف پر ابھی مزید کیسوں کی ضرورت ہے!

آخر میں حقانی صاحب کو چھوٹے بھائی کے طور پر ایک مشورہ! آپ نے جس ''خفیہ ایجنسی'' کے ''خفیہ اہلکار کو جو ''خفیہ'' خط اپنے کالم میں شائع کیا ہے اور اس کے مندرجات پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے ہیں' ذرا تحقیق کریں کہ یہ خفیہ اہلکار کہیں انڈیا کی کسی خفیہ ایجنسی کا اہلکار تو نہیں جو پاکستانی ایجنسیوں پر اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کا گھناؤنا الزام لگا رہا ہے اور ایک محب وطن پاکستانی

ہوتے ہوئے بھی آپ کا یہ خط اپنی مہر تصدیق کے ساتھ اپنے کالم میں شائع بھی فرما رہے ہیں؟ میری درخواست ہے کہ اپ اس پہلو پر غور کریں اور ایک درخواست یہ بھی ہے کہ میری گزارشات پر خفا نہ ہوں کہ میں بہر حال آپ کے مداحوں میں سے ہوں!

◆◆◆

مرنے کے بہانے

ٹریفک کے حادثات اس وقت سے رونما ہو رہے ہیں جب سے ٹریفک وجود میں آیا ہے۔ دوسرے ممالک میں تو اس کی وجوہات کچھ اور ہوں گی لیکن ہمارے ہاں اس کے اسباب قدرے مختلف ہیں' مثلاً ایک سبب تو یہ ہے کہ حادثے کے لئے بڑی محنت سے کوئی نہ کوئی سبب تلاش کیا جاتا ہے یا جیسے درویش کو پتہ نہیں ہوتا لیکن رزق کہیں نہ کہیں سے آ جاتا ہے' اسی طرح حادثے سے دوچار ہونے کے لئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ خود پیچھا کرتا ہے۔ ایک شریف آدمی اچھے موڈ میں اگر فٹ پاتھ پر چل رہا ہو تو حادثہ کسی بغیر بریکوں والی ویگن کی صورت میں اسے فٹ پاتھ پر بھی آ دبوچتا ہے۔ بسا اوقات ''حادثہ'' ٹریفک پولیس سے آمنا سامنا ہونے کا بھی نام ہے۔ یہ قدرے مہنگا پڑتا ہے۔

میں نے ٹریفک کے حادثات کی وجوہات پر غور کیا تو اس کی کئی وجوہات دریافت ہوئیں' جن میں پیشتر مثبت تھیں' مثلاً ایک وجہ ہمارے عوام کا اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنا ہے' مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر سلیم اختر اور میں سرگودھا سے ایک تقریب میں شمولیت کے بعد لاہور آ رہے تھے' میں اگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا' اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے سے دو خونخوار قسم کی بسیں ایک دوسرے سے ریس لگاتی ہوئی شانہ بشانہ چلی آ رہی ہیں اور ہمارا ڈرائیور بھی سیدھا انہی کی طرف جا رہا ہے' پہلے میں سمجھا کہ یہ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے بعد کچے پر اتر جائے گا اور یوں ہماری جان بخشی ہو جائے گی لیکن جب زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا تو میں نے اسے کاندھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا یہ کیا کر رہے ہو ہوش سے کام لو' اس پر ڈرائیور نے بادل نخواستہ کار کچے پر اتار لی اور ان بسوں کے اتنے قریب پہنچنے پر اتاری کہ ڈرائیور کی طرف کا سائڈ مرر بس سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کی وجہ سے' ہم جو سارے رستے چہکتے چلے آ رہے تھے' کافی دیر تک خاموش رہے اور ہمارے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرائیور سے پوچھا کیا تمہیں سامنے سے بسیں آتی دکھائی نہیں دی تھیں؟'' جناب وہ تو میں نے دیکھ لی تھیں'' میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ اگر تم نے بسیں دیکھ لی تھیں تو تم اپنی اور ہماری جان سے کھیلنے پر کیوں تلے ہوئے تھے؟ اس نے اپنی ناراضگی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا'' جناب میں اپنے ہاتھ پر جا رہا تھا' وہ لوگ غلط آ رہے تھے' آج مجھے آپ کی وجہ سے اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کرنا پڑا۔''

ہمارے ہاں ہونے والے ٹریفک کے حادثات کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ فضول چیزوں پر وقت ضائع نہیں کرتے کہ جانتے ہیں' وقت بہت قیمتی چیز ہے' جس قوم کو اتنے کام ہوں' وہ اگر سرخ بتی پر کھڑا ہونا شروع کر دے جو اس نے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھی ہوئی ہے تو یہ محض وقت کا ضیاع ہے' یا اگر وہ لین سے دوسری لین میں جانے سے پہلے انڈیکیٹر دینے بیٹھ جائے تو دوسرے ہاتھ میں جلتے ہوئے سگریٹ کی وجہ سے آتش زدگی کا امکان ہوتا ہے یا موبائل فون پر ہونے والی نہایت ارجنٹ گفتگو میں بریک آسکتی ہے جس کے نتیجے میں اگلے روز لارنس گارڈن میں ہونے والی ملاقات کینسل ہوسکتی ہے۔ ٹریفک کی تیسری بڑی وجہ بھی بہت مثبت ہے اور اس کی جڑیں ہمارے کلچر میں ہیں' کسی تیز رفتار سڑک پر جاتے ہوئے اگر ہمیں کوئی اپنا دوست رستے میں کھڑا نظر آجائے یا ویگن والے کو کوئی مسافر گرمی یا سردی کے عالم میں ویگن کا انتظار کرتا نظر آئے تو اس موقع پر عین چوک میں فوری طور پر بریک لگانا ہماری ثقافتی ذمہ داری ہے' ایسے مواقع پر محض اس خیال سے سو دو سو گز آگے جا کر گاڑی روکنا کہ پیچھے آنے والی گاڑیاں حادثے کا سبب بنیں گی' مادہ پرستی کی ذیل میں آتا ہے' ہم جانتے ہیں کہ بیس پچیس جانیں ہمارے کلچر سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔

میرے نزدیک ٹریفک حادثات کی ایک اور وجہ بھی ہے اور یہ وجہ ہماری قوم کی غریب پروری ہے۔ پولیس کے محکمے میں تنخواہیں پہلے ہی بہت کم ہیں' اگر ہمارے عوام بھی پولیس سے تعاون نہ کریں اور ٹریفک کے اصولوں کی پابندی شروع کر دیں تو ملک میں غربت کی شرح میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ہمارے عوام کی یہ سوچ' عوام اور حکومت کے درمیان ہم آہنگی کی علامت ہے کہ دونوں' ملک سے غربت کا خاتمہ اسی طرح ایک دوسرے سے تعاون کے ذریعے چاہتے ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں کسی واقعہ یا حادثہ کی وجوہات بیان کرنے کے بعد آخر میں ایک ''فوری وجہ'' بھی بیان کی جاتی ہے اور اس سلسلے کی فوری وجہ یہ ہے کہ پہلے ہمارے ہاں مفکر پیدا ہوا کرتے تھے' اب ''متفکر'' پیدا ہوتے ہیں' چنانچہ یہ متفکرین ڈرائیونگ کے دوران کائنات اور موت و حیات ایسے مسئلوں پر غور کرتے نظر آتے ہیں ان کے زیر غور مسائل میں موت کا مسئلہ فوری طور پر حل ہو جاتا ہے۔

فوری وجہ عموماً ایک ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک اس مسئلے کی فوری وجہ ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے عوام کا اعتماد دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں سے اٹھ گیا ہے چنانچہ وہ سڑک کراس کرتے وقت دائیں بائیں نہیں دیکھتے بلکہ ''صراط مستقیم'' پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں ان کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو عموماً صراط مستقیم پر چلنے والوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔

بعض ''کمیونسٹ'' قسم کے لوگوں کا خیال ہے کہ ٹریفک کے حادثات کا باعث بننے کے لئے جینا مرنا ایک برابر ہو کر رہ گیا ہے بلکہ

بسا اوقات مرنے کی صورت میں لواحقین کے لئے روٹی پانی کا خرچہ نکل آتا ہے۔ ایک گاؤں کے نمبردار کی گائے چوری ہوگئی اس نے سب مشکوک لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا اور کہا جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ دے کہ اگر گائے میں نے چوری کی ہے تو میرے بچے مریں'' تو میں اس کی بات پر یقین کرلوں گا' سب لوگ قرآن پر ہاتھ کر اور یہ جملہ ادا کر کے چوری کے الزام سے بری الذمہ ہو گئے۔ جب یہ نمبردار کے ڈیرے سے باہر گئے تو اک شخص جسے علم تھا کہ یہ گائے میراثی نے چوری کی ہے' میراثی نے کہا ''میں جانتا ہوں کہ گائے تم نے چوری کی ہے' اس کے باوجود تم نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیا کہ اگر گائے میں نے چوری کی ہو تو میرے بچے مریں؟'' میراثی نے کہا ''میرے بچے ویسے بھی بھوک سے مر رہے ہیں' میں نے سوچا چند روز گائے کا دودھ پی کر مریں تو کیا حرج ہے؟''

خواتین وحضرات! آج میرا ارادہ محض ٹریفک کے حادثات کی وجوہ بیان کرنا تھا' مگر میرے نہ چاہنے کے باوجود آخر میں ہمارے تمام مسائل کی وجہ سامنے آ گئی۔ ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اگر ظالمانہ سرمایہ داری نظام کی وجہ سے اس کے بچوں کو آئی ایم ایف کی قسطوں کی طرح' قسطوں میں مرنا ہی ہے تو وہ چند روز چوری کا دودھ پی کر کیوں نہ مریں؟ یہ سوچ اب افراد ہی کی نہیں' سارے اداروں کی بھی ہے' افراد ذہنی طور پر اور ادارے مالی طور پر کنگال ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہے' مگر اس کے لئے کوئی ادارہ نہ بنایا جائے ورنہ اس ادارے کے کنگال ہونے پر ایک اور ادارہ بنانا پڑے گا جو سوچے گا کہ کنگال ہونے کی وجوہات تلاش کرنے والے ادارے کے کنگال ہونے کی وجوہات کیا تھیں؟

(ٹریفک پولیس ملتان کے زیر اہتمام منعقد تقریب میں بطور مہمان خصوصی پڑھا گیا)

◆◆◆

فریب نظر

ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی' وہ یہ کہ ہماری قوم شاعری کیوں نہیں کرتی' لے دے کر دس بارہ شاعر ہیں اور یہی شاعر غزل' نعت اور مرثیے کے مشاعروں میں ہر بار اور ہر موسم میں ٹی وی پر نظر آجاتے ہیں۔ حالانکہ ہم لوگوں کی گفتگوؤں میں جتنا مبالغہ ہوتا ہے' اس لحاظ سے ہم میں سے ہر ایک کو شاعر ہونا چاہیے۔ مبالغہ شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ اور ہم لوگ مبالغے کے بادشاہ ہیں۔ اس لحاظ سے ہم میں سے ہر ایک ''ملک الشعراء'' کہلائے جانے کے قابل ہے!

جب لاہور کے چیئرنگ کراس پر الفلاح بلڈنگ تعمیر ہوئی تو ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہا ''تم نے الفلاح بلڈنگ دیکھی ہے؟ میں نے جواب دیا۔ ''ہم لوگوں نے تو ابھی تک فلاح کی راہ نہیں دیکھی' پوری بلڈنگ کہاں سے دیکھنا تھی؟'' بولے ''تم ہر وقت جلی بھنی باتیں نہ کیا کرو' کسی دن موقع ملے تو ضرور دیکھنا' یہ ایشیا کی سب سے بڑی بلڈنگ ہے۔'' میرے اس دوست نے براعظم ایشیا میں سے ابھی تک صرف میاں چنوں اور اس کا نواحی علاقہ ہی دیکھا تھا یا وہ باقاعدگی سے برادرم مظفر بیگ کے ہفت روزہ ''ایشیا'' کا مطالعہ کرتے تھے' مگر علم' کتابوں' رسالوں کے مطالعہ یا سیر و سیاحت کا محتاج کہاں ہوتا ہے؟ یہ تو ایک واجبی چیز ہے!

ایک روز ایک نوجوان میرے پاس آیا اور پوچھا ''آپ کے خیال میں شیکسپیئر اور عبدالغفور زخمی میں کیا فرق ہے؟'' میں نے کہا ''زخمی کو شیکسپیئر پہ فوقیت حاصل ہے کیونکہ شیکسپیئر صرف شیکسپیئر تھا زخمی نہیں تھا'' میرا جواب سن کر موصوف کچھ سٹپٹا سے گئے' کہنے لگے ''میرا مطلب تھا کہ ان دونوں میں سے' آپ کے نزدیک کسے فوقیت حاصل ہے؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کا سوال خاصا مشکل ہے' لیکن اگر شیکسپیئر بھی عبدالغفور زخمی جیسے ڈرامے لکھتا تو ایک دن وہ بھی زخمی ہو سکتا تھا!'' یہ سن کر وہ صاحب بہت خوش ہوئے' اٹھ کر گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا ''مجھے عبدالغفور کہتے ہیں!''

میرے ایک دوست حالانکہ دمے کے مریض ہیں' لیکن وہ گانے کے بہت شوقین ہیں' صرف شوقین نہیں بلکہ انہیں یقین ہے کہ اس وقت برصغیر میں ان کے پلے کا کوئی گلوکار نہیں' ایک روز انہوں نے اس ضمن میں میری رائے بھی طلب کی' پوچھنے لگے ''یار دوستی کو ایک طرف رکھ کر سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے نزدیک گائیگی میں میرا کیا مقام ہے؟'' مجھے ان کے برصغیر والے دعوے کا بھی علم تھا۔ اور میں اتنے اچھے دوست سے جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتا تھا' چنانچہ میں نے کہا ''برصغیر میں جو گلوکار دمے کے مریض ہیں تم ان میں سے سب

سے بہتر ہو۔"

اس دن کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

جب ہمارے ہاں انتخابات کا زمانہ آتا ہے (انتخابات اس عمل کو کہتے ہیں جس کے ذریعے مہذب ممالک میں لوگ اپنا ووٹ کا حق استعمال کرتے ہیں اور یوں ایک نمائندہ جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے' پاکستان میں بھی یہ عمل کبھی کبھی دہرایا جاتا ہے) معاف کیجئے گا۔ بریکٹ والا جملہ زیادہ لمبا ہو گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں جب انتخابات ہوتے ہیں' متذکرہ نوع کی مبالغہ آرائی اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ بلکہ ملکی انتخابات کو تو چھوڑیں' چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے انتخابات میں بھی القابات کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ پرانی مکتوب نگاری میں استعمال کئے گئے القابات ان کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ انارکلی میں تاجروں کی انجمن کے انتخابات کے موقع پر ایک امیدوار کے نام کے ساتھ "فخر ایشیا" لکھا ہوا پایا گیا۔ ان کے منشور کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کریں گے۔ انتخابات کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "برادرم انارکلی میں لاکھوں لوگ شاپنگ کے لئے آتے ہیں۔ اور ان کے لئے پورے بازار میں کوئی بیت الخلاء نہیں۔ آپ نے اپنے منشور میں بیت الخلاء کی تعمیر کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کا وعدہ کر بیٹھے۔" کہنے لگے "بیت الخلاء کی تعمیر کا وعدہ کیسے کرتا' وہ تو کامیاب ہونے پر بنانا پڑ جاتا!"

تو دوستو! معاملہ یہ ہے کہ ہماری قوم مبالغوں اور نعروں کے سہارے جی رہی ہے۔ ہمارے علامہ حضرات کارل مارکس' ڈاؤن' سارتر اور دوسرے مغربی مفکرین کی تھیوریوں اور فلسفوں کا ستیاناس ایک جملے میں کر دیتے ہیں۔ نفسیات میں ایک اصطلاح "ہیلوسی نیشن" (HALLUCINATION) کی ہے جس مطلب "فریب نظر" ہے۔ اور جس کا مریض حقائق کی دنیا سے الگ اپنی ایک دنیا' اپنی خواہشات کے مطابق بسا لیتا ہے۔ چنانچہ اسے واقعی وہ سب کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے اور محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ جو وہ بیان کرتا ہے۔ ایسے مریض کو حقائق کی دنیا میں واپس لانا بہت مشکل ہے۔

فریب نظر میں مبتلا ہماری قوم بھی ماضی کی طرح اس وقت بہت مشکل میں ہے.....!

◆◆◆

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ.....!

1947ء کے قیامت خیز دن ہیں' مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے لئے اپنے قافلے پاکستان کی طرف رواں ہیں' ہوشیار پور سے ایک ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہو رہی ہے' خاندانوں کے جو افراد بلوائیوں کی سنگینوں' تلواروں اور کرپانوں سے بچ گئے ہیں' وہ اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان کو آنکھوں میں بسائے ٹرین میں دبکے بیٹھے ہیں' ان میں ایک کا شتکار خاندان کے بچے بچیاں بھی ہیں' ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے اور بیٹیوں کو سیٹوں کے نیچے چھپا دیا ہے اور ان پر ایک چادر ڈال کر کلمہ پڑھتی ہے اور ساتھ کہتی جا رہی ہے "اللہ دے حوالے" رستے میں بلوائی ٹرین پر حملہ کر دیتے ہیں لیکن بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی اپنی پرانی بندوق تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بلوائیوں کو للکارتا ہے۔ بلوائی اس کی دہشت سے اس کے قریب نہیں آتے اور ہمارا ایک سپاہی ٹرین کو بحفاظت اس خطرے سے بچا کر لے جاتا ہے!

بلوچ رجمنٹ کا یہ سپاہی کہاں ہے' ان دنوں پھر اس کی ضرورت ہے! جو مسجدوں' گھروں' امام بارگاہوں اور سڑکوں پر ہمیں بلوائیوں سے بچائے!

ٹرین شدید مصائب اور مشکلات کے بعد لاہور پہنچتی ہے اور اس کے مسافر اپنی بھیگی آنکھوں کے ساتھ پاک سرزمین پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

خدا کے یہ شکر گزار بندے ان دنوں کہاں ہیں' آج ہم ناشکروں کو پھر ان شکر گزار بندوں کی ضرورت ہے!

مہاجروں کو لاہور کے والٹن کیمپ میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہاں رضا کار دن رات ان کے دکھ بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں' ہر سرکاری ملازم اور رضا کار پوری لگن سے خدمت کرتا نظر آتا ہے' مصیبت' موت' بے سروسامانی عزیزوں کی جدائی اور بیماری نے اس کیمپ کے باسیوں کو چڑچڑا بنا دیا ہے مگر بے لوث ورکروں کی دلداری نے ہر آنے والے مہاجر کو ان کا اور پاکستان کا گرویدہ بنا لیا ہے۔

یہ سرکاری ملازم اور یہ رضا کار کہاں ہیں؟ ہم ان بے لوث لوگوں سے محروم کیوں ہو گئے ہیں؟

جن بچوں کو ٹرین کی سیٹ کے نیچے چھپا کر پاکستان لایا گیا تھا ان کے والدین ان بچوں کو لے کر لاہور کے قریبی گاؤں مراکہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ملک حیات اور چودھری بوٹا فرشتوں کی صورت میں موجود ہیں جو ہر آنے والے اجنبی مہمان کے دکھ بانٹنے کے لئے

ہمہ وقت تیار ہیں۔

ہمیں ملک حیات اور چودھری بوٹا کی آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے!

اس خاندان کا بچہ اپنے گاؤں سے چار جماعتیں پاس کر چکا تھا۔ وہ مراکہ کے سکول کے سامنے کھڑا ہے۔ ماسٹر پوچھتا ہے پڑھنا چاہتے ہو؟ بچہ کہتا ہے ہاں' مگر میرے پاس قلم ہے نہ دوات' قاعدہ اور نہ کتاب! ماسٹر کہتا ہے فکر نہ کرو یہاں کسی کے پاس بھی کچھ نہیں' سب زبانی زبانی چل رہا ہے' اور بچہ سکول میں داخل ہو جاتا ہے!

یہ بچہ وظیفہ کا امتحان پاس کرتا ہے بلکہ لاہور ڈویژن میں فرسٹ آتا ہے اور پھر اپنے خاندان کے ساتھ ٹوبہ ٹیک سنگھ چلا جاتا ہے۔ یہ وہاں قلی کا کام کرتا ہے' مزدوری کرتا ہے' پاکستان نیا نیا بنا ہے' لوگوں کے اندر ایک عجیب جذبہ ہے' وہ کہتے ہیں ہمیں اپنے ملک کو عظیم بنانا ہے۔ یہاں اس بچے کو شیخ سردار محمد ملتا ہے جس کا چائے کا کھوکھا ہے' یہ بچہ یہاں کوئلوں کی بھٹی گرم کرنے کا کام کرتا ہے اور سردار محمد اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھنے کے لئے اسے سہولتیں فراہم کرتا ہے!

ہمیں اس شیخ سردار محمد کو ڈھونڈنا ہے!

پھر اس ذہین' محنتی اور تعلیم سے لگن رکھنے والے بچے کو ماسٹر شاہ محمد' ماسٹر غلام قادر اور دوسرے کئی لوگ ملتے ہیں جو اسے اپنے نئے ملک پاکستان کا اثاثہ بنانے کے لئے اس کے راستے کے کانٹے چنتے ہیں۔

یہ راستے کے کانٹے چننے والے لوگ کہاں چلے گئے؟

اس دوران اس بچے کے والد کو میونسپلٹی میں چپراسی کی ملازمت مل جاتی ہے۔ ایس ڈی ایم علاقے کا بادشاہ ہوتا تھا' اس کے آنے کی خبر سے کہرام مچ جاتا تھا' مگر ایک دن ایک عجیب و غریب ایس ڈی ایم ٹوبہ ٹیک سنگھ میں متعین ہوتا ہے۔ یہ بغیر کسی استقبالیہ تقریب کے اسٹیشن سے پیدل خود ہی بلدیہ کے دفتر پہنچ جاتا ہے اور پھر اپنی خدمت کے جذبے سے سارے علاقے کے لوگوں کا دل جیت لیتا ہے' اس ایس ڈی ایم کا نام میاں محمد شفیع تھا!

مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والے بچے کی کہانی کا اس فرشتہ سیرت کردار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ لیکن آج ایس ڈی ایم سے ہمارا تعلق ختم ہو گیا ہے!

پھر یوں ہوتا ہے کہ یہ بچہ اینگلو نیکولر کے فائنل امتحان میں پورے ضلع لاہور میں اول آتا ہے اور اسے لارنس کالج گھوڑا گلی میں مزید تعلیم کے لئے وظیفہ مل جاتا ہے۔ اس بچے کی کامیابی پر صرف اس کے سکول میں نہیں پورے شہر میں جشن منایا جاتا ہے۔

پھر اس بچے کا ہاتھ علاقے کا تحصیلدار پکڑتا ہے اور اسے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے..... اور آخر میں شیخ محمد یوسف آتے ہیں جو گورنمنٹ کالج لاہور میں اس کے داخلے اور ہاسٹل میں رہائش کا سارا خرچ برداشت کرتے ہیں..... اور اس کے بدلے میں اس سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اگر زندگی میں کچھ بن جائے تو اسی طرح کم از کم ایک پاکستانی بچے کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرے اور اس کے پیچھے جذبہ یہی ہے کہ ہم نے پاکستان کے نام سے جو ملک حاصل کیا ہے' اس کے نام کو چار چاند لگانے ہیں۔ یہ شیخ محمد یوسف' طاہر یوسف کے والد تھے جو آج یہی کام بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں اور کل کا وہ بچہ بھی ان کے اس مشن میں ان کا ساتھی ہے!

اس بچے کا نام چودھری سردار محمد تھا جو بعد میں پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر فائز ہوا اور اس کی شادی اسی ایس ڈی کی بیٹی سے ہوئی جو اسٹیشن سے پیدل بلدیہ کے دفتر پہنچا تھا!

یہ ساری کہانی قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں کی ہے جو چودھری سردار محمد کی خودنوشت ''متاع فقیر'' میں بہت موثر تقریر سے بیان ہوئی ہے۔ یہ کالم نہ تو کتاب پر تبصرہ ہے کہ میں یہ کام ان کالموں میں نہیں کرتا۔ لہٰذا (معذرت کے ساتھ) کوئی دوست مجھے محض تبصرے کی غرض سے کتاب نہ بھیجیں اور نہ مجھے ایک ریٹائرڈ پولیس افسر کی خوشنودی منظور ہے۔ اس خودنوشت کے حوالے سے یہ کالم میں نے ایک اور غرض سے لکھا ہے اور یہ غرض میں بشرط زندگی کل بیان کروں گا!

مگر اس سے پہلے یہ سوال کہ ہم اپنی عملی زندگی کا آغاز انسپکٹر جنرل پولیس یا اسی طرح کے اسٹارٹ ہی سے کیوں کرنا چاہتے ہیں' اچھے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد اور محنت سے ہمارا ایمان اٹھ گیا ہے؟ اور یہ کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں والے جذبے سے ہم اپنا ناطہ توڑ بیٹھے ہیں؟

◆◆◆

ماسٹر غلام قادر، واپس آجاؤ.....!

گزشتہ کالم میں، میں نے کہا کہ چودھری سردار محمد کی خودنوشت ''متاع فقیر'' کے بارے میں لکھنے کا مقصد، میں اپنے دوسرے کالم میں بتاؤں گا، سو وہ مقصد یہ تھا کہ میں نے تادم تحریر قیام پاکستان اور اس موقع پر پیش آنے والی مشکلات اور ان کا مقابلہ کرنے کے حوالے سے ترقی پسند دوستوں یا ان کے مخالف تنظیم سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے جتنے افسانے اور ناول پڑھے ہیں اور جو اس دور میں شائع ہوئے جب قوم کو حوصلہ اور ہمت دلانے کی ضرورت تھی، ان سے بیشتر ایک نئی قوم کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتے ہیں، ان افسانوں اور ناولوں کے مطابق والٹن کے مہاجر کیمپ میں فرشتوں کی صورت میں شیطان دندناتے نظر آتے ہیں، جو پہلے سے لٹی پٹی مظلوم عورتوں کا شکار کرتے ہیں جو شخص بظاہر رضا کار نظر آ رہا ہے، درحقیقت وہ بھی لٹیرا ہے جو قدم قدم پر انہیں دھوکہ دیتا ہے۔ ہر طرف ایک خودغرضی اور نفسانفسی کی فضا ہے۔ کوئی کسی کا ہاتھ نہیں تھامتا۔ یہ ناول اور افسانے کہیں بھی اس جذبے کو اجاگر کرتے نظر نہیں آتے جو قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں پاکستانی قوم میں نظر آتا تھا، ان تحریروں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا کہ مکمل بے سروسامانی کے باوجود قوم اس وقت جذبے کی دولت سے کس قدر مالا مال تھی بلکہ یہی لگتا ہے کہ یہ ملک (ان دانشوروں کی خواہشات کے برعکس) بن تو گیا لیکن یہ چند مہینوں سے زیادہ چل نہیں سکے گا، ان تحریروں میں قوم کو یہ امید کہیں نہیں دلائی جاتی کہ ایک نوزائیدہ ملک کو مسائل پیش آیا ہی کرتے ہیں، اور ہمت سے کام لیں تو سب مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اس کے برعکس ان میں بیشتر تحریروں میں انسانیت کے پرچار کے پردے میں بتایا جاتا ہے کہ نئی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نووارد ایسے تجربات سے گزرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں پچھتاوے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور قاری بھی اس نئے ملک کے لئے اپنے دل میں محبت نہیں بلکہ ایک بیزاری یا نفرت سی محسوس کرنے لگتا ہے۔

میرے لئے چودھری سردار محمد کی خودنوشت ''متاع فقیر'' کا مطالعہ اس لئے چونکا دینے والا تھا کہ میں بھی ادب کے دوسرے قارئین کی طرح انسانوں کی بے حسی کے اس منظرنامے پر ایمان لا چکا تھا جو ہمارے بیشتر فکشن رائٹر ہمارے سامنے پیش کرتے رہے تھے، حالانکہ ان میں سے شاید ہی کسی کو ان تجربات سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو جو انہوں نے اپنی کہانیوں کے موضوعات بنائے، جب کہ ''متاع فقیر'' کا مصنف جو رائٹر ہیں، ان تمام جاں گسل مراحل سے گزرا، کیمپ میں رہا، انتہائی بے سروسامانی کا عالم دیکھا لیکن

اسے اس تجربے کے دوران ہر شخص ایک دوسرے کے لئے قربانی اور ایثار کا پیکر نظر آیا'' ''انصار'' مہاجرین کے راستے کے کانٹے اپنی آنکھوں سے چنتے رہے اور ہر کوئی اس جذبے سے سرشار دکھائی دیا کہ ہم نے یہ ملک بڑی قربانیوں سے حاصل کیا ہے' اب ہم نے اسے بنا کر ہی دکھانا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں اور ہمارے عوام کی سوچ میں ہمیشہ سے تضاد کیوں رہا ہے؟ 1947ء میں بھی ایک غریب بچے سردار محمد کی آنکھ کچھ اور منظر دیکھ رہی تھی اور غریبوں کے ہمدرد دانشور اپنی تحریروں میں کچھ اور منظر دکھا رہے تھے' آج بھی دانشور ایک طرف ہیں اور عوام دوسری صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں' کیا خرابی عوام میں ہے یا دانشوروں کی آنکھ میں بلیک اسپاٹ ہے؟

مجھے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ متذکرہ کتاب پڑھ کر مجھے پہلی دفعہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے پاکستان کے حصول کے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں اور میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر مجھے اس کا اندازہ نہیں تو میرے بچوں کو اس ملک کی قدر کیا محسوس ہوگی جنہیں اس ضمن میں سرے سے کچھ بتایا ہی نہیں گیا۔ میں جس کتاب کا ذکر کر رہا ہوں' یہ کسی باقاعدہ ادیب کی تحریر نہیں ہے چنانچہ فنی طور پر مایوس ادیبوں کی 1947ء پر لکھی گئی کہانیاں شاید ''متاع فقیر'' سے زیادہ موثر ہیں۔ مگر وہ کہانیاں ہیں' یہ حقیقت ہے۔ علاوہ ازیں میرے نزدیک متذکرہ کتاب قاری کو عظیم قومی مقاصد کے قریب لے جانے والی ہے۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں وہ تحریریں میرے نزدیک ٹائلٹ پیپر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جو کسی قوم کی آنکھوں سے اس کی منزل کو دور کرنے والی ہوں۔ میں اپنے بچوں کے نام پر' آپ کے بچوں کے نام پر ایف اے کا نصاب چاروں صوبوں میں مرتب کرنے والے ماہرین تعلیم سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کتاب کا ایک باب ایف اے اردو کے نصاب میں لازمی طور پر شامل کریں۔ ہمارے کچھ دانشور آج بھی پاکستان کو ایک ناکام ریاست قرار دیتے ہیں' چنانچہ ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اس قسم کی تحریروں سے بتائیں کہ پاکستان میں ایک عظیم ملک بننے کی کس درجہ صلاحیت اور قوت موجود ہے۔ اور اس مقصد کے لئے ہمارے درمیان قربانیاں دینے والے لوگ پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں!

آخر میں ''غیر ادیب'' چودھری سردار محمد کی ''متاع فقیر'' میں سے ایک اقتباس:

(شیخ غلام قادر ہمارے انگریزی کے استاد تھے' وہ ہمیں بلا معاوضہ گرمیوں اور کرسمس کی چھٹیوں میں پڑھاتے بلکہ پڑھائی کے دوران وقت گزر جاتا تو اپنے گھر سے کھانا بھی کھلاتے تھے) ایک دن ہم ان کے گھر پڑھنے کے لئے صبح صبح گئے تو معلوم ہوا ..... کہ رات کو ان کی جوان بیٹی جو تپ دق کی مریضہ تھی' کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور وہ اسے دفنانے گئے ہوئے ہیں۔ قبرستان ساتھ ہی

تھا' ہم نے سوچا ہم بھی قبرستان چلتے ہیں۔لیکن دیکھا تو ماسٹر جی کچھ اور لوگوں کے ساتھ واپس آ رہے ہیں۔ہم دبک کر بیٹھ گئے۔اور منہ رونا سا کر لیا۔ہم نے سوچا آج تو ضرور چھٹی مل جائے گی..... لیکن ماسٹر صاحب نے آتے ہی پڑھانا شروع کر دیا۔اور ہمیں افسوس بھی نہ کرنے دیا۔لوگ افسوس کے لئے آتے ہاتھ اٹھاتے' دعا ہوتی اور ان کے رخصت ہوتے ہی دوبارہ پڑھائی شروع ہو جاتی' ان کے ایک رشتہ دار انوار الحق افسوس کے لئے آئے تو دیکھا کہ ماسٹر انہماک کے ساتھ پڑھا رہے ہیں۔وہ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے ''غلام قادر آج تو چھٹی کر لیتے!''

''کیوں.....؟''

''تمہاری بیٹی فوت ہوئی ہے''

''اس بیٹی ہی کے لئے تو انہیں پڑھا رہا ہوں۔اس پڑھانے کا سب ثواب میں اسے بخش دوں گا۔''

اور یہ کہتے ہوئے ماسٹر جی رو پڑے۔

میں آج کا کالم ماسٹر غلام قادر اور اس کی آنکھوں کے سچے موتیوں کی طرح بہنے والے آنسوؤں کے نام کرتا ہوں!

◆◆◆

مین پھنے خان نہیں ہوں!

انسان اپنے آپ کو بڑا پھنے خاں سمجھتا تھا۔ مگر بیسویں صدی میں ہونیوالے چند انکشافات نے اس کی ساری پھنے خانی خاک میں ملادی۔ اوراس کے اندر جوایک گہری اداسی سرایت کرتی جارہی ہے' اس کی ایک وجہ ان انکشافات کی وجہ سے اس کی انا کو ٹھیس لگنا بھی ہے۔ جن کے مطابق اس کائنات میں انسان ایک بے مایہ مخلوق ہے۔ پہلا انکشاف جس نے انسان کو اس کی اوقات یاد دلائی ہے وہ یہ تھا کہ جس سیارے میں ہم رہتے ہیں اور جسے ہم کل کائنات کہتے ہیں' اس جیسے کھربوں سیارے اور بھی ہیں۔ اور یوں انسان کو احساس دلایا کہ اس کائنات میں اس کے کرۂ ارض کی حیثیت تو اس چرخا کاتنے والی بڑھیا جتنی بھی نہیں ہے جو عرصہ سے چاند پر دیکھتا چلا آرہا تھا اور جس کی بے بسی اور تنہائی کا وہ مذاق اڑاتا تھا۔

انسان کی انا کا دوسرا دھچکا فرائڈ کے نظریات کی صورت میں لگا جس نے شعور' تحت الشعور کے حوالوں سے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے والی اس مخلوق کی جبلی گھٹیا پن اور خود غرضیوں کا پردہ چاک کیا' انسان کو اس آئینے میں اپنی شکل نظر آئی تو وہ جھنجھلا اٹھا۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے ماضی کی طرح ایک بار پھر اپنی کمزوریوں کو اپنی طاقت کے مظاہرے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے نادانستہ طور پر فرائیڈ کے بیانات کی تصدیق کرتا چلا جارہا ہے:

اور انسان کی انا کے تابوت میں آخری کیل ڈارون کے متنازعہ نظریات نے ٹھونکی جس نے انسان کو بندر کی ارتقائی شکل قرار دے کر اس کے ''پدرم سلطان بود'' کہنے کے دروازے بند کر دیئے۔ ویسے یہاں بیچارے ڈارون کی تھوڑی سی صفائی دینا بھی ضروری ہے۔ اس کا نظریہ ارتقاء اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے جیسے ہمارے ہاں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے یا جیسے میں نے ایک جملے میں بیان کیا ہے اس بیچارے نے اس ارتقاء کے بیسیوں مراحل برس ہا برس کی محنت اور عرق ریزی کے بعد حاصل ہونے والی تحقیق کے نتیجے میں بیان کئے' تاہم اس کے بہت سے نتائج کو چیلنج کیا جارہا ہے اور یہ چیلنج بھی برس ہا برس کی تحقیق کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے' ہمارے ہاں کے مناظرہ بازوں کی طرح مضحکہ خیز اور طنزیہ جملوں سے نہیں۔!

میں بھی بیسویں صدی کا ایک عدد ''اشرف المخلوقات'' انسان تھا اگرچہ ان نظریات پر کام کرنے والے اسکالروں سے دور پاکستان میں رہتا تھا مگر ان نظریات کی زد مجھ پر بھی پڑی' تاہم اگر بطور انسان نہیں تو بطور پاکستانی میرے اندر اپنی بڑائی کا کیڑا

کلبلاتا رہتا تھا کہ ہم نے سارے نفع نقصان مصلحتیں اور خودغرضیاں بالائے طاق رکھتے ہوئے اور انگریز غاصب کے دبدبے اور اس کے پھیلائے ہوئے خوف و ہراس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے 1947ء میں دشمنوں کو پاکستان بنا کر دکھایا تھا اور یوں انسان کو گھٹیا مخلوق ثابت کرنے والے سب مغربی فلاسفروں اور اسکالروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا "بچو! ضروری نہیں کہ تمہارے سارے نظریے اور مفروضے ہر دور میں صحیح ثابت ہوں۔"

مگر سچ پوچھیں تو 12 اکتوبر کے بعد بطور انسان ہی نہیں بطور پاکستانی میری انا کو ٹھیس پہنچی ہے اور میں خود کو بہت حقیر سا محسوس کرنے لگا ہوں۔ ہمارے ہاں منتخب وزیراعظموں کو غیر قانونی طور پر برخاست کرنے کی روایت عام ہے' انہیں گرفتار کرنا بھی معمولی بات ہے اور انہیں پھانسی بھی لگا دیا جاتا ہے مگر بطور پاکستانی قلم کار میری انا اس لئے مجروح ہوئی کہ پاکستانی قلم کاروں کی اکثریت 12 اکتوبر سے پہلے معزول وزیراعظم کی قصیدہ گو تھی اور 12 اکتوبر کے بعد ہجو گو کے طور پر سامنے آئی۔ مجھے اس پر بھی حیرت نہیں کیوں کہ ماضی میں بھی ہوتا آیا ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ برے سے برے شخص میں کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور ہوتی ہے مگر ان ہجو گوؤں نے معزول وزیراعظم کی ایک سو برائیاں گنوائی ہیں' مگر 12 اکتوبر کے بعد ان کی کسی ایک خوبی کا بھی ذکر نہیں کیا' اس وزیر اعظم کی خوبیوں کا جس کے دونوں ادوار میں پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ اور دور رس ترقیاتی منصوبے عمل میں آئے اس کی ذات پر اتنا کیچڑ اچھالا گیا اور بری طرح اس کی کردار کشی کی گئی کہ اگر میں اس وزیراعظم کی جگہ ہوتا تو ایسے لوگوں کے لئے کبھی دوبارہ سیاست میں نہ آتا مجھے جس کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے کہا جاتا' اس کاغذ پر دستخط کر دیتا اور باقی زندگی پورے چین اور آرام کے ساتھ بسر کرتا۔ مگر یہ شخص نتائج سے بے پرواہ اور نفع و نقصان کی سوچ سے بالا ہو کر اپنے نظریے کی حفاظت کے لئے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے اور اس سلسلے کی آخری کڑی کے لئے بھی ذہنی طور پر تیار ہے۔ شاید یہ بھی اس کردار کی سینکڑوں خامیوں میں سے ایک خامی اور اس کے ناقابل معافی جرائم میں سے ایک جرم ہے۔

مگر دوستو' مجھے کسی دوسرے سے غرض نہیں' میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری انا کو ٹھیس لگی ہے اور یہ کہ میں ایک کمزور آدمی ہوں' بیسویں صدی کے مغربی مفکروں کے نظریات نے مجھے میری اوقات یاد دلائی تھی مگر ایک پاکستانی اور خاص طور پر ایک پاکستانی قلم کار کے طور پر میں پورے افتخار کے ساتھ زندہ تھا۔ میں اپنے آپ کو پھنے خان سمجھتا تھا مگر آج میں پوری شرمندگی سے اعلان کرتا ہوں کہ میں پھنے خاں نہیں ہوں۔ میں پھنے خاں نہیں ہوں۔ میں ایک حقیری مخلوق ہوں جسے جو چاہے اپنے پاؤں تلے روند کر آگے بڑھ سکتا ہے۔

◆◆◆

''دستور'' بھی ہے.....؟

میرے خیال میں عید یا کسی بھی خوشی کے موقع پر جلی کٹی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا' ہر موسم کے اپنے رنگ اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں' جب کہ ہم لوگ جنازوں میں لطیفے سناتے ہیں اور خوشی کے تہوار کو کاندھا دیتے نظر آتے ہیں!

گذشتہ عید کو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی' بہت افسردہ نظر آئے' میں نے سبب دریافت کیا تو کہنے لگے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

میں نے اس شعر کا موقع محل پوچھا تو اسی آزردگی سے فرمایا آج خوشی منانے کا نہیں رونے کا دن ہے میری اور تمہاری زندگیوں میں سے ایک عید اور کم ہوگئی! اس ملاقات میں انہوں نے فانی بدایونی کے بھی بہت سے شعر سنائے اور مجھے یوں لگا جیسے آدھ گھنٹے بعد قیامت آنے والی ہے!

میرے کچھ دوست ایسے بھی ہیں جنہیں لطیفہ صرف سنجیدہ ماحول میں یاد آتا ہے۔ ایک محفل میں موجود سیاسی صورتحال پر بہت گمبھیر قسم کی گفتگو ہو رہی تھی ہر شخص پریشان تھا ایک صاحب خصوصاً اس بات پر بہت بے چین تھے کہ اگر فوج سیاست میں الجھ گئی تو سرحدوں کا دفاع کون کرے گا' میرے اس دوست سے یہ سنجیدہ ماحول دیکھا نہ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے لب وا کئے تاہم ہم سب نے یہی سمجھا کہ وہ شاید حکومتی بیانات کا حوالہ دے گا جس میں مسلسل قوم کو یہ یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ حکومت سرحدوں کے دفاع کے سلسلے میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے' مگر اس نے اس انتہائی سنجیدہ ماحول میں بھی لطیفہ سنا ڈالا۔

ایک جہاز ہوا میں ہچکولے کھانے لگا تو مسافروں نے خوفزدہ ہو کر چیخیں مارنا شروع کر دیں' اس پر پائلٹ کی آواز مائک پر سنائی دی..... وہ کہہ رہا تھا۔ ''خواتین وحضرات گھبرانے کی کوئی بات نہیں' آپ پوری طرح محفوظ ہیں' آپ لوگ اپنا دھیان ہٹانے کے لیے کھڑکی سے باہر نظارہ کریں' آپ کو خوبصورت نیلا سمندر نظر آئے گا اور رنگ برنگی کشتیاں دکھائی دیں گی۔ ان میں سے لال رنگ کی کشتی پر نظر ڈالیں' میں اس کشتی میں سے بول رہا ہوں۔''

یہ پہلا موقع تھا جب اس سنجیدہ ماحول میں اس غیر سنجیدہ دخل در معقولات پر اس دوست کو سب نے مل کر باجماعت ''ٹھاپیں''

لگائیں!

یوں تو اس بار رمضان المبارک کا سارا مہینہ مفت ثواب کمانے کا مہینہ تھا کہ دن چھوٹے تھے اور موسم خوشگوار تھا' تاہم افطاریوں کی رونق اس پر مستزاد تھی۔ ڈیفنس لاہور میں تو تجمل حسین انجم نے ایک خوبصورت نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد کر ڈالا اس کے ساتھ افطار پارٹی بھی رکھ دی جس میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول اور میجر جنرل جاوید نے بھی شرکت کی۔ میجر جنرل جاوید تو باقاعدہ ''پکے پیٹھے'' شاعر نکلے جب کہ کور کمانڈر نہایت خوش گفتار اور ادب کے رسیا ثابت ہوئے' انہوں نے افطاری کے دوران راقم سے گفتگو میں صحافیوں کے ذمہ دارانہ طرز عمل کی بہت تعریف کی اور ساتھ یہ خوشخبری بھی سنائی کہ موجودہ حکومت میں آزادی اظہار کا حق صرف اخبارات ہی کو حاصل نہیں' یہ حق الیکٹرانک میڈیا کو بھی ملے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پاکستان کی تاریخ میں شاید پہلی دفعہ ہوگا!

پیشتر اس کے کہ آج کا کالم سنجیدہ ہو جائے کہ یہ مجھے سنجیدہ کی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ میں قارئین کو عید کی مبارکباد کہتا ہوں اور یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ عید والے دن سویاں کھاتے ہوئے کسی کو تصویر نہ کھینچنے دیں' خصوصاً غیر شادی شدہ لوگ یہ ''رسک'' نہ لیں کہ جہاں ان کے رشتے کی بات چل رہی ہو وہاں یہ تصویر بھیجی جا سکتی ہے اور احتیاطاً شادی شدہ حضرات بھی اس عمل سے گریز فرمائیں' خصوصاً وہ حضرات جو اسلام میں چار شادیوں کی اجازت کو' اجازت نہیں' حکم تصور کرتے ہیں اور پھر حکیموں سے کانوں میں سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرا دوسرا اور آخری مشورہ یہ ہے کہ عید پر عید ملنا' سنت ہے' فرض نہیں' لہٰذا اگر اپنی پسلی عزیز ہے تو عید اپنی پسلی کے آدمی سے ملیں' نیز یہ شعر بہت پرانا ہو گیا ہے۔

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی دستور بھی ہے

چنانچہ مطلب برآری کے لئے اس کی بجائے کوئی دوسرا شعر استعمال کریں' ویسے بھی عید کے موقع پر سیاسی گفتگو خصوصاً دستور وغیرہ کا ذکر میرے خیال میں مناسب نہیں ہے!

پس نوشت:

میں یہ کالم لکھ چکا تھا کہ ایک اخبار میں دو خبریں ساتھ ساتھ چھپی ہوئی نظر پڑیں' ایک خبر کی سرخی یہ تھی۔ ''نواز شریف لانڈھی جیل' آصف زرداری سنٹرل جیل اور فاروق ستار ملیر چھاؤنی میں عید منائیں گے'' دوسری خبر یہ ہے ''صدر رفیق تارڑ عید الفطر ایوان صدر منائیں گے''

یہ دونوں خبریں ایک جگہ لگانے والے ایڈیٹر کا تعلق میرے متذکرہ بالا دو مختلف رویوں کے حامل دوستوں میں سے کسی ایک دوست کے ساتھ لگتا ہے!

◆◆◆

جائیں گے "عید" کر کے!

بدقسمتی سے کچھ برسوں بعد میرا شمار بھی پرانی نسل میں ہونے والا ہے۔ مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پرانی اقدار پر ہر دور میں یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عرصے سے میں کچھ راز اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ ان رازوں پر سے پردہ آج تک اس لئے نہیں اٹھایا تھا کہ میں بھی پرانی وضع کے لوگوں کی طرح اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ دوسروں کے عیبوں کی بجائے اپنے عیبوں پر نظر ہونی چاہیے لیکن اب میں نے اپنی رائے پر نظر ثانی کر لی ہے جس کے نتیجے میں' میں اس خیال کا حامی ہو گیا ہوں کہ قومی مجرموں کے جرائم پر پردہ ڈالنا' ان کے جرم میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ میں ان لوگوں سے پیشگی معذرت خواہ ہوں جن کے بارے میں مجھے آج انکشاف کرنا ہیں' ان میں سے بیشتر کے ساتھ میرے تعلقات نیاز مندانہ ہیں' مگر میں سمجھتا ہوں جہاں معاملہ ملک وقوم کا ہو' وہاں ذاتی تعلقات کو حق گوئی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے!

نوابزادہ نصراللہ خاں کے لیے میرے دل میں بہت احترام ہے کہ وہ ہر دور میں جمہوریت کے قافلے کے سالار رہیں مگر ان جیسے بظاہر وضع دار سیاست دان کا دامن بھی کرپشن سے پاک نہیں ہے۔ موصوف کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی آبائی زمین بیچ کر سیاست کرتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں انکے مربعوں میں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس وقت یہ بزرگ سیاستدان ڈھائی سو مربع زمین کے مالک ہیں۔ جس کا بیشتر حصہ انہوں نے اپنے مختلف رشتہ داروں کے نام کیا ہوا ہے۔ اور اس زمین کی قیمت اربوں روپے ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد مفسر قرآن ہیں۔ ایک جماعت کے سربراہ ہیں۔ بظاہر درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ڈیڑھ کروڑ کی مالیت کی کوٹھی کلفٹن کراچی میں' ایک کنال کا قیمتی پلاٹ اسلام آباد اور دو کروڑ روپے کے حصص ایک معروف کمپنی میں ہیں۔

ایک دفعہ پھر معذرت کے ساتھ' قاضی حسین احمد سے اختلاف کے باوجود میرے دل میں اپنے نظریات کے ساتھ ثابت قدمی کے حوالے سے ان کے لیے بہت احترام ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی مشکوک ہیں۔ اور ان دنوں بعض حساس ادارے ان کے بارے میں منشیات کے حوالے سے تحقیق کے آخری مراحل میں ہیں۔

میرے دوست نوائے وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر سید ارشاد احمد عارف جو بظاہر سادگی کا مثالی نمونہ لگتے ہیں' کے بارے میں ایڈیٹر

نوائے وقت مجید نظامی صاحب کو لندن سے ایک قاری نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ اطلاع دی ہے کہ بکنگھم پیلس کے گرد و نواح میں وہ دو کروڑ پاونڈ کے ایک فلیٹ کے مالک ہیں جس میں دنیا کی ہر آسائش موجود ہے۔ ایڈیٹر نے ارشاد احمد عارف صاحب کو الزامات ثابت ہونے تک ان کے فرائض کی ادائیگی سے روک دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ درج بالا شخصیات پر لگائے گئے الزامات پر ہر محب وطن پاکستانی کو یقین آ گیا ہوگا اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب الزامات میرے ذہن کی اختراع ہیں اور یہی سچ ہے تو بہت سے لوگوں کو صدمہ ہوگا کہ کچھ عزت دار لوگوں کی عزت داغدار کرنے کا یہ زریں موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا گیا؟ اس رویئے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری عزت کو داؤ پر ہر دور میں عزت دار لوگوں ہی نے لگایا ہے۔ چنانچہ جب کبھی ان کی پگڑی اچھلتی ہے' ہم بے گناہ اور گناہ گار میں تمیز کئے بغیر دل میں ایک کمینی سی خوشی محسوس کرتے ہیں اور الزامات کو بغیر ثبوت یا عدالتی فیصلے کے آگے ہی آگے پھیلاتے جاتے ہیں اور یوں ان اجنبیوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں جنہوں نے الزام اور بہتان کی اس فضا کو لوگوں میں مایوسی پھیلانے' قیادت پر بے اعتمادی' قانون اور آئین کی توڑ پھوڑ اور اس نوع کے دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کر کے اپنی آمد یا اپنے موجودگی کا جواز تلاش کرنا ہوتا ہے۔ میں اگرچہ یہ واضح کر چکا ہوں کہ درج بالا سطور میں لگائے گئے الزامات بالکل من گھڑت ہیں مگر آپ یقین کریں کہ میری اس وضاحت تک پہنچنے سے پہلے ہی کچھ دوست یہ انکشاف لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہوں گے اور اب تک پورے ملک میں ان کا چرچا ہو رہا ہوگا اور اگر میرے دوست میرے ساتھ سازش میں شریک ہو کر میرے اس کالم کے الزامات والے حصے کو خبر بنا کر اپنے اخبارات میں ''مجرموں'' کی تصویروں اور چار چھ کالمی سرخیوں کے ساتھ شائع کر دیں اور میرے کالم نگار دوست اس کی حاشیہ آرائی کریں تو یہ معززین عمر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور کوئی مثبت کام کرنے کی بجائے اپنی بقیہ زندگی الزامات کی صفائی دینے میں بسر کر دیں۔

مجھے افسوس ہے کہ کالم کا آغاز میں' میں نے جو دھماکہ کیا تھا اور جس بے دردی سے جھوٹ بولا تھا اس پر قائم نہ رہ سکا حالانکہ

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

مگر افسوس میں کردار کا مظاہرہ نہ کر سکا' اصل میں میرا مقصد اپنے بھائیوں کی دلجوئی تھا جو میری طرح اس خیال کے حامی تھے کہ سیاستدان ملک کو لوٹ کر کھا گئے جب کہ صورت حال یہ ہے کہ نادہندگان میں سے سیاستدان بہت کم نکلے' اسی طرح جن لوگوں پر کرپشن کا الزام باقاعدہ عائد کیا گیا ہے یا اس سلسلے میں جن کے نام سامنے آ رہے ہیں (اور انہیں مجرم یا بے گناہ ابھی ثابت ہونا ہے)

وہ بھی بے حد کم رہ گئے ہیں' 117 پارلیمنٹ کے ارکان میں سے اگر بیس بائیس کرپٹ بھی ثابت ہو گئے تو بھی ہمارے مہذب ہونے کی دلیل ہے کہ جاپان' فرانس' انگلینڈ امریکہ اور اس طرح کے دوسرے ملکوں میں بھی اتنی ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں یہ کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اگر موٹروے پر کسی حادثے میں دس بارہ آدمی مارے بھی جائیں تو موٹروے بند نہیں کی جا سکتی' تاہم میں ان دلیلوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا' ہونا وہی ہے جو ہو رہا ہے' چنانچہ میں اس کالم میں اپنے ''انکشافات'' سے مکر کر مشکل میں پھنس گیا ہوں' میری خواہش ہے کہ کوئی جی دار دوست آگے آئے اور نہ صرف پرانے الزامات بلکہ جو نئے الزامات میں نے لگائے ہیں' انہیں بھی زیادہ سے زیادہ آگے پھیلائے تاکہ اس شور شرابے میں اس ایجنڈے پر پوری یکسوئی سے عمل درآمد ہو سکے۔ جس ایجنڈے پر عمل درآمد کے لئے کچھ اجنبی سات سمندر پار سے پاکستان تشریف لائے ہیں اور جن پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

سیماب اب وطن میں اتنا ہے آنا جانا
آتے ہیں عید کرنے' جائیں گے عید کر کے

◆◆◆

بابا اشفاق اور شرارتی منڈا!

عید کے دوسرے دن میں اپنے بیٹوں یاسر' عمر اور علی کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کو عید مبارک کہہ کر اشفاق اور بانو قدسیہ کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع رہائش گاہ داستاں سرائے گیا تو ''راجہ گدھ'' کی مصنفہ بانو آپا اپنے سفید بالوں پر اوڑھنی لئے دروازے میں نمودار ہوئیں' ان کے ہاتھ گندھے ہوئے آٹے سے بھرے ہوئے تھے' انہوں نے میرے لئے ڈارننگ روم کا دروازہ کھولا اور تھوڑی دیر بعد اشفاق احمد' سر پر اونی ٹوپی اور کمبل کی بکل مارے کمرے میں داخل ہوئے' وہ اپنے حلئے سے چیچنیا کے مجاہد لگ رہے تھے' انہوں نے آتے ہی ہیٹر جلایا اور اپنے مخصوص لہجے میں کہا ''سنا بھئی عطا' کتھے ہوناں ایں توں؟''

اس کے بعد ان کی دلچسپ گفتگو شروع ہوگئی ''تمہیں پتہ ہے افریقہ کے ایک قبیلے میں بزرگوں کو بہت خصوصی سلوک کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ وہاں جب کوئی شخص ستر برس سے زیادہ عمر کا ہو جاتا ہے تو ایک خصوصی تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں اس بزرگ کو ذبح کیا جاتا ہے اور پھر اس کی پٹھ اور ران وغیرہ کا پلاؤ بنایا جاتا ہے۔ قبیلے کے لوگ بابے کا پلاؤ بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور اسے باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔ بابے کی چانپیں وغیرہ علیحدہ بنائی جاتی ہیں اور سنا ہے اتنی مزے کی ہوتی ہیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔''

میں نے زندگی میں کئی مرتبہ اپنے پاکستانی ہونے پر دل میں فخر محسوس کیا تھا' مگر اشفاق کی گفتگو سن کر میں نے پہلی مرتبہ اپنے پاکستانی ہونے اور افریقی نہ ہونے پر خدا کا شکر بھی ادا کیا۔

اتنے میں بانو آپا ایک چھابے میں مکئی کی روٹی' اس پر ساگ اور ساگ پر مکھن کا پیڑا رکھے اندر داخل ہوئیں اور چھابا بابا اشفاق احمد کے سامنے دھری تپائی پر رکھ دیا۔ ''عطا' تیرے لئی میں لے کے آئی آں''

''نہیں آپا' میں کھانا کھا کے آیا ہوں' یہ آپ میرے لئے رکھ لیں' میں ساتھ لے کر جاؤں گا'' میں نے کہا۔

اشفاق احمد نے مکئی کی روٹی کے لقمہ میں ساگ اور مکھن کی کثیر مقدار سمیٹی اور نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ایک نیا قصہ چھیڑ دیا ''ہم لوگ کھانے پینے کے آداب بھی بھول گئے ہیں' ڈائننگ روم میں کرسی میز پر بیٹھ کر مولی یا گاجر کے قتلے سلاد کے طور پر کھاتے ہیں۔ یہ تو مولی کے ساتھ مذاق ہے۔ مولی کھانے کا مزا تو سردیوں میں چھت پر بیٹھ کر آتا ہے۔ جسم کو ہلکی ہلکی ٹکور کرنے والی دھوپ چمک رہی ہو'

آپ سالم مولی کے ساتھ براہ راست دانتوں سے نبرآزما ہوں' اور آپ کا ہمسایہ جس سے آپ تنگ ہیں' اپنی مرغی پکڑنے کے لئے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ رہا ہو اور چوتھے پانچویں ڈنڈے سے اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ واپس صحن میں جا گرے تو مولیاں کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے!''

اس گفتگو کے دوران ایک بارہ تیرہ سالہ ملازم نے میرے سامنے والی میز کھانے پینے کی چیزوں سے بھر دی تھی مگر صبح سے اس طرح کی چیزیں چکھتے چکھتے ان کی طرف اب دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ اشیائے خوردونوش لانے والے بچے نے ٹانگی کی ٹی شرٹ اور جین پہنی ہوئی تھی اور وہ اپنے عمدہ لباس سے بالکل ملازم نہیں لگتا تھا' اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اگر کسی بچے کو اپنے گھر ملازم رکھیں تو اسے ملازموں کی طرح تو نہیں رکھیں گے!

اشفاق احمد کو حالات حاضرہ سے بھی دل چسپی ہوتی ہے تاہم اس دل چسپی کی نوعیت تقریباً اکیڈمک رہی ہے۔

''میں اپنی فوج کے معاملے میں بہت قدامت پسند ہوں'' اشفاق احمد نے ساگ کی پلیٹ کو آخری نوالے سے اچھی طرح صاف کرتے ہوئے کہا'' مجھے میدان جنگ میں اس کی مردانگی اور گھر میں اس کی عزت اپنی بہو بیٹیوں کی طرح عزیز ہے اور جس طرح ہمارے قدامت پسند بزرگ چاہتے ہیں کہ ان کی بہو بیٹیاں اپنے گھر کی حدود سے باہر قدم نہ رکھیں تاکہ کسی کو بات کرنے یا انہیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہ ہو اسی طرح میں بھی اپنی پیاری فوج کی عزت کرتا ہوں اور حرمت برقرار رکھنے کے لئے اسے اس کی حدود میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میرے خیال میں موجودہ صورت حال پر اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں تھا اس دوران بانو آپا میرے لئے ساگ' مکئی کی روٹی اور مکھن بڑی عمدہ پیکنگ کے ساتھ لے آئی تھیں۔ میں نے ان سے اجازت چاہی اور جاتے جاتے دروازے پر رک کر اشفاق احمد کو مخاطب کیا اور پوچھا'' آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ہمارے ہاں ستر برس سے زائد عمر کے سیاست دان کتنی تعداد میں ہوں گے' نیز یہ کہ کیا ان میں سے کوئی جانے کا خواہش مند ہے؟''

مگر اشفاق احمد نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے بانو آپا کو مخاطب کیا اور ہنستے ہوئے کہا۔

''اے منڈا اشرار تی اے!''

اور میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا کہ میں اشفاق صاحب کے پاس اپنے لئے یہ لفظ ''منڈا'' ہی سننے کے لئے جاتا ہوں' وہ سمجھتے ہیں میں دانشورانہ دلچسپ گفتگو کے چسکے میں ان کے پاس آتا ہوں!

◆◆◆

لٹ کے کھا گئے!

میں نے اپنے تیس بتیس سالہ کالم نگاری کے عرصے میں متعدد پیشین گوئیاں کیں جن میں سے بیشتر صحیح اور چند غلط ثابت ہوئیں۔ جن پیشین گوئیوں نے میری لاج رکھی' ان کے صحیح ثابت ہونے میں کچھ وقت ضرور لگا تاہم اپنے گذشتہ کالم ''آئے ہیں عید کرنے' جائیں گے عید کر کے'' (12 جنوری) میں' میں نے جو پیشین گوئی کی' وہ کالم شائع ہونے کے چند گھنٹوں بعد ہی سچ ثابت ہوگئی چنانچہ اب اگر کبھی کالم نگاری گھاٹے کا سودا محسوس ہوا تو میرے لیے پیر پگارا والا دھندا شروع کرنا مشکل نہ ہوگا۔ ویسے بھی میرا تعلق پیروں کے خاندان سے ہے اور اس کے علاوہ باقاعدہ ''پروفیسر'' بھی ہوں چنانچہ گذشتہ روز سے مجھے اپنا مستقبل خاصا روشن محسوس ہونے لگا ہے۔

میں نے اپنے کالم کے آغاز میں نواب زادہ نصر اللہ خاں' قاضی حسین احمد' ڈاکٹر اسرار احمد پر ''کرپشن'' کے نہایت مضحکہ خیز قسم کے ''الزامات'' لگائے۔ الزامات کی نوعیت اس قدر بے ہودہ تھی کہ کوئی عقل سلیم رکھنے والا شخص پہلی نظر ہی میں رد کر دے۔ اس کے بعد میں نے لکھا ''اب اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب الزامات میرے ذہن کی اختراع ہیں (اور یہ سچ ہے) تو بہت سے لوگوں کو صدمہ ہوگا کہ کچھ عزت دار لوگوں کی عزت داغدار ہونے کا یہ زریں موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیا گیا؟ جب کبھی کسی عزت کی پگڑی اچھلتی ہے ہم بے گناہ اور گناہ گار میں تمیز کئے بغیر دل میں ایک کمینی خوشی محسوس کرتے ہیں اور الزامات کو بغیر ثبوت یا عدالتی فیصلے کے آگے ہی آگے پھیلاتے جاتے ہیں اور یوں ان اجنبیوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ جنہوں نے الزام اور بہتان کی اس فضا کو لوگوں میں مایوسی پھیلانے' قیادت پر بے اعتمادی' قانون اور آئین کی توڑ پھوڑ اور اس نوع کے دوسرے مقاصد کے لئے استعمال کر کے اپنی آمد یا اپنی موجودگی کا جواز تلاش کرنا ہوتا ہے۔'' میری ان سطور کے بعد میرا مدعا عقل سلیم ہی نہیں' خشخاش کے دانے کے برابر عقل رکھنے والے کو بھی سمجھ آ گیا ہوگا کہ میں یہ کالم کردار کشی کی موجودہ فضا کے خلاف لکھ رہا ہوں یہ فضا جس مقصد کے لئے پیدا کی ہے' میں نے وہ مقصد بھی بیان کر دیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا اور میرے قارئین نے مجھے فون پر مبارک باد کہی اور اس سلسلے میں مزید کالم لکھنے کے لئے کہا!

لیکن میں تو ذکر کر رہا تھا۔ اپنی پیش گوئی کے چند گھنٹوں کے اندر اندر درست ثابت ہونے کا اور اس کالم میں وہ پیش گوئی میں نے ان لفظوں میں کی تھی ''میں اگرچہ یہ واضح کر چکا ہوں کہ درج بالا سطور میں لگائے گئے الزامات بالکل من گھڑت ہیں مگر آپ یقین کریں

کہ میری اس وضاحت تک پہنچنے سے پہلے ہی کچھ دوست یہ انکشافات لے کر گھر سے نکل چکے ہونگے اور اب تک پورے ملک میں ان کا چرچہ ہو رہا ہوگا'' اور آپ یقین کریں بالکل ویسے ہی ہوا میں نے یہ پیش گوئی اپنے سارے قارئین نہیں' چند قارئین کے بارے میں کی تھی اور واقعی چند لوگوں نے بالکل وہی کیا جس کی پیش گوئی میں نے کی تھی۔

سویرے سویرے مجھے فون موصول ہوا'' قاسمی صاحب آپ نے لوگوں کو ایکسپوز کر کے بہت بڑا جہاد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔''

یہ سن کر بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے ان سے پوچھا'' آپ نے میرا پورا کالم پڑھا ہے'' کہنے لگے'' نہیں ایک دوست نے مجھے فون پر اس کا ابتدائیہ پڑھ کر سنایا ہے'' اس پر میں نے کہا'' اور آپ نے بغیر پرکھے' بغیر تصدیق کئے' حتیٰ کہ بغیر پوری بات پڑھے' اس پر یقین بھی کر لیا اور میری ایک مقصد کے تحت کی گئی بے بنیاد الزام تراشی کو آپ نے جہاد کے زمرے میں بھی شامل کر لیا۔ اس غیر ذمہ داری پر آپ کو قیامت کے روز خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

یہ باتیں اپنی جگہ تاہم میرے اس'' زود اثر'' کالم سے بہر حال یہ بات ایک بار پھر ثابت ہوگئی کہ کوئی بھی شخص کسی بھی شخص پر کوئی الزام لگائے' ہم اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے پہلے تیار بیٹھے ہوتے ہیں' خواہ اس نے اپنے اگلے ہی سانس میں ان الزامات کو خود ہی لغو اور بے بنیاد ہی کیوں نہ قرار دیا ہو' ہم تو وہ لوگ ہیں کہ ایک سنے سنائے الزام پر گوجرانوالہ کے حافظ قرآن کو تلاوت کے دوران جلا دیتے ہیں اور پھر اس کی لاش کو موٹر سائیکل کے پیچھے باندھ کر پورے شہر میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اس وقت بہت سے سیاسی لوگ بغیر کسی مقدمے کے اور بغیر کسی الزام کے جیلوں میں بند ہیں یا انہیں کسی نامعلوم مقام پر بغیر کسی مقدمے کے قید رکھا گیا ہے۔ اس عالم میں ان پر گھناؤنے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور پھیلائے جا رہے ہیں اور یہ کام دین کی علمبردار بعض جماعتیں بھی کر رہی ہیں حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ سنے سنائے الزام کو آگے پھیلائے۔

پیارے قارئین!'' لٹ کے کھا گئے'' کا نعرہ بہت پرکشش ہے' مگر یہ خود دیکھیں کہ کہیں یہ نعرہ لگانے والے نعرہ کے پس پردہ ہمارے مزید لٹنے کی پلاننگ تو نہیں کر رہے؟

◆◆◆

ایم اے پی ایچ ڈی واشنگٹن

لاہور کے ایک افسانہ نگار' جواب مرحوم ہو چکے ہیں ان کی شخصیت سادگی و پرکاری کا بہترین امتزاج تھی' زندگی کے عام معاملات میں بھی بے حد بھولے بھالے' لیکن جس کام میں ان کا فائدہ ہوتا اس میں ان سے زیادہ تیز وطرار کوئی نہ تھا۔ وہ معمول کی گفتگو بھی حیرت انگیز سرگوشی کے انداز میں کرتے تھے' ایک دن مجھے سرراہ مل گئے' ان کے افسانوں کا ایک تازہ مجموعہ چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا' میں نے پوچھا (فرض کریں ان کا نام عبدالرزاق تھا) ''رزاق صاحب آپ کی نئی کتاب کیسی جا رہی ہے؟'' اپنی حیرت آمیز سرگوشی میں بولے ''قاسمی صاحب! اللہ کا بڑا کرم ہے' ابھی کل ہی پاگل خانے سے پچیس کتابوں کا آرڈر آیا ہے!'' اس جواب پر میرے لئے ہنسی کنٹرول کرنا دشوار ہو گیا۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور کہا ''حیرت ہے' جیسی کتاب ہے' پاگل خانے سے آرڈر اس سے زیادہ آنا چاہیے تھا'' انہوں نے میرے ریمارکس کو تعریفی سمجھا اور خوش ہوئے۔ ایک ماہ بعد پھر ان سے اس طرح راہ چلتے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے لئے کوئی اور موضوع نہ ملا تھا۔ میں حال احوال دریافت کرنے کے بعد پھر کتاب کی فروخت کی بابت پوچھ بیٹھا۔ اس دفعہ ان کے لہجے میں حیرت کے علاوہ جوش وخروش بھی تھا۔ خوشی اور سرگوشی کے عالم میں بولے ''قاسمی صاحب! آپ حیران ہوں گے اس دفعہ پاگل خانے سے پچاس کتابوں کا آرڈر آیا ہے'' میں نے اپنی ہنسی کو اپنی کھانسی میں روکنے کی کوشش کی' جس میں شاید بہت کم کامیاب ہوا مگر ان کے چہرے سے کسی ناراضی کا اظہار نہ ہوا۔ میرا جی ان سے پوچھنے کو چاہتا تھا کہ پاگل ان کی کتابیں پڑھتے ہیں یا کھاتے ہیں۔ مگر پوچھ نہ سکا' البتہ میں نے امجد اسلام کو یہ سارا واقعہ سنایا تو اس نے کہا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو' کوئی رائٹر اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ اپنی کتاب کا مذاق اڑائے'' میں کہا ''رزاق صاحب اپنی کتاب کا مذاق کہاں اڑاتے ہیں' وہ تو اسے اپنی کتاب کی مقبولیت کا ثبوت سمجھتے ہیں'' مگر امجد نے میری بات کا یقین نہیں کیا! ایک روز امجد ٹی ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے کہ سامنے سے رزاق صاحب آتے دکھائی دیئے' وہ سیدھے ہماری طرف آئے اور پیشتر اس کے کہ ان سے علیک سلیک ہوتی' مجھے مخاطب کر کے اپنے مخصوص حیرت اور سرگوشی کے لہجے میں کہنے لگے۔ ''قاسمی صاحب' کمال ہو گیا' پاگل خانے سے کتابوں کی کئی آرڈر اور آئے ہیں'' ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ امجد نے وہاں سے دوڑ لگا دی اور ٹی ہاؤس کے برابر کھوکھے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگا۔

رزاق صاحب ایک دفعہ تین ماہ کے لئے امریکہ گئے۔ واپس آئے تو میں دروازے پر ان کی نیم پلیٹ دیکھ کر چونکا' لکھا ہوا تھا ''ڈاکٹر عبدالرزاق ایم اے پی ایچ ڈی واشنگٹن'' یہ نیم پلیٹ تھی جس میں ''ڈاکٹر عبدالرزاق' ایم اے' پی ایچ ڈی' واشنگٹن'' کا اضافہ تھا۔ رزاق صاحب بڑی متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے فوراً چائے اور دیگر لوازمات کا آرڈر دیا' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے رزاق صاحب کو مخاطب کیا اور سنجیدگی سے پوچھا۔ ''رزاق صاحب! یہ پی ایچ ڈی کی ڈگری آپ کو واشنگٹن میں کتنے ڈالر میں ملی؟'' اس پر انہیں جھٹکا سا لگا اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا' بولے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' وہاں کی یونیورسٹی نے یہ ڈگری میری ادبی خدمات اور عالمی امن کے قیام کے موضوع پر لکھے میرے ایک مقالے پر دی ہے۔'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے قیمت اس لئے پوچھی تھی کہ لندن میں اسی یونیورسٹی کی ڈگری خاصے سستے داموں مل جاتی ہے اور ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر منگوائی جا سکتی ہے۔''

اور یہ حقیقت بھی تھی' لندن میں جن صاحب کے پاس اس امریکی یونیورسٹی ایم اے' ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈگریوں کی ایجنسی تھی وہ پاکستانی تھے' لندن میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ ''آپ نے کل واپس پاکستان چلے جانا ہے ورنہ آپ کے اعزاز میں کوئی محفل ہی منعقد کرتے۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا' بہرحال بلاتکلف فرمائیں' اگر آپ کو امریکی یونیورسٹی (اس یونیورسٹی کا کوئی بھلا سا نام ہے) کی کوئی ڈگری درکار ہو تو پیش کروں' اسے تحفہ درویش سمجھ کر قبول فرمائیں!''

اسی پس منظر میں میں نے رزاق صاحب سے ان کی ڈگری کی قیمت پوچھی مگر وہ آخر دم تک بضد رہے کہ یونیورسٹی نے یہ ڈگری ان کی ادبی اور عالمی امن کے قیام پر لکھے ان کے مقالے پر دی ہے۔ قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب یہ ڈگری امریکہ اور انگلینڈ کے علاوہ کراچی کے ایک پٹرول پمپ سے بھی مل جاتی ہے (اور ہمارے کئی ''ڈاکٹر'' اس سے استفادہ فرما چکے ہیں)

رزاق صاحب کے ساتھ ان کی ڈگری پر ہونے والی میری گفتگو کے ایک ہفتے بعد کا واقعہ ہے' میرے گھر کی گھنٹی بجی' میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رزاق صاحب کھڑے تھے۔ مجھے یہ شخص اپنی معصومیت اور سادہ لوحی کی وجہ سے اچھا لگتا تھا' باقی رہی اس کی ''پرکاری'' تو اس سے کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچا تھا۔ چنانچہ میں نے پوری خوشدلی سے انہیں اندر بیٹھنے کے لئے کہا' مگر وہ دروازے ہی پر کھڑے رہے' چہرے سے کچھ غمگین اور اداس لگتے تھے۔ بولے ''میں بیٹھوں گا نہیں' میں صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ اگر پاکستان کی کوئی یونیورسٹی میری ادبی خدمات پر مجھے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری نہیں دیتی تو میں یہ ڈگری بازار سے کیوں نہ خریدوں' مجھے اپنی عزت چاہیے' تم لوگ تو میرے مرے کے بعد کرو گے!''

اگلے روز ناشتے کے دوران اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر سنگل کالمی سرخی پر رک گئی۔ لکھا تھا ''افسانہ نگار ڈاکٹر عبدالرزاق ایم اے پی ایچ ڈی واشنگٹن حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے!''

◆◆◆

نمازوں کے پیچھے کیا ہے؟

آج بیٹھے بٹھائے ایک الٹا سوال ذہن میں آیا ہے جس کا جواب علمائے کرام ہی دے سکتے ہیں!

گزشتہ چند برس سے میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے شرکاء میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اب یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ حج کے بعد اپنے شرکاء کی تعداد کے لحاظ سے اسے مسلمانوں کا دوسرا بڑا اجتماع قرار دیا جا سکتا ہے' اس اجتماع کے آخری دن ہونے والی دعا میں لاکھوں دوسرے مسلمانوں کے علاوہ صاحبان اقتدار اور سبز پگڑیوں والی دعوت اسلامی' مالاکنڈ میں صوفی محمد اور لشکر طیبہ کے لاکھوں کے اجتماع میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ ہم پاکستانیوں کا رجحان مذہب کی طرف دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے ہر سال عمرے کے لئے جانے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں مسجدیں لبالب بھری ہوتی ہیں' تراویح اور شبینہ میں لوگ ساری ساری رات خدا کی عبادت کرتے ہیں اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کی ماڈرن کلاس بھی انگریزی اصطلاحات کا لبادہ اوڑھ کر ہی سہی' تصوف اور مراقبوں وغیرہ کی طرف مائل ہو رہی ہے' پیری مریدی اور تعویذ گنڈوں کا سلسلہ بھی پہلے سے زیادہ نظر آتا ہے۔

ان امور کے علاوہ ایک اور چیز جو دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ جو کوئی دوست مجھے چند برسوں بعد ملتا ہے اس کے چہرے پر لمبی داڑھی ہوتی ہے۔ مونچھیں منڈی ہوتی ہیں۔ جو دوست اس حلئے میں نظر آتا ہے ان میں بیشتر اندر سے بدل چکے ہوتے ہیں اور ان کی زندگیوں میں نماز روزے کی پابندی شامل ہو چکی ہوتی ہے۔

میں نے اوپر کی سطور میں جن لوگوں کا احوال بیان کیا ہے۔ ان کا تعلق کسی ایک طبقے سے نہیں بلکہ طبقوں سے ہے چنانچہ ان میں تاجر' سیاست دان' جرنیل' صاحبان اقتدار' پروفیسر' وکیل' جج' افسر' کلرک' چپڑاسی' معمولی دکان دار' سبھی شامل ہیں۔

لیکن جو سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کی طرف رجحان کا یہ عمل مرحوم ضیاء الحق کے دور سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد کے ادوار سے ہوتا ہوا آج اپنے عروج پر پہنچا نظر آتا ہے' آج یہ اپنے تکمیلی مراحل میں ہے۔ جو لوگ مذہب کی طرف راغب ہو رہے ہیں' ان کی ایک بڑی تعداد کی زندگیوں میں سوائے عبادت اور حلئے کے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی جو ظالم صنعت

کار ہے' اس کا اپنے مزدوروں کے ساتھ رویہ ظالمانہ ہی رہتا ہے' راشی افسر رشوت لینا بند نہیں کرتا مزدور اپنا فرض دیانتداری سے ادا نہیں کرتا' سیاست دان جن میں مذہبی غیر مذہبی ہر طرح کے سیاست دان شامل ہیں۔ دھوکہ دہی کی سیاست جاری رکھتے ہیں۔ صاحبان اقتدار کے رویے بقول اقبال طریق کوہ کن میں بھی ''پرویزی'' ہی رہتے ہی۔ وکیل جج' پروفیسر سبھی اپنی ڈگر پہ چلتے ہیں۔ آخر مذہب کی یہ کون سی شکل ہے جو ہمارے ہاں پروان چڑھ رہی ہے جس میں عبادت مسجد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جب کہ مسجد صرف سجدہ گاہ ہے' اس کے باہر ساری دنیا عبادت گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔ کیا ہم نے کہیں یہ تو نہیں سمجھ لیا کہ خدا ہماری نماز' دعا اور روزہ کا محتاج ہے اور اسے ہمارے باقی اعمال سے کوئی سروکار نہیں یا کہیں ہم رشوت لینے اور دینے کے اتنے عادی تو نہیں ہو گئے کہ خدا کو بھی اپنے سطح پر لانے کی کوشش کرنے لگے ہیں؟ یا کہیں ہمارا مجرم ضمیر اپنے بچاؤ کے لئے مذہب کے بجائے مذہب کے شارٹ کٹ کی طرف تو نہیں لے جا رہا؟ دین اسلام تو نفس کی قربانی مانگتا ہے جو شاید سب سے مشکل کام ہے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

نماز صرف پڑھنے کی چیز نہیں' نماز ''قائم'' کرنے کے لئے ہے۔ علماء سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا امت نمازوں کی طرف جا رہی ہے یا اس کی سمت کوئی اور ہے؟ اور اگر ہمارا معاشرہ واقعی اتنا مذہبی ہو گیا ہے تو پھر جو کچھ ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں' وہ سب کیا ہے؟

◆◆◆

توں کون تے میں کون؟

عوامی تحریک کے علامہ ڈاکٹر پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اپنے ایک بیان میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ تین ماہ میں ملک کے اندر ہونے والی دہشت گردی کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور اگر حکومت سی ٹی بی ٹی پر دستخط نہ کرنے کا وعدہ کرے تو وہ پاکستان کے سارے قرضے بھی ادا کر دیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک پروفیسر طاہر القادری واحد راہنما ہیں جنہوں نے پاکستان کے دو سب سے بڑے مسائل حل کرنے کا شرطیہ وعدہ کیا ہے ورنہ اس سے پہلے تو ہمارے رہنما محض باتیں ہی کیا کرتے ہیں یا باتیں بناتے رہے ہیں' اب حکومت اور عوام کا فرض ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی کے راستے میں پروفیسر صاحب کو جو رکاوٹیں درپیش آسکتی ہیں وہ انہیں فوری طور پر دور کریں۔ دہشت گردی کو تین ماہ میں ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ حکومت جنرل پرویز مشرف کے پاس ہے' پروفیسر طاہر القادری کے پاس نہیں اور ظاہر ہے دہشت گردی وعظ و نصیحت سے نہیں' حکومتی اختیارات ہی سے ختم کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ جنرل صاحب سے درخواست ہے کہ وہ تین ماہ کے لئے اقتدار پروفیسر صاحب کے حوالے کر دیں لیکن اقتدار چونکہ قومی امانت ہے چنانچہ اگر تین ماہ بعد خدانخواستہ پروفیسر صاحب امانت واپس لوٹانے میں حیل وحجت سے کام لیں تو جنرل صاحب سری لنکا کا ایک دورہ رکھ لیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وزیر داخلہ جنرل (ر) معین الدین حیدر وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر اپنی کرسی پروفیسر صاحب کے سپرد کریں' وہ پہلے بھی کراچی کے ممنون صاحب کو اس ضمن میں ممنون فرما چکے ہیں' اب لاہور کے پروفیسر طاہر القادری صاحب کے لئے کرسی کی یہ قربانی وقت کا تقاضا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پروفیسر صاحب کے لئے یہ منصب' ان کے منصب سے فروتر ہے چنانچہ میں پروفیسر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے مقام اور مرتبے سے بہت کم تر یہ ذمہ داری محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے قبول فرمائیں۔ تین ماہ میں دہشت گردی کے خاتمے کی تیسری صورت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب چونکہ کسی کا احسان اٹھانے والے نہیں ہیں چنانچہ وہ خیرات میں ملنے والا کسی بھی سطح کا اقتدار قبول نہ فرمائیں' چنانچہ اس کے لئے انہیں انتخابات کا انتظار کرنا چاہیے' مگر ایک چھوٹی سی پرابلم اس میں بھی ہے کہ جن انتخابات کے نتائج علمائے اسلام کی شرمندگی اور ندامت کا باعث بنتے رہے ہوں' ان میں حصہ لینا' کم از کم میرے نزدیک اگر حرام نہیں' تو مکروہ ضرور ہے' یہی وجہ ہے کہ اب ہماری مذہبی جماعتیں انتخابات میں کامیاب ہونے والوں کو

ان نگاہوں سے دیکھتی ہیں جن نگاہوں سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے مردوں کو دیکھا جاتا ہے۔

چوتھا راستہ انقلاب کا رہ جاتا ہے' پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے نام کے ساتھ ویسے بھی ایک عرصے سے ''قائد انقلاب'' لکھا جاتا ہے۔ انقلاب موجود ہیں مگر اس کے باوجود وہ انقلاب کو کان سے پکڑ کر قائد انقلاب کی خدمت میں پیش نہیں کرتے' اگر عوام اپنی یہ نالائقی چھوڑیں تو پروفیسر صاحب اگلے ہی دن پاکستان کے ''چیف ایگزیکٹو'' بن سکتے ہیں' جس کے تین ماہ بعد ملک سے موجودہ دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ایک نئی قسم کی دہشت گردی کا آغاز ہو گا تاہم اسے دہشت گردی کہنا مناسب نہیں' اسے سرکاری میڈیا' گڈ گورننس کا نام دے گی۔ باقی رہا پروفیسر کا یہ اعلان کہ اگر حکومت سی ٹی بی ٹی پر دست خط نہ کرے تو پاکستان کے سارے قرضے اتار دیں گے تو اس اعلان میں تو غالباً اقتدار کی بھی کوئی شرط نہیں ہے جس سے پروفیسر صاحب کی بے لوثی کا اندازہ ہوتا ہے' کیونکہ انہوں نے اشارہ دیا ہے کہ وہ یہ قرضے بیرون ملک اپنے عقیدت مندوں کے تعاون سے اتار دیں گے۔ اس ضمن میں اگر حسن ظن سے کام نہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب کو اس سلسلے میں ممکن ہے' بشارت ہوئی ہو۔ لہٰذا ارباب حکومت سے درخواست ہے کہ وہ اپنی حکومت جانے کے خوف سے سی ٹی بی ٹی پر دستخط نہ کریں' ایک مہینے میں پاکستان کے سارے قرضے اتر جائیں گے کیونکہ میں نے بھی جہاد میں پروفیسر صاحب کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا ہے' دنیا کے مختلف ملکوں میں میرے بھی کچھ جاننے والے ہیں' چنانچہ میرے ایک اشارے پر اللہ نے چاہا تو بیس پچاس ہزار روپے چشم زدن میں اکٹھے ہو جائیں گے' باقی صرف تیس ارب ڈالر کی حقیر سے رقم رہ جائے گی' اس کا انتظام پروفیسر صاحب کر دیں گے' پھر حکومت امریکہ کو آنکھیں دکھا سکتی ہے بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہے کہ ''توں کون تے میں کون؟'' موجودہ حکومت میں اگر کوئی ''دیسی'' شخص موجود ہو جو انگریزی کے علاوہ اردو اور پنجابی بھی بول سکتا ہو یا سمجھ سکتا ہو' وہ حکمرانوں کے لئے اس محاورے کا ترجمہ کر سکتا ہے''

◆◆◆

خدا تیرا شکر ہے.....!

مجھے خود سمجھ نہیں آتی کہ مجھے جانوروں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے' ایک نقاد نے میرے کالموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کالموں میں پورا چڑیا گھر آباد ہے!

یہ غالباً اس دلچسپی ہی کی وجہ ہے کہ مجھے ٹی وی چینلز سے DISCOVERY اور NATIONAL GEOGRAPHIC خصوصی طور پر پسند ہیں۔ آج صبح ہی ناشتے کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک دریا میں بیسیوں زیبرے سخت خوفزدگی کے عالم میں کنارے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسرے کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور یہ سب اس مگرمچھ سے خوفزدہ ہیں جو ان پر حملہ آور ہے۔ بال آخر یہ مگرمچھ ان میں سے ایک کو قابو کر لیتا ہے اور اسے جبڑے میں دبائے پانی میں گھسیٹتا ہوا کنارے کی طرف لے جاتا ہے۔ زندہ بچ جانے والے زیبرے دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے یہ منظر خاموشی سے دیکھتے ہیں اور شاید دل میں شکر ادا کر رہے ہیں کہ ان کی جان بچ گئی..... حالانکہ بنکاک کے ایک مگرمچھ فارم میں ہونے والے شو میں' میں نے انہی مگرمچھوں کی درگت دبلے پتلے لڑکوں کے ہاتھوں بنتے دیکھی تھے جو انہیں دم سے گھسیٹتے ہوئے تماشائیوں کے مجمع کے سامنے لاتے تھے' پھر انہیں ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے مشتعل کرنے کی کوشش کرتے تھے' جس کے نتیجے میں یہ مگرمچھ اپنا بھاڑ جیسا منہ کھولتے اور یہ لڑکے اپنا سر ان کے نوکیلے دانتوں والے جبڑے کے درمیان میں رکھ دیتے اور معصوم زیبروں کے سامنے پھنے خان بننے والے ان مگرمچھوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ ان چار فٹ کے لڑکوں کو ہڑپ کر سکتے!

اسی طرح چند روز قبل میں نے اسی ٹی وی چینل پر دیکھا کہ چند شیر ایک گائے کا شکار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس گائے کا وزن ایک ہزار کلو ہے۔ شیروں کی کوشش یہ ہے کہ وہ اس پر پیچھے سے حملہ آور ہوں کیونکہ سامنے سے حملہ آور ہونے کی صورت میں گائے کے خوفناک سینگ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ گائے پیچھے سے حملہ آور ہونے کا مقابلہ بھی ٹانگوں سے اور کبھی گردن موڑ کر سینگوں سے کرتی ہے۔ مگر بال آخر ان میں سے ایک تجربہ کار شیر اسے پیچھے سے جھپا مار لیتا ہے اور باقی شیر اس کی ایک ایک ٹانگ دبوچ کر اس گائے کو گرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ گائے اپنی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ غلط حکمت عملی کی وجہ سے شیروں کا نوالہ بنی۔ کیوں کہ ان سے بچ نکلنے کے بعد اس نے بھاگتے وقت اپنا رخ پھر اس طرف پھیر لیا تھا

جدھر شیر پہلے سے اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے جب کہ اسی طرح کی فلم میں' میں نے ایک بارہ سنگھے کو دیکھا تھا جس پر دو شیر حملہ آور ہوئے مگر اس نے دونوں کو ایک ایک کر کے بھگا دیا!

مگر یہ سوچ مجھے متذکرہ سب المیوں سے کہیں زیادہ مضطرب رکھتی ہے کہ پاکستانی قوم کو بھی اپنی قوت پر اعتماد کیوں نہیں ہے اور ہم ایٹمی قوت بھی بن گئے ہیں ہمیں یقین کیوں نہیں آ رہا کہ ہم ایٹمی قوت ہیں؟ ہمیں مایوس کرنے والوں لوگ کون ہیں' ہماری نسلوں کو کس نے اپنے پاس گروی رکھا ہوا ہے' ہمارے خواب کون چرا کر لے جاتا ہے اور ہماری آنکھوں کو ویران کرنے والا کون ہے؟

غالباً ہم میں سے ہر ایک کے پاس ان سوالوں کا جواب موجود ہے مگر ہماری زبانیں گنگ ہیں' ہم دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے سہمے ہوئے زیبرے ہیں اور خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ ہم مگرمچھ کا نوالہ بننے سے بچ گئے! ہم وہ باغیرت فرزند ہیں جو پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بھاگتا جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ بولا پچھلے چوک میں والد صاحب کو جوتے پڑ رہے ہیں' میں بڑی مشکل سے اپنی عزت بچا کر بھاگا ہوں۔

◆◆◆

آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے.....؟

میں نے ماڈل ٹاؤن میں ایک رکشے والے کو ہاتھ دیا' اس نے رکشہ میرے اتنے برابر لا کھڑا کیا کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں شامل ہوتے ہوتے بچے۔ میں نے پوچھا۔ ''اقبال ٹاؤن جانا ہے' کتنے پیسے؟''

بولا ''جو مرضی دے دینا بادشاہو!'' پیشکش تو بہت فراخدلانہ تھی لیکن مجھے اس کا انجام پتہ تھا۔ اس وقت یہ مجھے بادشاہو کہہ رہا ہے بعد میں اس نے میرے ساتھ وہ سلوک بھی کرنا ہے جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ان دنوں اخبارات میں بھی نظر آ رہی ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا ''استاد' یہ تکلف چھوڑو' سیدھی طرح بتاؤ لینا کیا ہے؟'' بولا۔ ''آپ سے میں سو روپیہ لے لوں گا۔'' مجھے اپنے ساتھ اس خصوصی سلوک کی وجہ تو سمجھ نہیں آئی تاہم میں کچھ دیر بحث و تمحیص کے بعد اسے ستر روپے پر راضی کر لیا!

آج کافی دنوں بعد مجھے رکشہ میں بیٹھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس میں بیٹھتے ہی جب اس عجیب و غریب سواری نے اسپیڈ پکڑی تو ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں نے چشم زدن میں میرا ناک سرخ دیا۔ مجھے ایبٹ آباد کا ہوٹل یاد آ گیا جس کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا' آرام دہ اور ہوادار کمرے۔ کمروں کے آرام دہ ہونے کے بارے میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ دسمبر کے مہینے میں یہ کمرے ہوادار ضرور تھے کہ ان کی کھڑکیوں کے سارے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ جس رکشے میں' میں سوار تھا' اس کے ریکسین کے دروازوں میں بھی جگہ جگہ سوراخ تھے۔

رکشہ ڈرائیور گندمی رنگ کا ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ جو لکیریں ہمارے ہاتھوں پر ہوتی ہیں' وہ اس کے چہرے پر تھیں۔ اس نے کمبل کی بکل ماری ہوئی تھی۔ اور اس کی بکل میں اس کا آدھا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر رواں ٹریفک کے ساتھ اٹکھیلیاں اور زگ زیک بناتا اقبال ٹاؤن کو جانے والی سڑکوں پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی پھرتیاں دیکھیں تو کہا ''استاد' میری کمر میں تکلیف ہے' کوئی کھڈا ہو تو وہاں بریک لگا لینا اور پھر چلنا' بولا ''سر جی! آپ فکر نہ کریں'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے رکشہ ایک کھڈ میں گرایا' جس پر بے ساختہ میرے منہ سے اس طرح ''ہائے'' نکلا جس طرح کی ہائے میرے ڈرامے ''خواجہ اینڈ سن'' میں علی اعجاز کے منہ سے نکلتی ہے؟ اس ''ہائے'' پر رکشہ ڈائیور نے گردن میری طرف موڑ دی اور پوچھا ''سر جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟''

اس بے نیازی پر میں جل کر راکھ ہو گیا۔

رکشہ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ گھوں گھوں کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ پتہ چلا کہ کچرا آ گیا ہے۔ کچرا صاف کرنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اپنی منزل پر رواں تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک روز دار جھٹکا لگا' میرے منہ سے پھر ''ہائے'' کی آواز بلند ہوئی۔ رکشہ ڈرائیور اپنے مسافروں کا بہت خیال رکھنے والا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دفعہ پھر گردن موڑ کر مجھے پوچھا ''سر جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' میں نے اس غیر ضروری سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر رکشے میں کچرا آ گیا' اس دفعہ کچرا صاف کرنے میں کچھ زیادہ دیر لگی' مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی ایک مہمان میرا انتظار کر رہا تھا' جب رکشہ اسٹارٹ ہوا تو میں نے پوچھا ''یار' اس میں بار بار کچرا کیوں آ جاتا ہے؟'' بولا موبل آئل میں ملاوٹ ہوتی ہے'' اس کے بعد اس نے معاشرے میں پھیلی ہوئی بے ایمانیوں' لوٹ کھسوٹ اور رشوت ستانی وغیرہ پر بولنا شروع کیا۔ اور بولتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ ایک دفعہ پھر میری کمر کو جھٹکا لگنے پر میرے منہ سے ''ہائے'' نکلی تو اس نے اپنا سلسلہ کلام منقطع کر کے کہا ''سر جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' میں کہا ''نہیں بھائی' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں آپ سے بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟''

میں تین بجے رکشے میں بیٹھا' اب چار بجنے کو تھے اور میں نے آدھا رستہ طے کیا تھا' بار بار کچرا آنے کی وجہ سے منزل دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور اس پر مستزاد وہ جھٹکے تھے جنہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے نرمی سے رکشہ ڈرائیور کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا جو ابھی ابھی کچرا صاف کر کے واپس سیٹ پر بیٹھا تھا اور کہا ''بھائی صاحب! میری بات سنیں'' اس نے گردن موڑ کر مجھ سے پوچھا ''آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' میں کہا ''ہاں' اس دفعہ آپ ہی سے کچھ کہا ہے'' بولا ''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے جواب دیا ''مسئلہ کوئی نہیں' لیکن اگر میں تمہارے رکشے میں بیٹھا رہا تو میں وقت پر گھر نہیں پہنچ سکوں گا' میں دوسرا رکشہ کر لیتا ہوں جس میں سستے نرخوں پر ملنے والا نقلی موبل آئل نہ ڈالا گیا ہو!'' ''اب آپ کو تکلیف نہیں ہو گی! میں نے کچرا اچھی طرح صاف کر دیا ہے''۔

میں خاموش ہو گیا' مگر اس وقت پھر میری آواز نے میری تکلیف کا اظہار کیا جب رکشہ ایک نوگز کے مزار جتنے اونچے سپیڈ بریکر سے پوری رفتار سے گزرا۔ اس دفعہ میرا سر بھی رکشے کے ریکسین کی چھت سے منسلک لوہے کے پائپ کے ساتھ جا ٹکرایا تھا' چنانچہ اس دفعہ میری صدائے احتجاج زیادہ آہنگ تھی' رکشے والے نے گھبرا کر پوچھا۔ ''سر جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' میں نے جل کر کہا۔ ''ہاں' تم سے کہا ہے' اگر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ ہی گئے ہو تو انسانوں کی طرح ڈرائیونگ کرو!''

رکشے والے نے گھور کر مجھے دیکھا اور اس دفعہ جان بوجھ کر رکشہ گہرے کھڈ میں گرا دیا۔ میں نے بھی یہ ظاہر کیا کہ مجھے اس سے

کوئی فرق نہیں پڑا۔

شام کے تقریباً پونے نو بجے رکشہ میرے گھر کے دروازے پر رکا تو میں نے اپنے ریزہ ریزہ جسم کو سمیٹا اور بمشکل رکشے میں سے برآمد ہونے میں کامیاب ہوا۔

میں نے ستر روپے ڈرائیور کی ہتھیلی پر رکھے، جس نے کمبل کی بکل سے اپنا آدھا منہ چھپایا ہوا تھا اور کہا ''عزیزم: آپ رکشہ ڈرائیوری میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں، آپ نے کچرا صاف کرنے کے چکر میں جس طرح آدھ گھنٹے کے سفر کو پونے دو گھنٹے پر پھیلایا ہے اور ہر تکلیف پہنچانے والے اور پورے جسمانی نظام کا انجر پنجر ہلا دینے والے جھٹکے پر جس بے نیازی سے پوچھتے رہے کہ ''آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟''..... ان خصوصیات کے پیش نظر آپ کو حکومت میں ہونا چاہیے تھا۔ پہلے مرحلے کے طور پر آپ آج ہی سے نہاری، ہریسہ چھوڑ کر میکڈانلڈ کے برگر شروع کریں اور ہو سکے تو کوئی این جی او بنا ڈالیں۔

مولا کرم کرے گا!''

رکشہ ڈرائیور نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور سوالیہ انداز میں پوچھا ''جی؟'' اس دفعہ میں نے بے نیازی سے کہا ..... ''استاد آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔''

◆◆◆

کوئی سر اٹھا کر چلے.....!!!

تقسیم برصغیر سے پہلے ایک خاندان ضلع امرتسر کے ایک گاؤں سے ہجرت کر کے تلاش معاش میں لاہور پہنچا' یہ خاندان بھی ان تمام صعوبتوں سے گذرا' جن صعوبتوں سے باقی سب ایسے لوگ گذرتے تھے' پھر اس خاندان کے سربراہ نے ہمت مردانہ سے کام لیتے ہوئے ایک بھٹی لگائی اور سب بھائی مزدوری کے طور پر اس میں کام کرنے لگے۔ حتیٰ کہ اس بھٹی نے فاؤنڈری کی شکل اختیار کی اور پھر تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد اس خاندان کا شمار پاکستان کے ممتاز صنعتکاروں میں ہونے لگا' لیکن یہ لوگ اپر کلاس میں شامل ہونے کے باوجود اپنی اخلاقیات' رہن سہن' اپنے تہذیبی رویوں اور اپنی زمین اور اس زمین پر بسنے والے عام انسانوں کے ساتھ اپنی گہری وابستگی کے حوالے سے ہمیشہ مڈل کلاس ہی میں شمار ہوئے' انہیں اپنی زبانوں اردو اور پنجابی سے محبت تھی چنانچہ یہ ہمیشہ انہی زبانوں کو ذریعہ اظہار بناتے۔ یہ رام گلی میں گندے مندے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے جوان ہوئے' ان کے رویوں میں غرور نام کی کوئی چیز نہ تھی' یہ سادہ لوگ تھے اور سادہ لوگوں کو پسند کرتے تھے۔

پھر یہ خاندان سیاست میں آیا اور بال آخر اس کا ایک قسمت کا دھنی سپوت جس کا نام محمد نواز شریف تھا' پاکستان کا دو مرتبہ وزیراعظم بنا۔ پاکستان سے عشق کرنے والا یہ شخص سو فیصد ''میڈ ان پاکستان'' تھا اور وہ اپنے لئے یہ الفاظ سن کر خوش بھی ہوتا تھا۔ وہ چونکہ ''درآمد'' نہیں کیا گیا تھا' وہ پاکستان میں پھوٹا تھا چنانچہ اسے پاکستانی عوام کے دکھ درد اور ان کے آدرشوں سے پوری طرح آگاہی تھی' سو وہ ان کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا' وہ اس نے کیا لیکن بہت کچھ نہ بھی کر سکا' جن میں سے کچھ اس کے اختیار میں نہیں تھا اور کچھ اس کے مشیروں یا اس کی اپنی افتادطبع نے نہ کرنے دیا۔ وہ پاکستان کا آئیڈیل حکمران نہیں تھا۔ لیکن اپنی تمام خرابیوں کے باوجود میرے خیال میں گزشتہ کئی عشروں کے دیگر پاکستانی حکمرانوں سے بہتر تھا۔

گزشتہ چار ماہ سے پاکستان کا یہ منتخب وزیراعظم' اس کا معزول چیف منسٹر پنجاب بھائی کراچی کی لانڈھی جیل میں بند ہیں۔ ان پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے آرمی چیف کا طیارہ کراچی میں لینڈ نہیں کرنے دیا چنانچہ ان برادران اور ان کے ساتھیوں پر دہشت گردی کے مقدمات ہیں جن کی سماعت جاری ہے۔

آج 2000ء میں اس شخص کے خاندان کے افراد بچھڑے ہوئے عزیزوں کے حوالے سے اسی طرح دربدر اور درماندہ ہیں جس

طرح 1947ء میں والٹن کے کیمپ میں مہاجرین کے قافلے اپنے عزیزوں کے حوالے سے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ اور وہاں سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ ''معزول'' وزیراعظم کا 82 سالہ ضعیف' دل کا پرانا مریض والد میاں شریف طویل نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا ہے لیکن

کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے؟

یہ عملی طور پر اپنے رائیونڈ والے گھر' میں جسے ان کے مداح محل کہتے ہیں میں نظر بند ہیں' اگر کوئی ان سے ملنا چاہے یا وہ کسی سے ملنا چاہیں تو یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میاں شریف کا ایک بیٹا عباس شریف جسے زر و جواہر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جس کے چہرے پر شرعی داڑھی اور جسم پر شرعی لباس بمعہ کندھے والا رومال ہے' جو ساری ساری رات خدا کے حضور مناجات کرتے ہوئے گذار دیتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں بغیر کسی فرد جرم کے نظر بند ہے۔ ''معزول'' وزیراعظم کا خوش خصال بیٹا حسین نواز جرم بے گناہی میں راولپنڈی کے ایک تھانے میں فرش پر بچھی پرالی پر سوتا ہے اور جیل کے کھانے پر گذارا کرتا ہے۔ میاں نواز شریف کا داماد کیپٹن صفدر اور پنجاب کے مثالی مگر ''معزول'' وزیراعلیٰ شہباز شریف کا بیٹا حمزہ شہباز بغیر کسی الزام کے رائے ونڈ کے گیسٹ ہاؤس میں نظر بند ہیں۔ آج کی ایک اخباری اطلاع کے مطابق ان کا گھر کا کھانا بند کر دیا گیا ہے اور جیل سے کھانا منگوا کر دیا گیا ہے۔ اس خاندان کی صرف خواتین کو کچھ عرصہ قبل رہائی ملی ہے' جن میں معزول وزیراعظم کی ضعیف العمر والدہ' بیٹی' بہو' اہلیہ اور معزول چیف منسٹر کی اہلیہ اور بیٹیاں شامل ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ خاندان کے بے گناہ افراد کو اس ابتلاء سے گذارا گیا ہے بلکہ کوئی جرم بتائے بغیر اس خاندان کے کاروباری رفقاء و سینئر ملازمین مختار حسین' محمد اکرم اور ہارون پاشا چھاؤنی تھانے پر پتلے اور پھٹے ہوئے کمبلوں کے ساتھ جنوری کی سرد راتیں بسر کر رہے ہیں' انہیں گذشتہ سوا تین مہینوں سے ان کا کوئی جرم نہیں بتایا گیا۔

ان کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ مقام کی حامل دوسری شخصیتوں کے ساتھ بھی وہ سلوک ہو رہا ہے جس کی اجازت دنیا کا کوئی مہذب معاشرہ نہیں دیتا۔ کرنیل زادے مشاہد حسین ''برآمد'' تو ہو گئے ہیں' مگر انہیں بغیر جرم بتائے جیل میں رکھا گیا ہے۔ سینیٹر پرویز رشید' ایم پی اے رانا ثناء اللہ' ایم پی اے شیخ اعجاز' ایم پی اے حاجی امداد حسین اور ایم پی اے حاجی عبدالمنان کے ساتھ پولیس نے جو سلوک کیا' وہ بیان سے باہر ہے۔

ان کے علاوہ دو ایسے سیاسی کارکن ہیں' جن کی عزت کم سے کم میرے نزدیک ہر پاکستانی پر فرض ہے اور انہیں ان کی دیانت'

خدمت پر ''گارڈ آف آنر'' پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ پیر بنیامین رضوی اور صدیق الفاروق ہیں' اول الذکر اپنے گھر کے ایک کمرے میں گذشتہ چار ماہ سے نظر بند ہیں اور سابق صحافی صدیق الفاروق کے بارے میں' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا شاید انہیں کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا ہے' ابھی تک ان ''ملزموں'' کو بھی الزامات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا!

میں یہ سب کچھ لکھنے پر مجبور ہوں کیونکہ میرے خوابوں اور خیالوں میں بسا ہوا پاکستان اس تعبیر سے مختلف ہے جو نظر آ رہی ہے۔ آج سب خاموش ہیں' لیکن آنے والا کل بولے گا۔ میں چاہتا ہوں آنے والا کل بولے گا مگر وہ کہے کہ جو ظالم تھے ان کو ظلم کی سزا آئین اور قانون کے مطابق دی گئی تھی' اگر آنے والے کل نے یہ گواہی دی تو ہمارا کل کا پاکستان انتہائی خوبصورت ہوگا۔ میرے' آپ کے اور ہم سب کے رہنے کے قابل پاکستان!

◆◆◆

وزارت محبت

ہماری قوم بڑی دلچسپ ہے' لڑائی مار کٹائی بھی کرتی ہے' ہیر پھیر سے بھی باز نہیں آتی' مہنگائی کے ہاتھوں بھی تنگ ہے' بیروزگاری کے شکنجے میں بھی کسی ہوئی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی زندہ دلی میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ اس زندہ دلی کا سب سے زیادہ مظاہرہ بسوں' ویگنوں اور رکشوں کے پیچھے اور بیت الخلاؤں میں دیوار پر لکھے ہوئے اشعار' مقولوں اور جملوں کے ذریعے کیا جاتا ہے' بیت الخلاؤں میں لکھی ہوئی زیادہ تر تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو بیت الخلاؤں ہی میں لکھی' پڑھی اور دہرائی جاسکتی ہیں البتہ پبلک ٹرانسپورٹ کی تحریریں ''فری فار آل'' ہیں اور بڑی معنی خیز بھی ہوتی ہیں!

کسی زمانے میں بیشتر رکشاؤں کے پیچھے لکھا ہوتا تھا'' پپو یار تنگ نہ کر'' لیکن اب یہ جملہ نظر نہیں آتا! شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی دور حکومت میں'' پپو یار'' تنگ کرنے سے باز نہ آیا چنانچہ عوام' صبر شکر سے کام لیتے ہوئے اپنے اس مطالبے ہی سے دستبردار ہو گئے۔ اسی طرح ایک جملہ بلکہ درخواست یہ بھی کہیں نہ کہیں لکھی نظر آ ہی جاتی ہے دیکھ مگر پیار سے'' اب یہ جملہ بھی خاصا معنی خیز ہے اور سیاسی نوعیت کا ہے' لیکن اگر حکومتیں اپنے عوام کو پیار سے دیکھنا شروع کر دیں اور ان کے مفاد میں کام کریں تو امریکہ ان حکومتوں کو گھور کر دیکھنے لگتا ہے' لہٰذا پیار سے اسی کو دیکھا جاسکتا ہے جو حکومت میں لانے والا ہوتا ہے' غالباً اس ضمن میں عوام کی غلط فہمی بھی دور ہو چکی ہے چنانچہ اب یہ جملہ بھی ذرا کم کم پڑھنے کو ملتا ہے۔

ایک جملہ تو ایسا ہے جو سو فیصد سیاسی ہے اور یہ میں نے ایک بس کے پیچھے لکھا ہوا دیکھا ہے جو ٹریفک کے ہر قاعدے قانون کو پامال کرتی اور سڑک پر موجود سب سواریوں اور انسانوں کے حقوق روندتی اندھا دھند کسی انجانی منزل کی طرف رواں تھی' اس کے پیچھے لکھا تھا'' پاس کر' یا برداشت کر'' یہ چیلنج غالباً سیاسی جماعتوں کے لیے تھا اور کسی بھی دور میں کسی نے بھی اس ''بس'' کو اوورٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی' سبھی برداشت ہی کرتے رہے بلکہ بعض جماعتیں تو اس بس کو خوش آمدید کہتی ہیں اور من کی مرادیں پاتی ہیں' اس کے بعد آنے والی اسی طرح کی بس ان خوش آمدید کہنے والوں کو کچل کر رکھ دیتی ہے مگر اس دوران کچھ دوسری جماعتیں اس بس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو چکی ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے!

بسوں ویگنوں اور رکشوں میں صرف اس نوع کے جملے ہی نہیں' بعض مزے کے شعر بھی لکھے ہوتے ہیں ایک بس کے پیچھے یہ شعر

لکھا تھا۔

جاپان سے میں آئی ہوں' مزدا میرا نام ہے
جتنا چاہے لوڈ ڈالو' خدمت میرا کام ہے

اس شعر میں تو ظالم شاعر نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ اپنی کسی حکومت سے خدمت کی توقع رکھنا عبث ہے' یہ جاپان اور امریکہ وغیرہ ہی ہیں جو اپنے عوام کی خدمت کرتے ہیں اور اس خدمت کو وہ بوجھ ہی نہیں سمجھتے!

لیکن جو سلوگن نے مجھے سب سے زیادہ دیا ہے' یہ بالکل نیا ہے اور میں نے ابھی کل ہی ایک رکشے کے پیچھے لکھا ہوا پڑھا ہے لکھا تھا ''دل توڑنا منع ہے۔ منجانب وزارت محبت'' اس درخواست پر ماضی میں اگر کسی حکمران نے عمل کیا تو وہ میاں نواز شریف تھے۔ انہوں نے آصف زرداری کو جیل میں ''وزارت محبت'' کی طرف سے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔ اور اس ضمن میں فیملی پلاننگ والوں کی بھی ایک نہیں سنی۔

بہر حال یہ تو اس جملے کی ایک پرت ہے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں اتنی وزارتیں قائم ہیں اگر واقعی ایک ''وزارت محبت'' بھی قائم ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ ہم سارا دن کڑوے کسیلے جملوں سے ایک دوسرے کا دل توڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ سندھی' بلوچی' پنجابی' مہاجر' پٹھان ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانیوں کا شکار ہیں' اگر وزارت محبت قائم ہو اور وہ اپنا فریضہ دیانت داری سے انجام دے تو ہم ایک قوم بن سکتے ہیں' بس اتنا ہے کہ اس محبت میں انصاف بھی شامل ہونا چاہیے!

◆◆◆

پتنگ باز سجنا!

ان دنوں پتنگ بازوں اور پتنگ بنانے والوں کے درمیان معرکے کا رن پڑا ہوا ہے' جیسا کہ آپ جانتے ہیں' فروری کا مہینہ دو اہم واقعات کی وجہ سے مشہور ہے' ایک تو اس لئے کہ اس مہینے میں میری ولادت ہوئی تھی۔ اور اس مہینے کی دوسری چھوٹی موٹی وجہ شہرت بسنت کا تہوار ہے۔ بلکہ یہ میرے ایک مداح کا خیال ہے' جو بوجہ شرمندگی اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ بسنت کا تہوار دراصل میرے جشن ولادت ہی کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ میں چونکہ خودستائی کا قائل ہوں' لہٰذا اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہوئے آپ کو یہ اطلاع دینا چاہوں گا کہ پتنگ بازوں اور پتنگ بنانے والوں نے بسنت الگ الگ تاریخوں میں منانے کا اعلان کیا ہے۔ یوں تو پاکستان میں پتنگ بازوں کی کئی ایسوسی ایشنیں ہیں لیکن آل پاکستان کائٹ ایسوسی ایشن لاہور کو نمائندہ حیثیت حاصل ہے کہ یہ باقاعدہ گورنمنٹ آف پاکستان کی رجسٹرڈ ایسوسی ایشن ہے۔ جس کے صدر میاں عبدالوحید' سینئر نائب صدر ڈاکٹر نثار احمد کمبوہ اور دو نائب صدر حاجی خلیل احمد کمبوہ اور خواجہ منیف شاکر ہیں۔ آخر الذکر اردو کے ممتاز شاعر شرقی بن شائق مرحوم کے بھائی ہیں۔ سو اس تنظیم نے اعلان کیا ہے کہ لاہور میں بسنت 13 فروری کو منائی جائے گی۔ اور اس تنظیم سے ملحق فیصل آباد کے جواد کائٹ کلب نے فیصل آباد میں 18 فروری کی تاریخ بسنت کے لئے مختص کی ہے۔ اور ان دونوں تنظیموں نے اپنے اس ''مشترکہ اعلامیہ'' کی اطلاع ایک قد آدم سائز رنگین پوسٹر کے ذریعے دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعلان بھی کیا ہے کہ احمد بلاک گراؤنڈ گارڈن ٹاؤن لاہور میں 23 مارچ کو یوم جمہوریہ کی خوشی میں پتنگ بازی کا ون ڈے ٹورنامنٹ بھی ہوگا۔

دوسری طرف پتنگ بنانے والے اس بات پر مصر ہیں کہ بسنت 20 فروری کو منائی جائے گی۔ اب اس بات پر دونوں میں ''پیچا'' پڑ گیا ہے' اب یہ دیکھنا ہے کہ کون اپنی ڈور اور مہارت پر بھروسہ کرتا ہے اور کون ''کھچی'' مار کر یا تار اور تندی استعمال کر کے دوسرے کو ''بو'' کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اقتدار کے حصول کے لئے تار اور ''تندی'' بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اور ''کھچی'' مارنے کا رواج بھی 58ء سے چلا آ رہا ہے۔ مگر جو اسپورٹس مین ہوں' ان سے تو اسپورٹس اسپرٹ ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ دونوں فریق مل کر بیٹھیں گے اور بسنت ایک ہی دن منانے کا فیصلہ کریں گے کیونکہ بسنت کوئی عید تو ہے نہیں کہ ایک شہر میں تین تین عیدیں ہوں۔

ویسے ایک میرا ذاتی خیال ہے کہ بسنت کی ''تاریخ'' طے کرنے کا حق بسنت منانے والوں کو ہے۔ پتنگیں بنانے والوں کو نہیں کہ

دکاندار کو گاہک کی سہولت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مگر ان دنوں صورت حال کچھ مختلف ہوگئی ہے۔ بل جمع کرانے والے باہر دھوپ میں لگی لمبی قطار میں جھلس رہے ہوتے ہیں۔ اور پیسے سمیٹنے والا اندر ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ اس کی سلطنت میں موجود ہر شہری کو روزانہ دس جوتے لگائے جائیں' چنانچہ حکم کی تعمیل شروع ہوگئی' ایک روز بادشاہ سلامت موقع پر معائنہ کے لئے تشریف لے گئے اور جوتے کھانے والوں سے پوچھا'' آپ لوگوں کو کوئی شکایت تو نہیں؟'' جوتے کھانے والوں میں سے ایک نے جواب دیا'' بادشاہ سلامت! آپ کے دور میں ایسے کس طرح ہوسکتا ہے۔ بس ایک گذارش ہے کہ جوتے مارنے والے عملے میں اضافہ کیا جائے۔ کہ اپنی باری کے لئے انتظار بہت کرنا پڑتا ہے!''

میں بچپن میں خود بھی پتنگ باز رہا ہوں۔ اور اب بھی موقع ملے تو پیچا لڑانے سے باز نہیں آتا۔ لہٰذا اس سارے معرکے میں' میں خود بھی ایک فریق ہوں اور یوں میری خواہش ہے کہ فتح پیچا لڑانے والوں کی ہو کہ ان دنوں تند و تیز مخالف ہواؤں میں'' پیچا ڈالنا'' کوئی آسان کام نہیں' اس میں انگلیاں فگار ہو جاتی ہیں اور وہ بڑے دل گردے والے لوگ ہیں جو اس کام میں پڑتے ہیں۔ چنانچہ ''دکانداروں'' کو اور کچھ نہیں تو ان کی قدر کرنا چاہیے۔

اور بالفرض محال اگر فریقین میں بسنت کی تاریخ پر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو میرے اس مداح کی رائے ہے جس کے متعلق میں نے بتایا ہے کہ وہ بوجہ شرمندگی اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ پھر بسنت 13 کو منائی جائے اور نہ 20 کو بلکہ اس کے لئے یکم فروری کی تاریخ طے کر دی جائے۔ ایک تو اس لئے کہ اسی دن تازہ تازہ تنخواہ ملی ہوگی اور دوسرے یکم فروری میرا یوم پیدائش ہے۔ میرے اس بزدل مداح کا خیال ہے کہ اگر ایک عظیم شخصیت کا جشن ولادت منانا ہی تو پھر یوم پیدائش پر اور کھل کر کیوں نہ منایا جائے' میں اپنے اس مداح کی رائے سے متفق نہیں ہوں مگر بزرگوارم ارشاد حقانی کی طرح اپنے قارئین کی اس نوع کی آراء کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا!

◆◆◆

حلف وغیرہ.....!

جس طرح محرم اور مجرم میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے' اسی طرح عزت اور ذلت میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ زندگی میں کوئی ایک نیکی نیک نامی اور کوئی ایک لغزش بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔ جسٹس (ر) آفتاب فرخ کی زندگی کے نشیب و فراز سے میں واقف نہیں ہوں لیکن میرے دل میں ان کے لئے احترام کا جذبہ ہے' ایک تو اس لئے کہ وہ ہائیکورٹ کے ان دو تین ججوں میں سے ایک تھے جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور دوسرے ان دنوں وہ اپنے دوست سید غوث علی شاہ کا ساتھ جس مشکل وقت میں اور جس بے لوثی کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور جسٹس صاحب اس مشکل وقت میں سائے کی طرح اپنے دوست کے ساتھ ہیں!

ویسے ان باتوں سے قطع نظر' مجھے آج تک ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ذرا سے احترام اور ذرا سی نیک نامی کی خاطر جسٹس آفتاب فرخ اور ان کے چند ساتھیوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیوں تھا کیوں کہ حلف اٹھانے کا مطلب حلف کی پاس داری نہیں بلکہ یہ تو ایک روٹین کی کاروائی ہوتی ہے۔ ہمارے سارے جج' جج بننے سے پہلے حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ آئین اور قانون کے مطابق فیصلے کریں گے' وزیر اعظم بھی یہی حلف اٹھاتا ہے' اس کی کابینہ کے ارکان بھی اس کاروائی میں شریک ہوتے ہیں' آرمی چیف بھی حلف اٹھاتا ہے۔ صدر کو بھی حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ گورنر اور وزرائے اعلیٰ بھی اٹھاتے ہیں۔ بلکہ آئے روز چھوٹی چھوٹی تنظیموں کی حلف وفا داری کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں' کئی دفعہ یہ فریضہ میرے سپرد بھی کیا گیا ہے اور ویسے ایسے مواقع پر میں خود کو بہت اہم شخصیت تصور کرتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حلف اٹھانے والے اب ساری عمر کے لئے اس حلف کے قیدی بن کر رہ جائیں۔ انسان پیدائشی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ آزاد ہی رہنا چاہتا ہے' یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جگہ جگہ آزادی کی جنگیں جاری ہیں بلکہ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ مغرب والے فرد کی آزادی کے اتنے چیمپئن بنتے ہیں مگر دوسری طرف انہوں نے خود کو آئین اور قانون کے شکنجے میں کچھ اس بری طرح جکڑا ہوا ہے کہ ان کی زندگیاں اجیرن ہو کر رہ گئی ہیں۔ انتخابات کے بغیر کوئی برسر اقتدار نہیں آسکتے۔ ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر کوئی گاڑی نہیں چلا سکتا' سڑک پر کیلے کے چھلکے نہیں پھینک سکتا' دیواروں پر پان کی پیک کی پچکاری نہیں مار سکتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے' یہی وجہ ہے کہ میں امریکہ پر چار حرف بھیج کر 1970ء میں واپس پاکستان چلا آیا تھا۔

حلف حلف کی دہائی دینے والے ہم نام نہاد پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ سمجھ دار تو ساہیوال کا وہ ''جانگلی'' تھا' جس کا مقدمہ عدالت میں تھا اور اس کا وکیل اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ عدالت میں پیشی کے وقت حلف اٹھا کر اپنے جرم سے انکار کر دے مگر ''جانگلی'' مسلسل انکاری تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا' جب وکیل نے زیادہ اصرار کیا تو ''جانگلی'' نے پوچھا ''یہ حلف اٹھایا کیسے جاتا ہے؟'' وکیل نے جواب دیا ''تمہیں صرف قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہنا ہے کہ تم نے یہ جرم نہیں کیا'' یہ سن کر ''جانگلی'' کے چہرے پر رونق آ گئی اور بولا ''میں سمجھتا تھا حلف کوئی بہت مشکل چیز ہے اگر حلف یہی ہے تو یہ تو جتنی دفعہ کہو اٹھا سکتا ہوں!''

میرے خیال میں حلف کے حوالے سے یہ اپروچ زیادہ پریکٹیکل ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو حلف اٹھانے کی تقاریب میں کافی وقت ضائع ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ رقم بھی خرچ ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت قوم کے وقت کو بھی قیمتی سمجھتی ہے اور فضول کاموں پر پیسہ بھی ضائع نہیں کرتی۔ یہ میری تجویز نہیں' خواہش ہے کہ جہاں اتنے انقلابی کام ہو رہے ہیں وہاں فضول اور بے معنی قسم کی رسموں کے خاتمہ کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ اگرچہ کچھ ''مغرب زدہ'' لوگ اس پر واویلا کریں گے' مغربی پریس اور ان کے زیر اثر پاکستان سے نکلنے والے اخبارات مخالفانہ مہم بھی شروع کر سکتے ہیں۔ مگر ہم نے جو قدم بھی اٹھانا ہے اپنے مفاد میں اٹھانا ہے' لہٰذا ان کے شور و غوغا کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر موجودہ فوجی حکومت حلف ختم کرنے کا کارنامہ انجام دے دیتی ہے تو اس کی یہ اسلامی خدمت کبھی فراموش نہیں کی جا سکے گی کہ اس کے نتیجے میں قرآن اور حلف کی بے حرمتی کا ایک دیرینہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا!

◆◆◆

کل من علیھا فان

انسان اللہ تعالیٰ کی بہت ہٹ دھرم مخلوق ہے' یہ اپنے ماضی پر صرف اس وقت پچھتاتا ہے جب اس کا ''حال'' پتلا ہوتا ہے۔ عالم شباب میں وہ خدا کی زمین پر اس طرح اکڑ اکڑ کر چلتا ہے جیسے یہ زمین اس کے اسی طرح چلنے ہی کے لئے بنائی گئی ہے۔ کسی مریض یا بوڑھے کو ایڑیاں رگڑتے دیکھ کر بھی اسے یہ خیال نہیں آتا کہ کبھی اس کی طرح تندرست اور جوان تھا اور خدا کی زمین پر اسی طرح اکڑ اکڑ کر چلتا تھا! جن لوگوں کے پاس فراواں پیسہ ہے اور وہ زندگی کی ہر نعمت سے لطف اندوز ہوتے ہیں انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ جس طرح آج کروڑوں لوگ ان نعمتوں کے عشر عشیر کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے' اسی طرح کسی دن وہ بھی یا تو کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جائیں گے' یا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بلڈ پریشر' شوگر یا اس طرح کے دوسرے موذی مرض کی وجہ سے بیٹھے بٹھائے ہر نعمت سے محروم ہوتے چلے جائیں گے۔

وہ جو بڑے بڑے خطیب ہیں' جو لاؤڈ سپیکر پر شیر کی طرح دھاڑتے ہیں اور جن کے سامنے لاکھوں کا مجمع دم سادھے بیٹھا ہوتا ہے' انہیں اس شکوہ خطابت کے دوران کبھی یہ سوچ نہیں آئی کہ ایک دن اپنے گھر میں انہیں آکسیجن لگی ہو گی یا ڈاکٹروں نے انہیں سلانے کے لئے نیند کی گولیاں دی ہوں گی۔ اور اس عالم میں کوئی دوسرا شیر لاؤڈ سپیکر پر دھاڑ رہا ہو گا۔ جس کی دھمک سے ان کا ڈوبتا ہوا دل مزید ڈوب جائے گا۔

جو بیوروکریٹ سائلوں کو اپنے دفتروں کے باہر کوٹھی کے برآمدے میں گھنٹوں انتظار کراتے ہیں' ان کی توہین کرتے ہیں' ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے یا ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کرتے' جو مقابل کا اسٹیٹس دیکھ کر اس سے ہاتھ یا انگلی ملاتے ہیں' جب وہ ریٹائر ہوں گے یہی لوگ ان کے قریب سے منہ پھیر کر گزر جائیں گے' ان کے کان ٹیلی فون کی گھنٹی سننے کے لئے ترس جائیں گے۔ اور ایک دن اس بے بسی کے عالم میں وہ فوت ہو جائیں گے۔ وہ چار آدمی انہیں چارپائی پر ڈال کر میانی صاحب چھوڑ آئیں گے۔ مگر یہ سوچ انہیں اپنی فرعونیت کے زمانے میں نہیں آتی۔

آج جو کالم نگار' رپورٹر اور ایڈیٹر ساری دنیا کو اپنے قلم کے زیر نگیں سمجھتے ہیں' جو اپنے ذاتی عناد یا ذاتی مفاد کی خاطر اپنے قلم کو ساہو کاروں کے پاس گروی رکھوا دیتے ہیں۔ جو اپنے ضمیر کو تھپکیاں بلکہ دھمکیاں دے دے کر سلانے کی کوشش کرتے ہیں' ایک دن ان

کے قویٰ بھی مضمحل ہو جائیں گے۔ ایک دن وہ بھی کسی کالم نگار، رپورٹر یا ایڈیٹر کی حقیری رعایا ہوں گے۔ ایک دن ان کا سارا کروفر، سارا رعب اور دبدبہ، ساری بے تاج بادشاہیاں ان کے فانی جسم سمیت خاک میں مل جائیں گی۔ اور ایسا تو ہونا ہی ہوتا ہے لیکن ایسا ہونے سے پہلے سوچ کا ایک لمحہ تو ایسا ہونا چاہیے جب انسان دوسروں کے علاوہ اپنے عمل پر بھی نظر ڈال سکے!

اور یہ جو مجلسی قسم کے لوگ ہیں، جو بڑے بڑے قومی سانحے کو قہقہوں اور پھبتیوں سے اڑا دیتے ہیں، جن کی آنکھیں آنسوؤں سے محروم ہیں۔ اور جن کے ہونٹ خون آلود قہقہوں سے لال ہیں، جن کے جملے محض دلآزاری کے لئے ہوتے ہیں، وہ جن کی کومٹ منٹ صرف اپنے سے ہے، ایک دن یہ بھی ویران آنکھوں سے اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑے لوگوں کو ہنستے دیکھ کر حیران ہوں گے۔ اور سوچیں گے کہ یہ آخر کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ مگر تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی!

جو فوجی ان دنوں اقتدار میں ہیں اور جو اس اقتدار میں ان کے حصے دار ہیں، لوگ ان کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں، ان کے عزیز و اقربا کا شمار ان دنوں وی آئی پی زمیں ہوتا ہے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا کوئی بھی لفظ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے قلم کی ایک جنبش کسی کو غلام اور کسی کو آزاد شہری کا درجہ دے دیتی ہے۔ مگر آنے والے کل میں ان کا شمار پھر عالم لوگوں میں ہوگا۔ آج جو ان کے ہم نواؤں سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔ کل وہ ان سے تعلقات چھپانا چاہیں گے۔ آج کے صاحبان اقتدار کو بھی اقتدار کے علاوہ جسمانی زوال دیکھنا ہے۔ یہ دنیا کا نظام ہے، ہر چیز کو فنا ہونا ہے۔ مگر فنا کے عمل سے پہلے ہم سب کو یہ ضرور سوچنا ہے کہ ہم کس لئے آئے تھے اور کیا کر کے جا رہے ہیں؟ جوانی میں ہمیں بڑھاپا اور عروج میں زوال کو یاد رکھنا چاہیے۔

◆◆◆

مسٹر لٹیرا 2000ء!

قوم کے لئے ایک اچھی خبر ہے کہ اس دفعہ بسنت کا تہوار سرکاری سطح پر منایا جائے گا' سرکار نے اس سلسلے میں جو پروگرام ترتیب دیا ہے اس کے مطابق 12 فروری کو ریس کورس پارک سے پتنگ بازی کا آغاز ہوگا۔ پروفیشنل امیچور اور انڈر 15 میں چیمپئن شپ کے مقابلے ہوں گے۔ پتنگ بازی کے ان مقابلوں کا فائنل 18 فروری کو منعقد ہوگا جس میں جیتنے والے اور سب سے خوبصورت اور بہترین پتنگ بنانے والوں کو خصوصی انعامات دئے جائیں گے۔ جب کہ ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ پتنگیں والے کو ''مسٹر لٹیرا 2000'' کا ٹائٹل ایوارڈ دیا جائے گا۔ اسی طرح 20 فروری کو بسنت کے روایتی تہوار کو بہتر طریقے سے منانے کے لئے 19 فروری کی رات کو بسنت نائٹ اور جشن بہاراں کا انعقاد بھی کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں لاہور ریس کورس پارک میں پتنگ بازی کے مقابلے کے ساتھ مختلف ثقافتی پروگرام منعقد ہوں گے۔ جن میں سانپ اور بندروں کا تماشہ' علاقائی کسانوں کے اسٹال اور پتنگیں لگانا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کی مشہور شاہراہوں اور بارونق چوراہوں پر بڑے سائز کی پتنگیں بھی نصب کی جائیں گی۔

اخبار میں بسنت کے اس طرح منائے جانے اور اس کے بارے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے یا قومی یا غیر قومی ہونے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار محترم قاضی حسین احمد یا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فرمائیں گے کہ یہ شعبہ انہیں زعماء کا ہے۔ میں تو خود کھیل تماشوں کا رسیا شخص ہوں۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ تہوار کچھ اس سے بھی زیادہ شان و شوکت سے منایا جانا چاہیے۔ اور میرے پاس اس ضمن میں ٹھوس دلیلیں بھی موجود ہیں۔

مثلاً پہلی دلیل یہ ہے کہ اس وقت بھارت کنٹرول لائن پار کر کے پاکستان پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ آزاد کشمیر کے سرحدی دیہات پر آئے روز گولہ باری کر کے بے گناہوں کو شہید کرتا ہے۔ حتیٰ کہ نماز جنازہ پڑھنے والوں کو بھی گولوں کا نشانہ بناتا ہے۔ چھمب کے محاذ پر ہمارے کئی جوانوں نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں سات لاکھ بھارتی فوج گذشتہ دس برس سے نہتے کشمیریوں پر ہر طرح کے ظلم ڈھا رہی ہے۔ یہ حالات قوم کو افسردہ کرنے والے ہیں چنانچہ قوم کی افسردگی دور کرنا بہت ضروری ہے۔ اور میرے خیال میں یہ پروگرام اسی مثبت نظر سے ترتیب دیا گیا ہے۔ دعا کریں 20 فروری کو ہوا کا رخ امرتسر کی طرف ہو کہ جب ہزاروں تعداد میں پتنگیں بوہر کر امرتسر میں گریں تو اس خوف سے لالوں کی دھوتیاں گیلی ہو جائیں کہ اس قوم پر تو ہماری دھمکیوں اور تیر و تفنگ کا کوئی

اثر ہی نہیں' دوسرے جب یہ پتنگیں امرتسر کے پر ہجوم ہال میں گریں گی تو وہاں لٹیروں کے درمیان جو گھمسان کا رن پڑے گا وہ بھی دیدنی ہوگا' کئی زخمی ہوں گے بلکہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ لالوں کے مزید جانی نقصان کے لئے ''مسٹر لٹیرا 2000ء'' کا ایک ہاسٹل ایوارڈ بھارتیوں کے لئے مخصوص کیا جائے۔۔۔۔۔۔۔ہم بھارتیوں کو جنگ ہرانے کی تیاریاں کرنے کے بجائے انہیں امن کی مار ماریں گے۔

بسنت کے جشن کی اہمیت اس دفعہ یوں بھی زیادہ ہے کہ آئین معطل ہے' پارلیمنٹ معطل ہے' سیاست دان اندر ہیں' کچھ نظر بند ہیں کچھ منہ بند ہیں' لہٰذا کچھ تو کھلا ہونا چاہیے ورنہ تو سانس بھی بند ہو جائے گا' شاید اسی لئے اس جشن میں سانپوں اور بندروں کے کھلے تماشے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ یہاں قوم کو مختلف شکلوں کے سانپ نظر آئیں گے شکل اور عادات واطوار کے حوالے سے انسانوں سے مماثل بندر اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے قوم کو محظوظ کریں گے غرض کہ ٹھیک ٹھاک غیر سیاسی جشن ہوگا۔

تاہم اس سارے جشن میں میری سب سے زیادہ دل چسپی ''مسٹر لٹیرا 2000ء'' کے ٹائٹل سے ہے کاش یہ ٹائٹل صرف پتنگ بازی کے حوالے سے نہ ہوتا اس صورت میں کئی قومی اور بین الاقوامی شخصیتیں اس کی حقدار نظر آتیں۔ پروگرام کے آرگنائزر برادرم کامران لاشاری سے گذارش ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ اب بھی ٹائٹل کا دائرہ کار وسیع کر دیں۔ میں غیر سرکاری طور پر بسنت منانے کا قائل ہوں اور اسے ہندووانہ نہیں بلکہ موسمی تہوار سمجھتا ہوں لیکن اگر لاشاری صاحب میری تجویز کے مطابق متذکرہ ''آئینی ترامیم'' کر دیں تو اس سارے ہلے گلے میں' میں ان کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ بلکہ یقین دلاتا ہوں کہ قاضی حسین احمد اور ڈاکٹر اسرار کو بھی سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

◆◆◆

جسٹس سعید الزمان صدیقی

بنکاک سے اسلام آباد تک!

تھائی لینڈ کی سفارت کے دوران ایک روز میری سیکرٹری مس این نے میرے ہفتے بھر کے ٹائپ شدہ پروگرام میری میز پر دھرے اسٹینڈ میں لگائے تو اس میں چیف جسٹس سپریم کورٹ جناب سعید الزمان صدیقی کی بنکاک آمد کا پروگرام بھی تھا' وہ غالباً کوریا یا انڈونیشیا جا رہے تھے اور انہوں نے کچھ دیر کے لئے بنکاک ائیر پورٹ پر رکنا تھا۔ میں نے اپنی سیکرٹری کو بتایا کہ میں ان کی پذیرائی کے لئے ائیر پورٹ جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے میرے پروگرام میں انہیں ریسیو کرنا بھی درج کیا تھا' میں نے اپنے پی اے کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ چیف جسٹس کو سہولتیں فراہم کرنے کے لئے ائیر پورٹ پہنچیں مگر بدقسمتی سے اگلے ہی روز میری بائیں ٹانگ کا ایک مسل بہت بری ''پل'' ہو گیا جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ میں ائیر پورٹ نہیں پہنچ سکا۔ بلکہ اس وجہ سے اگلے پندرہ بیس دن تک میرے معمولات متاثر رہے' تاہم میری نمائندگی میری پولیٹکل قونصلر سید افتخار حسین شاہ نے کی اور میرے پی اے انور حسین بھی چیف جسٹس کی پذیرائی کے لئے ائیر پورٹ پر موجود تھے۔

سچی بات یہ ہے کہ میں تو سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس کو وہ پروٹوکول دینا چاہتا ہوں جو ان کا حق تھا یا میرے دل میں پاکستان کی عدلیہ کے لئے جو احترام تھا' یہ اس کا تقاضا تھا' چنانچہ جب میں اپنی مجبوری کی وجہ سے ائیر پورٹ نہ پہنچ سکا تو مجھے اس کا کوئی خاص ملال نہ تھا کہ یہ اگر کوتاہی تھی' تو دانستہ بہرحال نہیں تھی' ویسے بھی بنکاک میں وی آئی پیز کی آمد روفت بہت زیادہ تھی اور جہاں صورتحال یہ ہو وہاں سفیر حضرات کو ائیر پورٹ ''دیکھنے'' کا کچھ زیادہ شوق نہیں رہتا۔

مگر جب گذشتہ روز دنیا بھر کے ٹیلی ویژن (سوائے پاکستان ٹیلی ویژن) اور اخبارات نے یہ خبر دی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس جناب سعید الزمان صدیقی نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس میں سوائے بلوچستان ہائیکورٹ کے' دوسرے صوبوں کے ہائیکورٹ کے جج اور سپریم کورٹ کے متعدد جج شامل ہیں تو میری آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ مجھے پہلی دفعہ ملال ہوا کہ میں جسٹس صاحب کو خوش آمدید کہنے بنکاک ائیر پورٹ کیوں نہیں پہنچ سکا۔ اب میرے ذہن میں ان کا سرکاری

پروٹوکول نہیں ہے' اب کم سے کم میرے لیے سعید الزمان صدیقی ''تاحیات چیف جسٹس'' ہیں۔ اور اسی طرح وہ تمام جج صاحبان جنہوں نے اپنے ضمیر کے مطابق پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کیا اور جھنڈے والی کار' عالیشان زندگی اور شاندار مراعات کو اپنے اصولوں کی خاطر ٹھکرا دیا ہے۔ وہ سب میرے ہیرو ہیں۔ عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے وہ جج بھی پاکستانی قوم کی آنکھوں کا تارا ہیں جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں اسی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر کے ہمیں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل کیا تھا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے جن ججوں نے حلف اٹھایا ہے' انہوں نے بھی اپنے ضمیر کے مطابق کیا ہوگا چنانچہ حلف نہ اٹھانے والوں کی تعریف کو ان کی تنقیص نہ سمجھا جائے جنہوں نے حلف اٹھایا ہے۔ البتہ آنے والے دن ان کے امتحان کے دن ہوں گے' جب مولانا کوثر نیازی نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ دیا تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام انہوں نے ایک طویل خط لکھا جس میں جماعت سے استعفیٰ کی وجوہ بیان کی گئی تھیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں نیازی صاحب مرحوم و مغفور کو صرف چند لائنوں کا جواب لکھا اور وہ یہ تھا کہ میں نے آپ کے خط میں استعفے کی وجوہ کا مطالعہ کیا تاہم آپ کا آئندہ کا طرز عمل ان وجوہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے گا۔

میرے لئے یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ 12 اکتوبر کے بعد پہلی دفعہ ہمارے وکلاء اور بار ایسوسی ایشنوں نے اپنا وزن اسی پلڑے میں ڈالا ہے جس پلڑے میں ڈالنے سے کالے کوٹوں کی عزت اور ناموس قائم رہتی ہے۔ صرف میرے مرشد زادے جناب جسٹس (ر) جاوید اقبال (جو میرے لئے محبوب کی طرح ہیں) کے بیان نے مایوس کیا ہے۔ انہیں اختلاف کا حق تھا لیکن ان کے بیان سے ان ججوں کی تنقیص کا تاثر ابھرنا چاہیے تھا جن ججوں نے حلف نہیں اٹھایا!

◆◆◆

کلمہ شہادت!

جینا مرنا تو انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے مگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرنے کو ''زندگی موت'' کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً کچھ جینے والے ایسے ہیں کہ لوگوں کا جینا مشکل کر دیتے ہیں' زندہ رہنے کے لئے دو وقت یا چلیں تین وقت کی روٹی' ایک چھت' لباس' اور ڈاکٹر اور پولیس وغیرہ کی فیس کافی ہوتی ہے مگر جو لوگ جی بھر کر جینے کے شوقین ہیں' وہ اپنے لئے سو برس کا سامان جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں' اس جدوجہد میں دنیا بھر کے عارضے ان کو لاحق ہو جاتے ہیں چنانچہ کماتے وہ ہیں' عیش ان کا ڈرائیور کرتا ہے' ڈرائیور 500 مرسڈیز پر بیٹھ کر صاحب کے دفتر پہنچتا ہے اور صاحب ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ''واک'' کرتے ہوئے دفتر پہنچتے ہیں' ڈرائیور صاحب کے سامنے مرغ مسلم ڈکار رہا ہوتا ہے اور صاحب بہادر ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے گھاس پھونس پر گزارا کر رہے ہوتے ہیں۔ ان صاحب بہادر کے حصے خوشی کا لمحہ مہینے میں ایک دفعہ آتا ہے اور خوشی کا یہ لمحہ وہ ہوتا ہے جب انہیں بنک اسٹیٹمنٹ موصول ہوتی ہے' موصوف بنک بیلنس دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں جینے سے زیادہ مرنے میں دلچسپی ہوتی ہے چنانچہ یہ دن میں کئی مرتبہ کتنوں ہی پر مرتے ہیں' کچھ لوگ ان سے قدرے مختلف بھی ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو مرنے یا موت کی تقریبات وغیرہ میں شرکت کے حوالے سے خاصے سنجیدہ ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست اکثر ناشتے کی میز پر موت اور قبر کے عذاب کا ذکر کرتے ہیں' حالانکہ صبح کا موسم خوشگوار ہوتا ہے' پرندے چہچہا رہے ہوتے ہیں' انسان خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا ہوتا ہے لیکن انہیں ان لمحوں میں موت اور عذاب قبر وغیرہ کے بیان سے دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی طمانیت اور مسرت عیاں ہوتی ہے جس سے مجھے شک گزرتا ہے کہ شاید اس سارے بیان میں ان کا روئے سخن میری طرف ہے' میں اس ضمن میں اگر کبھی حسن ظن سے کام لوں تو یقین سا ہونے لگتا ہے کہ ان کی ڈیوٹی کافی طویل عرصے تک شاہی قلعے کے ٹارچر سیل میں رہی ہے! ان کے اسی ذوق وشوق کے پیش نظر میں نے ان سے سالگرہ پر انہیں خواجہ اسلام کی کتاب ''موت کا منظر' عرف مرنے کے بعد کیا ہوگا'' بطور تحفہ پیش کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس پر وہ چنداں خوش نہیں ہوئے بولے ''میرے پاس اس سے بھی زیادہ رونگٹے کھڑے کرنے والی کتاب ہے' جس میں عذاب قبر کے حوالے سے اس سے کہیں زیادہ ضعیف روایات موجود ہیں!''

میرے یہ دوست شادی بیاہ اور اسی طرح کی دوسری خوشی کی تقریبات میں بہت کم شرکت کرتے ہیں لیکن اگر ساتویں محلے میں

بھی کوئی مرگ ہو جائے' اس میں شرکت کا موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے' بلکہ روزانہ صبح اٹھتے ہی اخبار کا عرق ریزی سے مطالعہ کرتے ہیں کہ شاید خوبی قسمت سے وفات کی کوئی خبر آ جائے' صرف یہی نہیں بلکہ میرے اس دوست کے ان ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت قریبی تعلقات ہیں جن کے مریضوں کی تقدیر ان ڈاکٹروں اور حکیموں کے ہاتھوں میں لکھی ہوتی ہے' کبھی اندازے کی غلطی ہو جائے تو ان مریضوں کے گھر دو ایک دن پہلے بھی پہنچ جاتے ہیں۔

میرے اس دوست کے لئے وہ لمحہ بہت مسرت انگیز ہوتا ہے جب کسی مرحوم کی قبر تیار ہوتی ہے اور اس کے سائز کا اندازہ لگانے کے لئے حاضرین میں سے کسی کو اس کھدی ہوئی قبر میں لیٹنے کے لئے کہا جاتا ہے میرے یہ دوست اس طرح کی آواز کان میں پڑتے ہی فوراً قبر میں اترتے ہیں اور چت لیٹ کر آنکھیں کچھ ہنرمندی سے بند کر لیتے ہیں کہ گورکن کو بتانا پڑتا ہے کہ مردہ نہیں' مردے کی ڈمی ہے' ایک دفعہ تو ایک ستم ظریف گورکن نے یہ کہہ کر کدال میں مٹی ڈالنا شروع کر دی کہ ''قبر غلطی سے انہی صاحب کے سائز کی تیار ہو گئی ہے' نئی قبر بنانے میں دیر لگے گی' اب یہی چلنے دیں!''

موصوف کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ ہر وقت موت اور عذاب قبر کی باتیں کرنے کے باوجود جب جنازوں میں شرکت کرتے ہیں' اور پھر درمیان میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ''کلمہ شہادت'' کا نعرہ بلند کر ڈالتے ہیں۔ مجھے پرسوں ان کے ساتھ ایک جنازے میں شرکت کا اتفاق ہوا' موصوف نے حسب عادت اپنے من پسند موضوعات پر گفتگو شروع کر دی۔ میں نے انہیں ٹوکا اور کہا ''جنازوں میں کلمہ طیبہ کا ورد کرنا چاہیے یا مرحوم کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں! تم یہ کیا موضوع لے کر بیٹھ گئے ہو؟''

بولے۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' تم مجھے یہ بتاؤ کہ پی سی او کے تحت حلف اٹھائے جانے کے بعد عدلیہ اور آئین۔۔۔۔۔۔''

اور پھر حسب عادت جملہ ادھورا چھوڑ کر با آواز بلند ''کلمہ شہادت'' کہا اور پھر اس کے بعد پتہ نہیں کیوں خاموش ہو گئے؟

◆◆◆

ڈنڈا اور ڈنڈا بردار!

آرمی مانیٹرنگ ٹیم کے افسروں نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے بعض سچی باتیں کہیں جن میں سے سچی بات یہ ہے کہ ''ڈنڈا رکھیں تو ٹھیک' ورنہ لوگ بدمعاش بن جاتے ہیں'' یہی بات پنجابی کے دو تین محاوروں میں بھی قدرے مختلف انداز میں کہی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگوں کو صحیح رکھنے کے لیے آسمان سے چار کتابیں اور ڈنڈا زمین پر بھیجا گیا یا یہ کہ ڈنڈا بگڑے ہوئے لوگوں کا پیر ہے۔ اس ضمن میں ایک حکایت مولانا روم کی بھی ہے۔ لیکن وہ قدرے طویل ہے۔ چنانچہ اس کے بیان سے میرا کالم موضوع سے قدرے بھٹک جائے گا۔ تاہم اس حکایت کا لب لباب یہ ہے کہ ڈنڈا اگرچہ قوم کو سیدھے رستے پر رکھتا ہے۔ لیکن دور چار سال بعد جب یہ ڈنڈا اس پر سے اٹھا لیا جائے تو قوم واپس پھر سے اسی مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں وہ ڈنڈے کے استعمال سے پہلے کھڑی تھی۔

استاد ہونے کی وجہ سے میں ذاتی طور پر ڈنڈے کے استعمال کا پوری طرح قائل ہوں کہ اس کے بغیر ہمارے درسی اور قومی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ لیکن جہاں تک قومی مسائل کا تعلق ہے یہ ڈنڈا عمر فاروق کا ہونا چاہیے اور اسے انہی کے طریقے کار کے مطابق چلانا چاہیے۔ ایک چور کو قاضی نے اس کے ہاتھ کاٹنے کی سزا سنائی' چور اس فیصلے کے خلاف خلیفہ وقت عمر فاروق کی عدالت میں چلا گیا۔ عمر فاروق نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے چوری کیوں کی؟'' چور نے کہا ''میرے گھر میں تین دن سے فاقہ تھا' چنانچہ میں نے اپنے بچوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچانے کیلئے گندم چوری کی'' یہ سن کر خلیفہ وقت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور انہوں نے فرمایا ''پھر مجرم تم نہیں ہو مجرم میں ہوں' ہاتھ میرے کاٹے جانے چاہیں کہ میرے دور حکومت میں تم اور تمہارے بچے بھوکے سوتے رہے۔'' اس سے پہلے تو ہمارے ہاں اس طرح کا نظام عدل نافذ نہیں ہو سکا۔ کاش اب ہمارے فوجی حکمران بھائی ڈنڈے کا یہ فاروقی قانون نافذ کر سکیں۔

اسی طرح ایک اور مثال عمر فاروق ہی کے دور کی ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رات کے وقت مدینے کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے کہ انہیں ایک مکان سے ایک خاتون کے گانے کی آواز سنائی دی۔ خلیفہ وقت دیوار پھلانگ کر اندر گئے تو دیکھا کہ ایک جوان عورت گھر میں تنہا ہے اور پرسوز لے میں گیت گا رہی ہے۔ ہاتھ میں درہ پکڑے ہوئے عمر فاروق نے پوچھا ''تم کون ہو اور کیا تم حضور کے اس فرمان سے واقف نہیں کہ عورت کی آواز گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جانی چاہیے'' عورت نے جواب دیا۔ ''اجنبی

شخص! میں تمہارے سوال کا جواب بعد میں دونگی' پہلے تم یہ بتاو کہ تم کون ہو؟ حضرت عمر فاروق نے کہا ''میں خلیفہ وقت عمر فاروق ہوں۔'' اس پر عورت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اور وہ بپھر کر بولی ''اگر تم خلیفہ وقت عمر ہو تو کیا تم حضور کا یہ فرمان بھول گئے کہ کسی کے گھر میں' گھر کے مالک کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا اور تم دیوار پھاند کر آ گئے ہو۔''

یہ سن کر عمر فاروق سخت نادم ہوئے اور اس عورت کو اس غلطی پر معاف کرنے کی درخواست کی۔ عورت نے کہا ''میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ میرا شوہر تین سال سے جہاد پر گیا ہوا ہے۔ اور میں یہ گیت اس کے ہجر میں گا رہی تھی۔'' یہ سنتے ہی حضرت عمر سیدھے اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی سے پوچھا کہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کا زیادہ سے زیادہ عرصہ کتنا ہونا چاہیے۔ ان کی بیوی نے کچھ مدت بتائی' جس پر صبح ہوتے ہی عمر فاروق نے فرمان جاری کیا کہ کسی فوجی کو اتنی مدت سے زیادہ اس کے گھر سے دور نہ رکھا جائے۔

میرے فوجی بھائیو! ڈنڈا استعمال کرتے ہوئے ایک تو انسانی فطرت کو بھی مدنظر رکھو اور دوسرے آئین اور قانون کے مطابق مجرموں کو سزا ضرور دلواؤ' لیکن چادر اور چار دیواری کی حرمت پامال نہ ہونے دو۔ اگر کوئی مجرم ہے تو اسے اس کا جرم بتاؤ اور اسے عدالت کے سامنے پیش کرو۔ کسی کو یہ اجازت نہ دو کہ اسے اس کے گھر سے اٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر کوئی انہیں مہینوں بند رکھے اور اسے جرم سے بھی آگاہ نہ کیا جائے..... میں سو فیصد ڈنڈے کے استعمال کے حق میں ہوں۔ مگر ڈنڈے کی عزت اور فوج کی محبت دلوں میں برقرار رکھنے کے لئے ابوبکر صدیق کی صداقت' عمر فاروق کی عدالت' عثمان غنی کی حیا اور شرم اور حیدر کرار کا علم اور شجاعت اس سارے عمل کے ہمرکاب رہنا چاہئیں! اگر کسی ڈنڈے میں یہ صفات ہوں تو وہ قابل احترام ہوتا ہے ورنہ اسے سراپا انتقام سمجھا جاتا ہے!

◆◆◆

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا!

وزیر آباد سے پرائمری پاس کرنے کے بعد نقل مکانی کر کے میں اپنے خاندان کے ساتھ ماڈل ٹاؤن لاہور میں آباد ہوا تو یہاں ماحول بالکل مختلف تھا۔ وزیر آباد میں سفر کے لئے تانگہ ہوتا تھا یا تانگیں۔۔۔۔۔۔۔ جب کہ ماڈل ٹاؤن میں ہر طرف کاریں تھیں۔ وزیر آباد میں میرے دوست پھیکا' پلہو' چھبا اور چھاؤ وغیرہ تھے۔ اور ماڈل ٹاؤن میں میری دوستی مسعود علی خاں' مالک' طارق بخاری' اکی' عارف' خالدی' سعید اور منیر احمد شاہ وغیرہ کے ساتھ تھی۔ ان میں سے خالدی اور عارف' اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مالک' طارق' اکی امریکہ میں ہیں' مسعود اور منیر امریکہ سے واپس پاکستان آ چکے ہیں۔ میں بھی ان دوستوں کے ساتھ امریکہ گیا تھا مگر دو سال بعد ہی واپس وطن آ گیا تھا۔

میری زندگی کا یہ دور نا قابل فراموش ہے جو ماڈل ٹاؤن میں اپنے دوستوں کی معیت میں گزرا' عین عالم شباب تھا' طبیعت ہر وقت شرارت اور شوخی کی طرف مائل رہتی تھی' اوپر سے صحبت بھی کچھ اس قسم کی تھی یعنی صحبت ''طالع'' ''ترا'' ''طالع'' کند والا معاملہ تھا' اچانک پروگرام بنتا اور دوستوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر مری چلے جاتے یا پشاور کا رخ کرتے' رات کو روزانہ دیر سے گھر لوٹنا معمول تھا۔ والد ماجد میرے آنے تک جاگ رہے ہوتے اور پھر جائے نماز بچھا کر میری بخیریت واپسی کے لئے جو نفل مانے ہوتے' وہ پڑھنے بیٹھ جاتے۔ والد ماجد نے پوری زندگی میں جتنی عبادت کی' اس کا کچھ نہ کچھ کریڈٹ مجھے بھی جاتا ہے۔ جب کبھی زیادہ دیر ہو جاتی اور دروازے پر دستک دینا مناسب نہ سمجھتا تو مالک (جوان دونوں لاس ویگاس میں چوٹی کا ڈاکٹر ہے۔) گھوڑی بنتا اور میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر گھر کی دیوار پر چڑھ جاتا اندر مکمل اندھیرا ہوتا اور گرمیوں کے موسم میں سب گھر والے صحن میں سو رہے ہوتے جب میں اپنے صحن میں دھم سے کودتا تو سب کی آنکھ کھل جاتی۔ اور باہر سے مالک کی آواز سنائی دیتی۔ پہلے زیور' پھر روپیہ اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو گولی چلا دینا' کئی ایک دفعہ تو اس صورت حال پر گھر والوں کی چیخیں نکل گئیں۔

جوانی کے اس دور میں ہر روز' روز عید اور ہر شب' شب برات محسوس ہوتی تھی۔ ہم معمولی' معمولی باتوں پر سارا سارا دن ہنستے رہتے۔ ہم دوست کبھی کبھی مسجد کے لان میں بیٹھ کر لمبی گپ شپ کرتے تھے' ایک نابینا گداگر ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا اور بہت بھیانک آواز میں قرات کرنے لگتا' اس پر ہم نے اس کے ساتھ معاہدہ کیا کہ وہ آ کر ہمارے پاس چپ چاپ کھڑا ہو جائے گا اور ہم

خود ہی اسے کچھ دیا کریں گے۔ ایک دن ہم دوست اس طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ یہ نابینا گداگر ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور معاہدے کے مطابق خاموشی سے بھیک کا انتظار کرنے لگا' ہم اپنی فضول سی باتوں میں اتنے مگن تھے کہ ہمیں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے دو منٹ انتظار کیا اور پھر کہا'' کچھ دیتے ہو کہ میں شروع کروں تلاوت!'' اس کے اس جملے پر ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے اور اس روز ہم نے اسے معمول سے دوگنا زیادہ پیسے دیئے!

ایک واقعہ جو مجھے آج بھی یاد آتا ہے تو میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے حالاں کہ اس وقت میں خاصا شرمندہ ہوا تھا' ردعمل کی اس تبدیلی کی وجہ میں بعد میں بتاؤں گا! ایک روز ہم دوست منیر شاہ کے بھائی زبیر سے ملنے ایچی سن کالج گئے جو وہاں ہاسٹل میں قیام پذیر تھا۔ وہاں نماز کا وقت ہو گیا' مسجد کالج کے اندر موجود تھی ہم مسجد میں گئے تو جماعت ہو چکی تھی' عارف مرحوم نے مجھے امامت کرانے کے لئے کہا' میں نے بہت انکار کیا' مگر سب دوستوں کا مشترکہ اصرار تھا کہ نماز تم ہی کراؤ گے۔ آخر میں مجبوراً مصلے پر کھڑا ہو گیا' ان سب نے میرے پیچھے صفیں باندھ لیں' چونکہ انہوں نے امامت کے لئے مجبور کیا تھا' لہٰذا میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ نماز کو جتنا طول دے سکا' دوں گا چنانچہ مجھے جتنی لمبی لمبی آیات یاد تھیں میں نے وہ پورے عربی لحن کے ساتھ قرات کیں' کئی منٹ رکوع اور سجود میں صرف کئے' تقریباً بیس منٹ بعد میں نے نماز ختم کر کے سلام پھیرا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہ تھا' سب کے سب ذرا فاصلے پر کھڑے کھڑ کھڑ ہنس رہے تھے۔

پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ مذاق صرف میرے ساتھ ہوا ہے' جب ذرا بڑا ہوا تو پتہ چلا کہ ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی سیاسی جماعتوں کے سب قائدین کے ساتھ ان کے مقتدی یہی مذاق برس ہا برس سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ قائد بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ امامت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ پیچھے صف در صف مقتدی سر جھکائے کھڑے ہیں' مگر انتخابات ہوتے ہیں تو مقتدی پرے کھڑے دانت نکال رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دن کے بعد میں اپنے ساتھ ہونے والے ''سلوک'' کو انجوائے کرتا ہوں' نادم نہیں ہوتا' صرف یہ سوچ کر کہ یہ ہاتھ تو بڑے بڑوں کے ساتھ ہوتا ہے' میں تو اس وقت ویسے ہی بچہ تھا۔

◆◆◆

مولا جٹ!

میرے ایک اذیت پسند دوست ہیں جن کو ہر بری خبر اچھی معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ اسے ''مذہبی فریضہ'' سمجھ کر آگے پھیلاتے ہیں' انہیں میں ہر سال میٹرک کے رزلٹ کے دنوں میں خصوصاً سرگرم عمل دیکھتا ہوں' موصوف کی بورڈ میں متعلقہ کلرک سے واقفیت ہے چنانچہ رزلٹ نکلنے سے قبل وہ اپنے علاقے کے فیل ہونے والے طلبہ کی لسٹ اس سے حاصل کرتے ہیں اور پھر ان طلبہ کے گھر والوں کی پیشگی اطلاع دینے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں' وہ اپنی اس اطلاع کے لئے وقت کا تعین بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں' یعنی رات کو تقریباً دو بجے کا وقت انہیں اس اطلاع کے لئے موزوں لگتا ہے کیوں کہ اس وقت سب اہل خانہ سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور جب آدھی رات کو دروازہ مسلسل پیٹے جانے کے نتیجے میں کوئی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اس کے پوری طرح بیدار ہونے سے پہلے اسے کوئی بری خبر سنائی جائے تو اسے ملنے والی اذیت کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فیل ہونے والے طالب علم کی گہری نیند کے دوران چھترول شروع ہو جاتی ہے اس کی چنگھاڑیں گلی میں کھڑے ہوئے اذیت پسند دوست کے کانوں میں پڑتی ہیں ''ملک صاحب! منڈا فیل ہو گیا جے'' اس کے بعد ''منڈے'' کی چنگھاڑیں شروع ہو جاتی ہیں!

موصوف لوگوں کو اذیت دینے کے لئے صرف یہی حربہ استعمال نہیں کرتے' ان کے پاس لوگوں کے حوصلے پست کرنے کے اور بھی بہت نسخے ہیں جو اکثر کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً موصوف گھر سے نکلتے ہیں اور شیخ صاحب کے گھر جا پہنچتے ہیں انہیں دیکھتے ہیں اپنے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں ''شیخ صاحب' خیر تو ہے آپ کا رنگ پیلا پڑا ہوا ہے؟'' شیخ صاحب جو اچھے خاصے خوشگوار موڈ میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے' اس وقت تو اس کی بات کو اہمیت نہیں دیتے اور کہتے ہیں ''نہیں برادر آپ کو وہم ہوا ہے' میں الحمدللہ ٹھیک ٹھاک ہوں'' مگر ان کے جاتے ہی وہ آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں اور دائیں بائیں سے خود کو غور سے دیکھتے ہیں' بس اس کے بعد شیخ صاحب ہوتے ہیں اور ڈاکٹر اور ڈاکٹر صاحبان جو ان کے ڈبل نمونیے سے کینسر تک کے سارے ٹیسٹ اپنی لیبارٹری یا جہاں سے کمیشن طے ہو' اس لیبارٹری سے کرواتے ہیں اور اس کے نتیجے میں شیخ صاحب واقعی بیمار پڑ جاتے ہیں!

شہر میں کوئی بم دھماکہ ہو' ٹرین کا حادثہ ہو جائے' کوئی جہاز بحرالکاہل میں جا گرے' کوئی لڑکی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ جائے'

محلے میں چار پائی پر بیٹھ کر ''منگ پتا'' کھیلنے والے جواری پکڑے جائیں' کوئی لڑکا ہیروئن پینا شروع کر دے یا کسی کو ہیروئن سمجھنا شروع کر دے کسی گھر میں ڈاکہ پڑ جائے' بس اس روز میرے اس دوست کی عید ہو جاتی ہے' موصوف خوشی سے سارا دن ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں اور پھر چشم زدن میں یہ خبر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ موصوف خبر کے ساتھ مرچ مصالحہ اس قدر لگا دیتے ہیں کہ خبر کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور مرچ مصالحہ باقی رہ جاتا ہے۔ خصوصاً کسی گھر میں ڈاکے کی خبر سنتے ہیں تو پھر اس میں اپنی ذاتی خواہشات ملانا شروع کر دیتے ہیں ''اللہ خیر کرے' بہو بیٹیوں والا گھر ہے' دعا کرو جی اللہ سب کی شرماں رکھے''

میرے یہ دوست بیکار ہیں' میں انہیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شام کا اخبار نکالیں مگر انہوں نے میرا مشورہ نہیں مانا' ان کا کہنا ہے کہ ''شام کے اخبارات سے میری اپنی ''سرکولیشن زیادہ ہے' ان کا کام ایک دو گھنٹے کا ہے جب کہ میں چوبیس گھنٹے اسی ڈیوٹی پر ہوتا ہوں!'' بہرحال میرے اس دوست کے دم سے محلے کی رونق قائم ہے اور یہ ہمارا ایگزاسٹ فین بھی ہیں ان کی وساطت سے ہم سب کی جبلی اذیت پسندی اور بے شمار کمینگیوں کی تسکین ہوتی رہتی ہے' ہم شریف لوگ ہیں' اپنے منہ سے یا عمل سے ایسی باتیں کریں تو ہماری شرافت اور وضعداری پر حرف آتا ہے۔ ہم تو قتل و غارت گری والی فلمیں بھی اسی لئے دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص کے اندر جو مولا جٹ بیٹھا ہوا ہے! ہم مہذب ہونے کی وجہ سے اسے باہر نہیں آنے دیتے۔ چنانچہ اسے پردہ سکرین پر وہ سب حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنے لاشعور کو مطمئن کر دیتے ہیں جو حرکتیں ہم خود شعوری طور پر نہیں کر سکتے..... یہی وجہ ہے کہ ایک فورم میں بڑے بڑے دانشوروں نے ''مولا جٹ'' کا دفاع کیا تھا اور بتایا تھا کہ مولا جٹ آخر مولا جٹ کیوں بنا؟ انہوں نے اس کی ایک وجہ پولیس نیز عدالتی اور ملکی قوانین بھی بتائے' اس کے علاوہ ان دانشوروں نے مولا جٹ کی موجودگی کے اتنے جواز پیش کئے کہ اس دن سے اپنے بھلے مانس ہونے پر بھی دل میں کچھ شرمندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے!

◆◆◆

نوردین ٹی سٹال!

میرے محلے میں ایک نوردین ٹی اسٹال ہے' اس کا مالک نوردین بڑا ایماندار آدمی ہے' اس کے پاس ملک چلانے کے بے شمار منصوبے ہیں لیکن اس کا ٹی اسٹال نہیں چلتا۔ اس کا ٹی اسٹال نہ چلنے کی دیگر وجوہ میں سے ایک وہ یہ ہے کہ سارا دن اس کی دکان پر محلے بھر کے ''وہیلے'' نوجوانوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے جو گاہک نہیں ہوتے بلکہ گاہک بھگانے والے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں دیکھ کر کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ خود میرا اپنا شریف ہونا بھی مشکوک ہو گیا ہے کیوں کہ میں اکثر اس کی دکان پر پایا جاتا ہوں اور میرے اس دکان پر جانے کی وجہ نوردین کی حب الوطنی' ایمانداری اور اس کی بیوقوفی کی باتیں ہیں جنہیں وہ پورے دانشورانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے! چند ہفتے پہلے میں اس کی دکان پر بیٹھا حالات حاضرہ پر اس کی حکیمانہ گفتگو سن رہا تھا کہ اچانک وہ جوش میں آ گیا اور اس عالم جوش میں بھول گیا کہ اس نے انگیٹھی پر پانی گرم کرنے کے دھری تام چینی کی چینک رومال سے پکڑنے کی بجائے براہ راست ہاتھ سے پکڑ لی ہے جس کے نتیجے میں وہ کافی دیر تک اپنی انگلیاں منہ میں ٹھونس کر بیٹھا رہا۔ جب اس کی جلن میں قدرے کمی آئی تو بولا ''قاسمی صاحب ہماری حکومتیں تو بیوقوف ہیں' انہیں ملک چلانا ہی نہیں آتا'' میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا تو اسے اپنی بات میں سب سے زیادہ وزن محسوس ہوا چنانچہ جوش و خروش سے بولا ''عوام کے مسائل کیا ہیں؟ غربت و افلاس' جاگیرداری' بیروزگاری' دہشت گردی' ڈاکے' خودکشیاں' اغوا' جبری عصمت دری' لاقانونیت' تھانے کچہریوں میں ہونے والے مظالم اور ناانصافیاں ملاوٹ' رشوت' ناجائز قبضے' صحت اور صفائی کی ناکافی سہولتیں اور قدم قدم پر عزت نفس کی پامالی! کیوں قاسمی صاحب یہی مسئلے ہیں نا! جمہوریت تو کوئی مسئلہ نہیں؟''

میں نے کہا ''نوردین تم صحیح کہتے ہو' بنیادی مسئلے تو یہی ہیں' یہ حل ہو جائیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ مگر اس وقت پوری دنیا میں جمہوریت.....'' نوردین نے مجھے درمیان میں ٹوک دیا ''میں ادھر بھی آتا ہوں' آپ پہلے میری اس بات کا جواب دیں کہ کیا پاکستان کی کوئی حکومت یہ مسائل حل کرنے میں کامیاب ہوئی؟'' میں نے کہا ''نہیں! مگر اس کے لئے کوششیں تو ہوتی رہی ہیں'' نوردین میری یہ بات سن کر ہنسا اور پوچھا ''تو بتائیں یہ کوششیں کامیاب کیوں نہیں ہوئیں؟'' میں نے کہا ''اس بات کی بہت سی دوسری وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں کسی منتخب حکومت کو پوری دلجمعی کے ساتھ اور پورا عرصہ کام ہی نہیں کرنے دیا گیا''

اس پر نوردین گرمی کھا گیا ''میں ادھر بھی آتا ہوں' پہلے ناکامی کی وجہ سن لیں' اصلاح احوال میں ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پریس کو پوچھنے والا ہی کوئی نہیں' یہ لوگوں کو مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم بھوکے ہو' غریب ہو' مظلوم ہو' اگر پریس کو لگام دے دی جائے تو کبھی لوگوں کا دھیان ان مسئلوں کی طرف جائے گا ہی نہیں اور یوں سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے'' میں نے نوردین کی یہ گفتگو سنی تو گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں وزیر اطلاعات جاوید جبار تو کان لگا کر یہ گفتگو نہیں سن رہے؟

خدا کا شکر ہے کہ نوردین کو میری گھبراہٹ کا اندازہ نہیں ہوا ورنہ اس کی عالمانہ گفتگو کے چسکے سے محروم رہ جاتا اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو ایک دفعہ پھر رواں ہو گیا ''اب میں آتا ہوں آپ کی جمہوریت' انسانی حقوق' آئین اور اس طرح کے جو دوسرے لفظ آپ لوگ بولتے رہتے ہیں' اس کی طرف! کیا ضرورت ہے اخباروں میں یہ خبریں شائع کرنے کی پی سی او کے تحت فلاں جج نے حلف اٹھایا اور فلاں نے نہیں اٹھایا۔ نواز شریف نے یہ کہا' قاضی حسین احمد نے وہ کہا' کلنٹن اس بات پر زور دیتا ہے' ٹونی بلیئر انتخابات کا ٹائم ٹیبل مانگتا ہے' فلاں کو بغیر وجہ بتائے نامعلوم مقام پر قید کر دیا گیا' فلاں کو پھینٹی لگائی گئی' ملزم کو اپنا جرم خود ثابت کرنا پڑے گا۔ امن و امان حکومت کی ذمہ داری نہیں' عوام اپنی حفاظت خود کریں وغیرہ وغیرہ' حکومت ایک قانون بنائے کہ امن عامہ میں خلل ڈالنے والی اس طرح کی خبروں اور کالموں اور اداریوں پر حکومت کو ہر قسم کی کاروائی کا اختیار ہو گا بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ٹی وی اور ریڈیو کی خبریں ہی کافی ہیں' انتشار پھیلانے والے یہ اخبارات بند ہی کر دینا چاہئیں' ان سے بیرون ملک پاکستان کی بدنامی ہوتی ہے'' میں نے ایک دفعہ پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں اس دفعہ یہ آئینی اور قانونی مشورے ''آئینی ترامیم'' کا کوئی ماہر نہ سن رہا ہو!

اس گفتگو کے چند روز بعد ہی میں ایک بار پھر نوردین کی گفتگو کے چسکے لینے کے لئے اس کی دکان پر گیا تو دیکھا ''نوردین ٹی اسٹال'' کا بورڈ غائب تھا اور دکان کو تالا لگا ہوا تھا' میں نے باہر کھڑے بھولے ٹینک سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے چپچی ناک میں ڈالتے ہوئے کہا ''اللہ بہتر جانتا ہے جی' سنا ہے اسلام آباد گیا ہوا ہے' کہتا تھا ''وزیر قانون'' شریف الدین پیرزادہ کا فون آیا ہے!''

◆◆◆

شاہراہ برگر!

نثر میں طنز و مزاح کے پانچ بنیادی ستون جن میں پطرس بخاری، شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان اور ابن انشاء شامل ہیں۔ اس وقت مجھے ابن انشاء کا ایک جملہ یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اہل پنجاب جتنا خیال اپنی صحت کا رکھتے ہیں، کاش اتنا خیال وہ زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور اہل زبان جتنا خیال زبان کا رکھتے ہیں، کاش اتنا خیال وہ اپنی صحت کا بھی رکھیں۔

پھر اہل پنجاب میں سے خصوصاً اہل لاہور کھانے پینے کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں، اس کا انداز آپ اس واقعہ سے لگائیں کہ لاہور میں ایک لاہوریئے نے فور سٹار ہوٹل کھولا، اس نے پہلے دن سٹاف کی میٹنگ بلائی اور کہا کہ اگر مجھے کبھی یہ شکایت ملی کہ کسی کمرے کا کوئی قالین پوری طرح صاف نہیں ہے تو ممکن ہے میں یہ خطا معاف کر دوں یا مجھے کسی گاہک سے عدم توجہ کی شکایت موصول ہوئی تو ہو سکتا ہے میں یہ غلطی بھی نظر انداز کر دوں لیکن اگر کسی گاہک نے مجھے یہ کہا کہ کھانا گرم نہیں تھا یا مزیدار نہیں تھا تو میرے نزدیک یہ نا قابل معافی جرم ہوگا..... اور آپ یقین کریں کہ جب تک یہ ہوٹل ان صاحب کی ملکیت میں رہا، حفظان صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی اور مزیدار کھانوں کی وجہ سے یہاں گاہکوں کا وہ ہجوم ہوتا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔

خود میں بھی ''لاہوریا'' ہوں چنانچہ مجھے کھانوں میں سے صرف مضر صحت کھانے پسند ہیں بہر حال لاہور میں ہر طرح کے کھانے دستیاب ہیں اور شائقین جوق در جوق ان ریستورانوں اور دوکانوں کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کی لذت کام و دہن کا پورا اہتمام ہو بلکہ صورت حال یہ ہے کہ لاہوریئے ان سڑکوں کو کارپوریشن کے دیئے ہوئے ناموں سے نہیں پکارتے بلکہ انہوں نے ان کے نام ان علاقوں میں ملنے والی خوراک کے حوالے سے رکھے ہوئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اب ان سڑکوں کے وہی نام ہونا چاہیں جو اس کے کلچر کے عکاس ہوں مثلاً پرانی انارکلی میں فالودوں کی دوکانیں قطار اندر قطار ہیں، اس کا نام ''شاہراہ فالودہ'' ہونا چاہیے۔ نسبت روڈ عبدالرحمن امرتسری کے ہریسے کی وجہ سے مشہور ہے لہٰذا نسبت روڈ کو ''ہریسہ روڈ'' کہنے میں کوئی حرج نہیں اسی طرح ''گڑھی شاہو'' مضحکہ خیز نام ہے، یہاں حافظ ملک شاپ وغیرہ کی دھوم ہے، لہٰذا گڑھی شاہو کو حافظ روڈ کا نام دینے سے ''گڑھی شاہو'' سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ اور اس کے علاوہ ایرانی یہ سمجھیں گے کہ اس سڑک کا نام حافظ شیرازی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

اسی طرح لکشمی چوک ایک تو ہندووانہ نام ہے، دوسرے اس سڑک پر یا تو صرف چٹ پٹا کھانا ملتا ہے اور یا پھر کھانے والے ملتے

ہیں لہٰذا اس کا نام ''شاہراہ کھابہ گیراں'' بہت مناسب ہے۔ مال روڈ کا نام تبدیل کر کے شاہراہ قائداعظم رکھا گیا تھا مگر قائداعظم کی اس شاہراہ سے صرف ریلوں اور ریلیوں کے شرکاء کو لاٹھیوں سے مارنے کا کام لیا جاتا ہے..... گویا اب یہ سڑک بھی کھانے کی وجہ سے مشہور ہے خواہ یہ کھانا مار کھانے ہی کی ذیل میں کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اب اس سڑک کا نام ایک دفعہ پھر تبدیل کر کے ''شاہراہ مار پیٹ'' رکھا جا سکتا ہے۔ اس نام میں ایک معنویت یہ بھی ہے کہ ''مار پیٹ'' میں سے ''پیٹ'' کے لفظ کو کئی لوگ پاپی پیٹ کا حوالہ سمجھیں گے!

کالم کے آخر میں مجھے خیال آیا ہے کہ اگر لاہور کی سڑکوں کے نئے نام لوگوں کی پسندیدہ خوراک کے حوالے سے رکھنا چاہیں تو آخر بیچارے اسلام آباد کا کیا قصور ہے؟ اس کی سڑکوں کے نام بھی تبدیل ہونا چاہئیں مگر پھر خیال آیا کہ اسلام آباد کا تو کوئی کلچر ہی نہیں ہے' کلچر کا تعلق ''کلچے'' سے ہوتا ہے اور وہاں ابھی تک کسی کو کلچہ بنانے کا سلیقہ ہی نہیں آیا' ہاں بارہ اکتوبر کے فوجی ''انقلاب'' کے بعد سے ''برگر کلچر'' ہونا چاہیے' اب سوال یہ ہے کہ کس سڑک کو یہ اعزاز بخشا جائے..... میری حقیر رائے میں آئین ان دنوں چونکہ معطل ہے' لہٰذا اسلام آباد کی ''شاہراہ آئین'' خواہ مخواہ لوگوں کو آئین کی یاد دلاتی رہتی ہے' لہٰذا ایک پنتھ دو کاج کے مصداق' میرے خیال میں ''شاہراہ آئین'' کو ''شاہراہ برگر'' قرار دینا چاہیے۔

◆◆◆

کالم، خبریں اور خلیل جبران کی ایک نظم

گذشتہ دنوں میرے ایک عزیز کالم نگار دوست کا کالم شائع ہوا جس میں اس نے لکھا ہے کہ نواز حکومت نے صرف ایک ہی اچھا کام کیا تھا اور وہ گردوں کے ہسپتال کا قیام تھا۔ جہاں غریبوں کا مفت علاج ہوتا تھا مگر موجودہ حکومت نے یہ سہولت واپس لے لی۔ ایک بزرگ کالم نگار نے لکھا کہ نواز حکومت نے صرف ایک ہی اچھا کام کیا ہے اور وہ شادی بیاہ پر کھانے کی پابندی تھی مگر وہ موجودہ حکومت میں یہ کام دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ ایک اور کالم نگار دوست نے لکھا کہ نواز حکومت نے صرف ایک ہی اچھا کام کیا ہے اور وہ ملک بھر میں سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر تھی، مگر موجودہ حکومت میں منصوبے بے التوا کا شکار ہو گئے ہیں، ایک اور کالم نگار نے لکھا کہ نواز حکومت نے صرف ایک ہی اچھا کام کیا ہے اور وہ بے روزگار نوجوانوں کو کاروبار کے لئے قرضوں کی سکیم تھی مگر اس سکیم کا بھی پتہ نہیں کہ یہ کس حال میں ہے!

انسانی حقوق کمیشن پاکستان کی جنرل سیکرٹری محترمہ حنا جیلانی نے پاکستان لیبر پارٹی کے زیر اہتمام ''فوجی حکومت کے محنت کش طبقات پر اثرات'' کے موضوع پر منعقد ایک سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حکومت میں اگرچہ ہمارے بہت سے دوست شامل ہیں لیکن انہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ فوج اور ہمارے مفادات میں فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ نواز حکومت چاہے جیسی بھی تھی، لیکن عوام کو ان کے جانے کی امید تو تھی جب کہ آج ہمیں فوجیوں کے جانے کی امید بھی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ احتساب کرنے آئے ہیں، وہ پہلے جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کے بیٹوں کا احتساب کریں!

جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمن گروپ) کی جنرل کونسل کے اجلاس میں منظور کی گئی قراردادوں میں کہا گیا کہ موجودہ حکومت کی پالیسیاں سابق دور ہی کا تسلسل ہے، پہلے عملاً آئین معطل تھا اب باقاعدہ ہے۔ 12 اکتوبر کا اقدام غیر آئینی ہے۔ قوم نے عسکری قیادت سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ اب مایوسیوں میں بدل گئی ہیں، عام آدمی صرف ٹیکس دینے کے لئے کما رہا ہے۔ مارشل لاء نہ ہونے کے دعوے کے باوجود آئین کا معطل ہونا سمجھ سے بالاتر ہے، اسلامی دفعات کو تحفظ نہیں دیا گیا، احتساب کے نام پر کالے قوانین لائے جا رہے ہیں۔ احتساب آرڈیننس غیر اسلامی کالا قانون ہے جس نے ہر پاکستانی کو پیدائشی مجرم قرار دے دیا ہے جسے کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ سیکورٹی کونسل اور کابینہ میں ایسے افراد ہیں جن پر حب الوطنی اور مذہب کے حوالے سے اطمینان نہیں

آئین بحال اور کالے قوانین واپس لئے جائیں سی ٹی بی ٹی پر دستخط ملکی سلامتی پر سودے بازی ہے۔ این جی اوز اور آغا خان فاؤنڈیشن پر پابندی عائد کی جائے!

بی بی سی نے حالیہ دھماکوں کے بارے میں نشر کردہ ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ بم پھٹنے کے واقعات سے شہری سخت اضطراب میں مبتلا ہیں عوام کا کہنا ہے کہ پہلے نواز شریف کی حکومت تھی اور اس سے پہلے سابقہ حکومتوں میں دہشت گردی کا یہ سلسلہ چلتا رہا ہے۔ اب فوجی حکومت آگئی ہے اور اس سلسلے میں کمی آنے کی بجائے الٹا تیزی آئی ہے بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں مزید کہا ہے کہ لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ انتظامیہ یا پولیس کیا انتظامات کر رہی ہے انہیں تو صرف اپنی جان و مال کا تحفظ چاہیے جس کی فراہمی میں انتظامیہ اور پولیس بری طرح ناکام نظر آتی ہے!

پاکستان مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد راجہ ظفر الحق نے پریس کو بریفنگ دیتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کے حالیہ بیانات کو غیر سنجیدہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں تبدیلی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے کوئی اچانک حادثہ نہیں ان بیانات سے اصل صورتحال واضح ہوگئی ہے۔ جنرل صاحب کا یہ کہنا ہے کہ بے نظیر اور نواز شریف دونوں میں سے کسی کو اقتدار نہیں دیا جائے گا' یہ عدلیہ سے مذاق کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے حالات کے بارے میں پاکستانیوں سے زیادہ عالمی سطح پر لوگ زیادہ باخبر ہیں اور آخر میں خلیل جبران کی ایک نظم کا ترجمہ:

میرے دوستو! قابل رحم ہے وہ قوم جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں لیکن دل یقین سے خالی ہے!

قابل رحم ہے وہ قوم جو ایسے کپڑے پہنتی ہے جن کو اس نے خود نہیں بنایا!

جو ایسی روٹی کھاتی ہے جس کے لئے گندم اس نے خود نہیں اگائی! اور ایسی شراب پیتی ہے جو اس کے اپنے میخانوں میں نہیں بنی!

قابل رحم ہے وہ قوم جو بڑھکیں لگانے والوں کو اپنا ہیرو بنا لیتی ہے۔

اور چمکتی ہوئی تلوار سے بنے ٹھنے فاتح کو اپنا ان داتا سمجھتی ہے!

قابل رحم ہے وہ قوم جو بظاہر خواب کی حالت میں بھی ہوس اور لالچ سے نفرت کرتی ہے!

مگر عالم بیداری میں مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے!

قابل رحم ہے وہ قوم جو جنازوں کے جلوس کے علاوہ کہیں اپنی آواز بلند نہیں کرتی اور اپنی مرضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی سامان نہیں!

اور وہ اس وقت تک صورت حال کے خلاف احتجاج نہیں کرتی جب تک اس کی گردن عین تلوار کے نیچے نہیں آ جاتی!

قابل رحم ہے وہ قوم جس کے نام نہاد سیاستدان لومڑیوں کی طرح مکار اور دھوکے باز ہیں

اور جس کے دانشور محض شعبدہ باز اور مداری!

اور جس کے فنون کا عالم یہ ہے جیسے مسخروں کی جگت بازیاں اور بھانڈوں کی نقلیں!

قابل رحم ہے وہ قوم جو اپنے نئے حکمرانوں کے راستے میں استقبال کے لئے ہار لئے کھڑی ہوتی ہے

اور ڈھول بجا کر ان کو خوش آمدید کہتی ہے

اور جب وہ اقتدار سے محروم ہوں' ان پر آوازیں کستی ہے اور ان کا تمسخر اڑاتی ہے اور عین اس وقت بھی اس بات کے لئے آمادہ ہوتی ہے کہ یہ اقتدار سے محروم ہوں تو نئے آنے والوں کی پذیرائی کے لئے بینڈ باجے تیار رکھے!

قابل رحم ہے وہ قوم جس کے اہل علم و دانش وقت کی گردش میں گونگے اور بہرے ہو کر رہ گئے ہیں

اور جس کے مرد ان جری نے ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھا

اور قابل رحم ہے وہ قوم جو ٹکڑوں اور قومیتوں میں بٹ چکی ہے اور جس کا ہر طبقہ اپنے آپ کو پوری قوم سمجھتا ہے!

◆◆◆

ذرا مختلف قسم کا کام

میں نے بچپن میں بزرگوں سے سنا تھا کہ خواتین کا ادب کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے خواتین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے روحی کنجاہی' ناہید شاہد' زیبا ناروی' اور دوسری خواتین کا لکھا ہوا ادب پڑھنا شروع کر دیا۔ جب پتہ چلا کہ یہ تینوں شعراء خواتین نہیں مرد ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوا کیونکہ میرے کچھ دوست اکثر ان کے نام خوشبو سے بھرے ہوئے خط لکھتے تھے۔ اگر آپ کے ذہن میں شک ہے کہ انہیں محبت بھرے خط لکھنے والوں میں شاید میں خود بھی شامل تھا تو یہ آپ کے شکی مزاج اور معاملہ فہم ہونے کی دلیل ہے۔ میرے دوستوں کے اس دکھ میں کئی اور لوگ بھی شامل ہیں کیونکہ روحی کنجاہی' ناہید شاہد اور زیبا ناروی کے لئے کئی رشتے آئے تھے' روحی کے لئے جس نے ''پرپوز'' کیا تھا وہ لڑکا دبئی میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح زیبا ناروی کی وجہ سے تو گوجرانوالہ میں زبردست ہنگامہ ہو گیا اور بپھرے ہوئے مجمع کو کنٹرول کرنے کے لئے باقاعدہ پولیس بلانا پڑی۔ ہوا یوں کہ شہر میں مشاعرے کے بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے جن میں دیگر شعراء کے علاوہ زیبا ناروی کا نام خاصے جلی حروف میں لکھا گیا تھا' مشاعرہ ایک بند گلی میں تھا اور شعراء کو ایک مکان کی بیٹھک میں بٹھایا گیا تھا۔ جب کسی شاعر کے نام کا اعلان ہوتا تو وہ بیٹھک کی چلمن اٹھا کر تنگ گلی میں دھرے مائیک پر آتا اور اپنا کلام سناتا۔ گوجرانوالہ کے باذوق پہلوانوں نے جب پوسٹرز میں ایک خاتون کا نام دیکھا تو منہ کا مزا بدلنے کے لئے خاتون کو دیکھنے جوق در جوق مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ مشاعرہ شروع ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ پہلوانوں نے شور مچا دیا ''زیبا کو بلائیں' زیبا کو بلائیں'' بالآخر مجمع کے اصرار پر زیبا صاحب کے مرتبے اور مقام کو نظر انداز کرتے ہوئے سٹیج سیکرٹری کو انہیں شروع ہی میں بلانا پڑ گیا۔ جب زیبا صاحب چلمن اٹھا کر سفید لمبی داڑھی' سیاہ رنگت اور پان سے سرخ زبان ہلاتے ہوئے گلی میں قدم رنجہ ہوئے تو اپنی اس زیبا کو دیکھ کر مجمع پہلے سکتے میں اور پھر غصے میں آ گیا' جذبات کی اس درجہ بے قدری اور دل والوں کی اس درجہ دل شکنی پر پہلوانوں نے کرسیاں اٹھا اٹھا کر منتظمین کو مارنا شروع کر دیں۔ بعض ایک نے تو ایک دوسرے کو بھی مار دیں اور یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ تمہی کو عورت دیکھنے کا بڑا شوق تھا ورنہ بسر اوقات تو ہو ہی رہی تھی!

بات قدرے لمبی ہو گئی' میں بتانا دراصل یہ چاہتا تھا کہ میں نے شروع شروع میں خواتین کا ادب بہت پڑھا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ خواتین کے ادب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان کا لکھا ہوا ادب نہ پڑھا جائے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے قرۃ العین حیدر' بانو قدسیہ

پروین شاکر' ادا جعفری' شبنم شکیل' نیلوفر اقبال' عطیہ سید' ہاجرہ مسرور' ناہید قاسمی' خدیجہ مستور' منصورہ احمد اور دیگر لکھاری خواتین کا کہ جن کی تحریروں نے مجھے خواتین کے ادب پر مزید مجبور کیا ورنہ مجھ وزیر آبادی کا معاملہ بھی گوجرانوالہ کے پہلوانوں کے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

دوسال پیشتر مجھے شہابہ گیلانی کا ایک افسانہ ''معاصر'' میں اشاعت کے لئے موصول ہوا تو میرے لئے یہ ایک نیا نام تھا' میں یہ افسانہ پڑھتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں پھر وہی ادب پڑھنے کو نہ مل جائے جس کے خوف سے میں ایک عرصے تک خواتین کے ادب سے محروم رہا لیکن جب میں نے ہمت کر کے یہ افسانہ پڑھا تو مجھ پر کھلا کہ یہ لڑکی تو ادب میں کچھ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں نے یہ افسانہ پڑھ کر اسے افسانہ نگار تو مان لیا لیکن پھر ایک اور خوف دل میں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا ان دنوں ''آزادی نسواں'' کی تحریک زوروں پر ہے اور اس کی کچھ علمبردار خواتین عورتوں کے حقوق کی بات کم کرتی ہیں اور مردوں پر تبرا زیادہ بھیجتی ہیں' مجھے تو لگتا کہ یہ جو اخباروں میں تبدیلی جنس کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ شعلہ امرتسری آپریشن کرا کے شہلا ناز بن گئے تو یہ شاید اسی خوف کا نتیجہ ہیں کہ اگر یہ خواتین اپنے مشن میں کامیاب ہو گئیں تو نئی صدی اور نئے ہزارے میں عورتوں والے سارے اچھے برے کام بادل نخواستہ ہی سہی' لیکن مردوں کو انجام دینا پڑیں گے لہٰذا دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ اس سلسلے کے سارے فوائد ''پہلے آؤ' پہلے پاؤ'' کی بنیاد پر ابھی سے حاصل کر لئے جائیں!

مگر سچ پوچھیں تو شہابہ گیلانی کا افسانوی مجموعہ ''آدھا سچ'' پڑھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ یہ اچھی خاصی پڑھی لکھی ماڈرن لڑکی ہے مگر اس کے کسی بھی افسانے میں مردوں سے نفرت کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ اس کے تقریباً سارے مردانہ کردار معصوم معصوم سے لگتے ہیں' مردوں کے ساتھ اس درجے ہمدردانہ رویہ تو خود کبھی کسی مرد افسانہ نگار نے اختیار نہیں کیا۔ میرے اس بیان کی بہترین مثال شہابہ کا افسانہ ''آدھا سچ'' ہے جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے' اس افسانے کے کردار جنہیں اس نے فرنچ اسکالر اور کاؤ بوائے وغیرہ کے نام دیئے ہیں۔ اگر کسی غصیلی افسانہ نگار خاتون کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ اپنے افسانے میں ان کی تکا بوٹی کر دیتی لیکن شہابہ نے ان کرداروں کو جس زاویئے سے دیکھا ہے اور جس تخلیقی انداز میں کہانی کا تانا بانا بنا ہے' یہ اسے ایک منفرد افسانہ نگار قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح ''شاباش'' کا یعقوب' ''ایک کہانی بڑی پرانی'' کا رفیق بولتے لمحے کا احسان اور نینا کا بھائی' ''اب مصنف میں ہوں'' ''گمنام لفافہ کا ہیرو'' ''محبت والی کھڑکی'' کا شوکت اور اس طرح دوسری کہانیوں کے کردار محبت اور انسانیت کی زبان بولتے نظر آتے ہیں' بلکہ شہابہ کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے ایک اور بات کا احساس ہوا اور وہ یہ کہ اس پوری کتاب میں صرف مرد نہیں' کسی

عورت کا کردار بھی منفی نہیں' شہابہ انسانوں کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے اور اگر یہ خودستائی نہ ہوتی تو میں کہتا کہ یہ اس کے اندر کی خوبصورتی ہے جو ہر انسان میں خوبصورتی تلاش کر لیتی ہے' یہ خودستائی والی بات میں نے اس لئے کہ کہی کہ میرے تمام ٹی وی ڈراموں اور سفرناموں میں بھی کوئی منفی کردار موجود نہیں جو خواتین وحضرات بھونڈے طریقے سے اپنی تعریف کرتے ہیں' انہیں اپنی تعریف کا اصل طریقہ میرے ان جملوں سے سیکھنا چاہیے کہ اپنے باطن کو خوبصورت قرار دینے کے لئے اگر کسی دوسرے کی تعریف بھی کرنا پڑے تو دل پہ پتھر رکھ کر دینا چاہیے۔ دراصل نفرتوں کے موجودہ دور میں ہمیں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے جو ہمیں انسانوں سے محبت کرنا سکھائے۔ شہابہ نے یہ کام زبردست تخلیقی انداز میں کیا ہے اور اس کا یہ تخلیقی کارنامہ قابل مبارکباد ہے۔ حالاں کہ ان دنوں تخلیقی کام صرف آبادی میں اضافے ہی کو سمجھا جاتا ہے۔

◆◆◆

نئی قیادت!

پاکستان کے خواجہ سراؤں کے لئے میرے پاس ایک خوشخبری ہے اور وہ یہ کہ بھارت میں دو خواجہ سرا کملا اور مینا میئر منتخب ہو گئے ہیں اور یوں دیکھا جائے تو اب پاکستانی خواجہ سراؤں کے لئے امید کی کرن پیدا ہوئی ہے' بس شرط یہ ہے کہ وہ خود کو مردوں یا عورتوں سے کم تر سمجھنا چھوڑ دیں اور اللہ کا نام لے کر موجودہ حکومت کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں شرکت کا نہ صرف ارادہ کریں بلکہ ابھی سے تیاری شروع کر دیں!

میرے نزدیک خواجہ سراؤں میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں' جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا' ان میں خرابی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان کی وفاداریاں کچھ مشکوک قسم کی ہیں' ان میں ''کومٹ منٹ'' کی کمی ہے' یعنی نہ وہ عورت ہیں نہ مرد' انسان کو کسی ایک طرف ہونا چاہیے مگر یہ دونوں طرف ہیں' ان کا معاملہ

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

والا ہے' بس میں مردوں والے حصے میں رش ہو تو یہ عورت بن کر عورتوں والے حصے میں جا بیٹھتے ہیں اور اگر عورتوں والے پورشن میں سیٹ نہ ملے تو مردوں میں جا گھستے ہیں' انہیں صرف سیٹ سے غرض ہوتی ہے اس کے لئے انہیں جو بھی لیبل لگانا پڑے' بڑی خوشی سے خود پر لگا لیتے ہیں!

اس ایک کمزوری سے قطع نظر خواجہ سراؤں میں کافی خوبیاں پائی جاتی ہیں' مثلاً صلح جو ہوتے ہیں' ان کے غصے کا اظہار ان کی دو ہتھیلیوں سے ہوتا' کسی جھگڑے کی صورت میں اپنی ہتھیلی پر ہتھیلی مار کر صرف بددعائیں دیتے ہیں اور بددعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ دعائیں یا بددعائیں جو اثر کرتی ہیں وہ دو طرح کی ہوتی ہیں' ایک مردانہ اور دوسری خواجہ سرایانہ' جس دعا یا بددعا میں مردانگی ہو یعنی عمل کی جھلک بھی پائی جائے' وہ قبول ہوتی ہے' اور وہ جس دعا یا بددعا سے ہیجڑہ پن ٹپکتا ہو' اس کا قبول ہونا مشکوک ہے' البتہ سننے والے اس سے محظوظ ضرور ہوتے ہیں' ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف 1977ء میں اپوزیشن جماعتوں نے الیکشن میں دھاندلی کے خلاف تحریک چلائی تو آخری دنوں میں' جب تحریک کی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی' خواجہ سرا بھی اس میں شامل ہو گئے' چنانچہ حیدر آباد کے خواجہ سراؤں نے ایک جلوس نکالا' یہ جلوس نگینہ نامی خواجہ سرا کی قیادت میں ہیرو آباد سے روانہ ہوا اور روپ محل مارکیٹ اور تلک چاڑی کا چکر لگاتا ہوا

عامل کالونی پر ختم ہوا خواجہ سرا اس احتجاجی جلوس کے دوران ڈھولک پر یہ گیت گا رہے تھے!

ایوب آیا..... میں نہ بولی

یحییٰ آیا..... میں نہ بولی

بھٹو آیا..... میں نہ بولی

چلاؤ گولی..... چلاؤ گولی

عجیب بات ہے یہ خواجہ سرا ہمیشہ جمہوری حکومت میں بولتے ہیں' فوجی حکومت میں خاموش ہو جاتے ہیں' بہر حال لوگ اس احتجاجی جلوس سے بہت محظوظ ہوئے اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت قائم ہوگئی اور پھر گیارہ سال تک کوئی ہیجڑہ نہیں بولا' وجہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ صلح جو قسم کے لوگ ہیں فوجی حکومت کے دوران لڑائی جھگڑوں سے دور ہی رہتے ہیں!

خواجہ سرا ملکی معیشت میں بھی بہت اہم کردار کرتے ہیں' اس وقت ہماری معیشت کو سب سے بڑا چیلنج آبادی میں خوفناک حد تک اضافہ ہے اور محکمہ بہبود آبادی کے کتابچوں اور نصیحتوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ یہ اتنے ''اشتعال انگیز'' ہوتے ہیں کہ آبادی میں مزید اضافے کا سبب بن رہے ہیں' جب کہ محکمہ بہبود آبادی یا خاندانی منصوبہ بندی والوں سے اگر کوئی طبقہ تعاون کرتا ہے تو ان خواجہ سراؤں ہی کا ہے۔

خواجہ سراؤں کا عمومی پیشہ اگرچہ گانا بجانا ہے لیکن ان میں بہت نیک لوگ بھی ہوتے ہیں' ماڈل ٹاؤن میں ایک ادھیڑ عمر خواجہ سرا میرے ایک دوست کی کوٹھی کے کوارٹر میں رہتا تھا' اس کا نام پھوپھی خدا بخش تھا' یہ گانے بجانے کی بجائے محنت مزدوری کرتا تھا' اس نے دو حج بھی کئے تھے اور چہرے پر شرعی داڑھی اور ماتھے پر بہت نمایاں محراب تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک مقامی سوسائٹی کے انتخابات میں حصہ لیا تھا اور اپنی قد آدم تصویر پر مشتمل ایک ہولڈر ایک چوک میں لگایا جس میں محراب کا نشان کچھ زیادہ نمایاں نہ تھا چنانچہ پینٹر کو بلا کر اس نے محراب کو کچھ اتنا زیادہ نمایاں کروا دیا کہ ووٹروں نے اس حرکت کو اس کی ریاکاری سمجھا اور یہ بیچارہ الیکشن ہار گیا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ معاملہ ریاکاری کا نہیں' اپنے ہیجڑے پن کے خلاف تعصب کی عوامی فضا کم کرنا مقصود تھا۔

بہر حال بھارت میں دو خواجہ سراؤں کا میئر منتخب ہو جانا' ہمارے ہاں کے خواجہ سراؤں کے لئے نہ صرف یہ کہ خوشخبری ہے بلکہ ان کے لئے یہ امر چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے' ہمارے ہاں ''خواجہ'' تو سیاست میں موجود ہیں' خود کو خواجہ سرا کہلانے والا ابھی تک کوئی میدان میں نہیں آیا چنانچہ میری خواہش ہے کہ چند ماہ میں منعقد ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں خواجہ سرا بھرپور حصہ لیں اور موجودہ

حکومت چاہتی ہے کہ ان انتخابات میں کرپٹ لوگ سامنے نہ آئیں اور آج تک جتنی بھی کرپشن ہوئی ہے وہ مردوں کی ہے اور یا پھر عورتوں کی، خواجہ سراؤں کا دامن اس قسم کی کرپشن سے بالکل پاک ہے، دوسروں کو ہم آزما چکے ہیں، انہیں بھی آزمانے میں کیا حرج ہے لیکن جن کا پیشہ گانا بجانا ہے، انہیں الیکشن لڑنے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے بلکہ صرف خواجہ سراؤں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے جو آئین کی دفعہ 62 کے تقاضے پورے کرتے ہوں بصورت دیگر عوام پھر گنہگار قسم کے لوگوں کو ووٹ دیں گے اور یوں نئی قیادت کا خواب ایک دفعہ پر تشنہ تعبیر رہ جائے گا!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور (1)

غالباً 74ء میں' میں اپنے نوائے وقت کے ''روزن دیوار سے'' کالم میں موضوعات میں تنوع کی غرض سے ''ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' شروع کیا تھا جو سفرناموں کی پیروڈی تھی۔ اس کی تھیم یہ تھی کہ اگر کوئی گورا چند روز کے لئے لاہور آئے اور واپسی پر سفر نامہ لکھے تو اس کا چیزوں کو دیکھنے کا انداز کیا ہوگا؟ ہفتے میں ایک آدھ کالم اس حوالے سے ہوتا تھا۔ قارئین کی فرمائش پر میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر رہا ہوں' آج کی پہلی قسط فرمائیں (قاسمی)

عبادت گزار پاکستانی

میں نے لاہور میں دیکھا کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی تھیں' میں اپنے شوق تجسس کے لئے مسلمانوں کو نماز پڑھتے خود دیکھنا چاہتا تھا تا کہ مجھے پتہ چلے کہ ان کی عبادت کا طریقہ کیا ہے' چنانچہ ایک مقامی دوست مجھے ایک مسجد میں لے گیا' یہاں لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے' پھر یہ گھٹنوں کے بل جھک جاتے تھے' دوست نے بتایا کہ اسے رکوع کہتے ہیں اور پھر وہ اپنا ماتھا زمین پر لگاتے تھے' اسے سجدہ کہا جاتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ پاکستانی مسلمان مسجدوں کے علاوہ بھی' جب اور جہاں ملے' عبادت کرتے ہیں' حتیٰ کہ ویگنوں میں سفر کے دوران بھی یہ رکوع کی حالت میں ہوتے ہیں' میں نے دفتروں میں بھی دیکھا کہ کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی اپنے چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو اپنے دفتر میں بلائے تو یہ وہاں بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ کئی لوگ تو اتنے عبادت گزار ہیں کہ وہ حاکم وقت کے دبدبے کی پرواہ کئے بغیر اس کی موجودگی میں سجدہ میں گر جاتے ہیں..... بڑی بات ہے!

مارشل ریس

میرا مقامی دوست جب مجھے لاہور کی مسجدیں دکھانے کے لئے لے گیا تو میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ ہر مسجد کے چاروں طرف مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔ میں پاکستانی مسلمانوں کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا کہ وہ اتنے شدید پہرے کی پرواہ کئے بغیر مسجد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور اپنے خدا کی عبادت کرتے تھے تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ مسلمانوں کے

ملک میں عبادت پر پابندی کیوں ہے؟ میرے دوست نے میری یہ غلط فہمی دور کی' اس نے مجھے بتایا کہ عبادت پر کوئی پابندی نہیں' دراصل ہم مسلمان مارشل ریس ہیں چنانچہ ہم میں سے بیشتر لوگ ہر وقت مسلح رہتے ہیں' اس سے نہ صرف یہ کہ میری غلط فہمی دور ہو گئی بلکہ مارشل ریس کے حوالے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ پاکستان بار بار مارشل لاء کیوں لگاتا ہے؟

مجبوری

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مسلمان علماء حجروں میں رہتے ہیں' روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور دین کی خدمت کرتے ہیں' مگر میں نے یہاں علماء کو شاندار کوٹھیوں میں رہتے اور پجیرو اور لینڈ کروزرز میں مسلح محافظوں کے غول کے ساتھ سفر کرتے دیکھا تو حیران ہوا۔ مگر میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ علماء آج بھی حجروں میں رہتے ہیں اور روکھی سوکھی کھا کر دین کی خدمت کرتے ہیں' تم نے جن لوگوں کو شاندار زندگی گزارتے دیکھا' وہ بھی علماء ہی ہیں لیکن ان کا تعلق منبر و محراب سے نہیں' سیاسی جماعتوں سے ہے۔ سیاست میں دنیاداروں کا مقابلہ دنیاداری ہی سے کرنا ان علماء کی مجبوری ہے' ورنہ انہیں یہ کروفر خود بھی پسند نہیں ہے۔

جدید ایجادات

میں اپنے اس دوست کے جواب سے کچھ مطمئن نہیں ہوا مگر میں نے بحث نہیں کی' البتہ پوچھا کہ یہ لوگ اپنے ساتھ گن مین کیوں لئے پھرتے ہیں کیونکہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ تمہارے تین خلفاء ایک ایک کر کے شہید ہو گئے مگر انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے کوئی پہرے دار مقرر نہیں کیا؟ دوست نے جواب دیا کہ اس زمانے میں گن ایجاد نہیں ہوئی تھی چنانچہ گن مین کا بھی کوئی تصور نہیں تھا اور اسلام جدید ایجادات سے استفادہ سے منع نہیں کرتا..... یقیناً اس کی وجہ کوئی اور ہو گی جو میرا دوست مجھ سے چھپانا چاہتا تھا!

انشاءاللہ

میں نے پاکستان میں قیام کے دوران پاکستانیوں کو تین چار لفظ بہت زیادہ استعمال کرتے دیکھا۔ یہ الفاظ انشاءاللہ' ماشاءاللہ اور الحمدللہ وغیرہ تھے..... اور یہ لفظ عجیب عجیب جگہ استعمال ہوتے تھے' مثلاً الحمدللہ بچہ اسکول سے بخیریت واپس آ گیا ہے' جو دوا بازار سے خریدی تھی' ماشاءاللہ' وہ تو اصلی نکلی' انشاءاللہ کل میں آپ کی طرف آؤں گا..... میں نے ایک دوست سے انشاءاللہ کا مطلب پوچھا' اس نے بتایا کہ اس کا مطلب ''اگر اللہ نے چاہا'' ہے' تب مجھے پتہ چلا کہ جب بھی کوئی پاکستانی دوست انشاءاللہ کہہ کر مجھ سے

کوئی وعدہ کرتا تھا' وہ پورا کیوں نہیں ہوتا تھا' یقیناً اللہ نے نہیں چاہا ہوگا۔

سوونیئر

پاکستان میں مجھے گداگر بہت زیادہ نظر آئے یہ بات مجھے ان کے موجد بیک ہوم میں میرے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے دوستوں نے بھی بتائی تھی چنانچہ میں پاکستان میں جہاں جاتا تھا' وہاں گداگر کا ہجوم ہو جاتا تھا' مگر میرے پاکستانی دوست نے مجھے اس ضمن میں کوئی اور ہی بات بتائی اس کا کہنا تھا کہ یہ گداگر نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف ملکوں کے سکے جمع کرنے کے شوقین لوگ ہیں جنہیں یہ بطور سوونیئر اپنے پاس رکھتے ہیں چونکہ تم غیر ملکی ہو اس لئے یہ تمہارے گرد جمع ہو جاتے ہیں.... میں سمجھا شاید دوست ٹھیک کہتا ہے!

گداگر؟

ایک دن میں نے آزمانے کے لئے اپنے گرد جمع مختلف ملکوں کے سکے اکٹھے کرنے کے شوقین لوگوں میں ایک ایک پاکستانی روپیہ تقسیم کیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے جیسے پندرہ بیس مزید لوگوں کو لے کر آ گئے جنہوں نے مجھ پر دھاوا بول دیا' میرا دوست وہاں سے کار بھگا کر لے گیا۔ وہ کچھ شرمندہ سا لگتا تھا مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ جن لوگوں میں' میں نے پیسے تقسیم کئے وہ گداگر تھے' اس نے اس کی ایک عجیب و غریب توجیہہ پیش کی' جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ یہ اچھے خاصے بینک بیلنس والے لوگ ہیں' انہوں نے محض آزمانے کے لئے فقیروں کا روپ دھارا ہوا ہے' اس نے اس حوالے سے مجھے ایک شعر سنایا اور اس کا ترجمہ بھی کر کے دیا' میری ڈائری میں وہ شعر لکھا ہوا ہے' وہ شعر کچھ یوں تھا

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

میں اپنے دوست کی وضاحت سے قطعاً مطمئن نہیں ہوا بلکہ مجھے یقین ہو گیا کہ جس شاعر کا یہ شعر ہے' وہ خود بھی کوئی گداگر ہے!

ایک معصوم بچہ

لاہور میں ایک دو رویہ سڑک ہے جس کے دونوں طرف باغات ہیں اور درمیان میں نہر بہتی ہے' یہ دنیا کی خوبصورت ترین سڑکوں میں سے ایک ہے' ایک روز میں کار پر جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ سڑک کے عین درمیان میں ایک معصوم سا بچہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے' اس کے قریب ایک تھرماس ٹوٹی پڑی ہے جس میں سے آئس کریم (جسے مقامی لوگ قلفی کہتے ہیں) بہہ کر سڑک پر پھیل گئی

ہے۔ مجھے اس معصوم بچے نے زاروقطار روتے ہوئے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسے ٹکر مار چلا گیا' یہ تھرماس اور آئس کریم ایک کمپنی کی ہے اور اجرت پر ان کے لئے کام کرتا ہے' اب اسے تھرماس اور آئس کریم کی قیمت اپنے مالک کو دینا پڑے گی۔ مجھے اس بچے پر بہت ترس آیا' میں نے اسے پیار کیا اور جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیئے اگلے روز میں پھر اسی سڑک سے گذرا تو وہی بچہ سڑک کے درمیان میں بیٹھا ہوا اسی طرح زاروقطار رو رہا تھا اور اس کی ٹوٹی ہوئی تھرماس اور آئس کریم سڑک پر بکھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر کار روکی مگر وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ اٹھا۔ میں کئی دن تک اس بچے اور اس کے ورثا کو تلاش کرتا رہا مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی..... میں اس بچے کو ہالی ووڈ کی فلموں میں کام دلانا چاہتا تھا!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (2)

رانا صاحب

لاہور کے لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں' انہیں جب کھانے پینے سے فراغت ملتی ہے تو پھر کھانے پینے لگتے ہیں' لاہور کے ایک نواحی شہر گوجرانولہ کے لوگ لاہوریوں سے بھی آگے ہیں' یہ کھانا تب چھوڑتے ہیں' جب تھک جاتے ہیں۔ اس شہر کے چڑے بہت مشہور ہیں۔ دور دراز کے شہروں کے لوگ حکیموں کے مشورے پر یہ چڑے کھانے کے لئے گوجرانولہ کا رخ کرتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے جو چڑے کھانے میں مشغول تھا اور جس کی اپنی جسامت چڑے سے زیادہ نہ تھی' پوچھا کہ اتنے چھوٹے سے پرندے میں آخر کھانے والی چیز کون سی ہوتی ہے؟ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا ''چڑے کی ران'' اس شخص کے مقابل میں بیٹھا ہوا دوست اسے بار بار ''رانا صاحب'' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا' شاید اس نام کا تعلق چڑے کی ران سے ہو!

نیچرل کھانے

لاہور میں جو علاقہ کھانے پینے کے لئے مشہور ہے' اس کا نام لکشمی چوک ہے یہاں کھانے پینے کی جو اشیاء تیار ہوتی ہیں' اس میں مصالحوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ڈالا جاتا ہے جس سے ان کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دکان دار تیار شدہ کھانے بڑے بڑے دیگچوں میں عین سڑک کے کنارے پر واقع دکان کے تھڑے پر سجا دیتا ہے اور ان کے ڈھکنے اتار کر پرے رکھ دیتا ہے' چنانچہ ڈیزل موبل آئل' ہوا میں اڑتے ہوئے گوبر کے اجزاء' مٹی اور دھواں وغیرہ اس خوراک میں' شامل ہو جاتے ہیں جس کا کوئی اضافی معاوضہ گاہک سے وصول نہیں کیا جاتا اور یوں اور کھانا مفت میں مزیدار ہو جاتا ہے۔ یہ بات میرے دوست نے میرے اس سوال کے جواب میں بتائی تھی کہ لوگ یہ کھانے کس طرح کھاتے ہیں جن میں اتنے سارے گند کی ملاوٹ ہو۔ دوست کی دلیل یہی تھی کہ گھر میں پکے ہوئے کھانوں کی نسبت ان کھانوں کے زیادہ لذیذ ہونے کی وجہ ہی یہی ہے کہ گھر کے کھانوں میں قدرتی اجزاء شامل نہیں ہوتے' دوسرے اس سے معدے کا دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے ..... میں نے دوست سے پوچھا' تمہیں کس قسم کے کھانے پسند ہیں۔ اس نے کہا'' مجھے وہ تمام کھانے پسند ہیں جنہیں وہی لوگ مضر صحت کھانے کہتے ہیں' میں انہیں نیچرل کھانے کہتا

ہوں کیوں کہ ان میں نیچر کے اجزاء شامل ہوتے ہیں!''

اصلی وجہ؟

جب میں پاکستان آیا مسلمانوں کا ایک تہوار جسے وہ عید کہتے ہیں' قریب تھا' اس دن مسلمان بکرے کی قربانی دیتے ہیں' قربانی کے بعد کئی لوگ کھال بیچ دیتے ہیں اور گوشت فریزر میں ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ میں اپنے دوست کے ساتھ بکرا خریدنے گیا' میرے دوست نے ایک مریل دنبے پر ہاتھ رکھا اور مالک سے پوچھا ''یہ سچ مچ دنبہ ہے یا اسے مار مار کر دنبہ بنایا ہے؟'' جس پر ارد گرد کھڑے لوگ ہنس پڑے مگر مجھے ان کے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ میرے دوست نے اس جملے کے مختلف ترجمے کئے بالآخر کہنے لگا اس کا ترجمہ ممکن نہیں..... یقیناً یہ کوئی مقامی محاورہ ہوگا' جس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا!

عید کی نماز

میرا یہ دوست مجھے عید کی نماز پڑھنے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا مجھے نماز پڑھنا نہیں آتی' اس نے کہا کوئی بات نہیں' عید کی نماز کسی کو بھی پڑھنی نہیں آتی..... عجیب بات ہے حالانکہ یہ لوگ سال میں دو دفعہ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔

بولنے والا بکرا

میں نے ایک بکرا دیکھا جس نے گوٹا کناری کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا' گلے میں زیور تھے' پاؤں میں پازیبیں تھیں اور اس کے پیٹ پر مہندی سے کچھ لکھا ہوا تھا' دوست نے بتایا یہ ''عید مبارک'' لکھا ہوا ہے اور اسے داتا صاحب سلام کے لئے لے جا رہے ہیں' داتا صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ وہ بہت بڑے سینٹ ہیں۔ میں نے دوست سے پوچھا کہ یہ بولنے والا بکرا ہے؟ دوست اس پر ہنس پڑا اور کہا ''سارے بکرے بولتے ہیں' قصائی کو دیکھ کر چلاتے بھی ہیں'' دوست غالباً میری بات نہیں سمجھا تھا یا کوئی بات چھپانا چاہتا تھا کیونکہ میرا اصل سوال یہ تھا کہ اگر یہ سلام کرنے جا رہا ہے تو کیا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہے گا یا محض اشارے سے سلام کرے گا ..... میرے خیال میں دونوں صورتیں ممکن ہیں کیونکہ مشرق اپنی روحانیت کے لئے مشہور ہے۔

پیش گوئی

میرا دوست مجھے ایک دن اپنے ساتھ داتا دربار لے گیا' وہاں ایک ملنگ نے جس نے ہاتھ میں کڑے گلے میں مالائیں اور سبز کپڑے پہنے ہوئے تھے' مجھے دیکھتے ہی پہلے ایک نعرہ لگایا اور پھر کچھ کہا۔ میرے دوست نے بتایا کہ اس نے تمہارے بارے میں

پیش گوئی کی ہے کہ کل تمہیں خوشی ملے گی..... اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے روز ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''میرا نام خوشی محمد ہے'' مشرق واقعی مشرق ہے' ہم مغرب کو لوگ اس کی پراسراریت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے!

ترکی..... میرا دوسرا عشق!

پاکستان کے بعد ترکی دوسرا عشق ہے۔ پاکستان ترکی کے بارے میں جو خبریں شائع ہوتی ہیں' وہ مغربی میڈیا سے مستعار لی گئی ہوتی ہیں' اور یہ سب خبریں اور فیچر پاکستانی عوام بلکہ عالم اسلام کو یہ تاثر دیتے ہیں یہ ایک سیکولر نہیں بلکہ بے دین ملک ہے' ترک عوام پوری طرح مغرب زدہ ہیں اور یہ ملک عالم اسلام سے پوری طرح کٹا ہوا ہے!

میں تین دفعہ ترکی گیا ہوں' ایک دفعہ 69ء کے اوائل میں امریکہ جاتے ہوئے' دوسری دفعہ 1970ء کے آخر میں امریکہ سے واپسی پر اور تیسری دفعہ انقرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طرف سے پروفیسر انوار احمد کی دعوت پر 1986 میں لیکچر دینے کی غرض سے! اور میری خواہش خوبصورت لوگوں کے اس خوبصورت ملک میں جو پاکستانیوں سے دلی محبت کرتے ہیں' بار بار جانے کی ہے۔ میرا ہر دفعہ تاثر یہ تھا کہ ترکی بے دین نہیں' ایک سیکولر ملک ہے' اور یہ سیکولرازم' رواداری اور دوسرے عقائد اور نظریات کے حامل لوگوں کو برداشت کرنے کا دوسرا نام جس کی سخت ضرورت اس وقت پاکستان کو بھی ہے!

جہاں تک ترک عوام کی اسلام سے محبت کا تعلق ہے' شاید وہ اس معاملے میں ہم پاکستانیوں سے بھی زیادہ گرم جوش ہیں۔ اس کا ایک ثبوت حج کے موقع پر بھی ملتا ہے' ترکوں کے گروپ جس والہانہ پن سے طواف اور دیگر مذہبی رسومات گرم جوشی و منظم طریقے سے ادا کرتے ہیں' اس کی نظیر دوسرے مسلمان ممالک کے حجاج میں نہیں ملتی۔

مسجد نبوی کی تعمیر و تشکیل میں ترکوں نے اپنے دور میں جس عشق کا مظاہرہ کیا ہے' وہ بھی تاریخ کا ایک حصہ ہے!

ترکی کے بڑے شہروں اور وہاں بھی مخصوص علاقوں میں عورتیں اور مرد مغربی لباس میں اور مغربی طرز زندگی اپنائے نظر آتے ہیں' وہاں بار بھی نظر آتے ہیں' وہاں لڑکے لڑکیاں رقص بھی کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود انہیں مسلمان کہلانے پر کوئی شرمندگی نہیں' لیکن شہروں میں مین روڈ سے ذرا ہٹیں تو آپ کو بالکل مختلف منظر نظر آئے گا اور اگر آپ ان بڑے شہروں سے باہر نکلیں تو آپ کو وہی روایتی ترک نظر آئیں گے جو کمال اتاترک کی جدیدیت کے اثرات سے آزاد نظر آتے ہیں۔ جن شہروں میں مغربیت کا غلبہ نظر آتا ہے' وہاں بھی مسجدیں نمازیوں سے لبالب بھری ہوتی ہیں' یونیورسٹی کے آزاد منش طلبہ و طالبات ماہ رمضان میں روزے سے نظر آتے ہیں مگر اپنے روزہ دار ہونے کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا' روزہ کھلتا ہے تو یہ اپنی جیب یا پرس میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز نکالتے ہیں اور

خاموشی سے روزہ افطار کر کے اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہو جاتے ہیں!

جہاں تک ترک حکومت کا تعلق ہے' اس کے بارے میں بھی ہمارے ہاں مغربی پریس کی معرفت غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترک حکومت فوج کے پریشر کے تحت احیائے اسلام کی تحریکوں کو دبانے کی کوشش کرتی ہے مگر ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کمال اتاترک کی آمد سے پہلے ترکی میں مذہبی فضا تنگ دلی اور تنگ نظری کے اس نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور مذہبی قوتیں اتنی ہی متشدد اور عسکریت کی طرف مائل ہو چکی تھیں جتنی ان دنوں پاکستان میں ہیں' کمال اتاترک اس صورتحال کے رد عمل میں توازن اور اعتدال سے محروم ہو گئے اور وہ دوسری انتہا پر چلے گئے مگر اب صورت حال پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بنکاک میں ترکی کے سفیر ڈپلومیٹک حلقوں میں میرے دوستوں میں سے تھے' انہوں نے حکومت ترکی کی طرف سے شائع کی ہوئی قرآنی خطاطی کی ایک انتہائی خوبصورت اور نہایت قیمتی کتاب مجھے تحفے میں پیش کی' جس سے یہ پراپیگنڈہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ ترک قیادت اسلام بیزار قیادت ہے۔ اسی طرح استنبول کے میوزیم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تبرکات بہت محبت اور عقیدت سے سرکاری سطح پر محفوظ کئے گئے ہیں اور جس کمرے میں یہ تبرکات رکھے گئے ہیں' وہاں ایک چھوٹا سا کیبن ہے جہاں ایک قاری ہر وقت خوبصورت لحن میں تلاوت میں مشغول رہتا ہے!

اسی طرح تمام تاریخی مساجد اور قونیہ میں مولانا روم کے مزار کی دیکھ بھال سرکاری سطح پر ہوتی ہے۔ مجھے مولانا روم کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ گائیڈ خاتون نے اپنے سر کو ایک کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا اور مرد اور خواتین زائرین وہاں تلاوت اور دعا میں مشغول تھے اور مزار سے باہر نکلتے ہوئے الٹے قدموں سے چلتے نظر آتے تھے!

جہاں تک موجودہ دور میں بھی خواتین پر اسکارف پر پابندی کا تعلق ہے' اس کے خلاف ترک عوام میں بہت اضطراب پایا جاتا ہے' انقرہ میں مقیم میرے عزیز دوست اور نامور محقق اور ادیب اے بی اشرف نے مجھے بتایا کہ یہ پابندی صرف سرکاری دفاتر میں ہے' اس کی تصدیق دوسرے شہروں کے علاوہ قونیہ میں بھی ہوئی جہاں سکول سے چھٹی کے وقت طالبات کے غول کے غول سکارف میں نظر آئے! مغرب ہمیں اپنے سب سے مخلص اور سب سے پیارے دوست ترکی سے دور کرنا چاہتا ہے چنانچہ اس کا میڈیا اس ضمن میں مبالغہ آمیز تصویر پورے عالم اسلام کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کا مقصد محض تفرقہ پیدا کرنا ہے!

آخر میں ایک دلچسپ واقعہ! میں انقرہ سے استنبول جا رہا تھا جب جہاز مسجدوں کے شہر استنبول میں داخل ہوا' تو مجھے اس شہر کے بلند و بالا میناروں سے اذان کی آواز سنائی دی لیکن میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا اور اذان اپنی پوری

ترتیب کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ جب اذان ختم ہوئی تو میں نے حیرت دور کرنے کے لئے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ترک مسافر سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ تھا' اول تو جہاز میں اذان کی آواز کیسے سنائی دی اور دوسرے یہ پورے تواتر کے ساتھ کیسے سنائی دی؟ یہ سن کر ترک مسافر مسکرایا اور اپنا بازو میری طرف پھیلاتے ہوئے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اذان اس گھڑی سے سنائی دے رہی تھی۔ یہ میں نے ریکارڈ کی ہوئی ہے تاکہ نماز میں تاخیر نہ ہو۔"

◆◆◆

ایوارڈ یافتہ لٹیرا!

اس دفعہ لاہوریوں نے جس طرح بسنت منائی ہے' اس سے ان کے اپنے اگلے پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بسنت نائٹ کو لاہور کی شاید ہی کوئی چھت ہو جہاں ایک ہنگامہ بپا نہ ہو' ہوٹلوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی' شاہراہ قائداعظم کے دو ہوٹلوں کی پارکنگ کا دائرہ باہر سڑک تک پھیل گیا تھا اور گورنر ہاؤس تک کاریں ہی کاریں نظر آتی تھیں' بڑے گھروں اور ہوٹلوں کی چھتوں پر سرچ لائٹیں اور فل والیم کے ساتھ ڈیک آن تھے' گھروں میں مہمانوں کے لئے پکوان تیار ہو رہے تھے' چھتوں پر باربی کیو کا انتظام تھا چنانچہ گرم گرم کباب اور تکے پلیٹوں میں اتر رہے تھے' اس دن موٹروے کی بھی سنی گئی' چنانچہ اتنی کمائی شائد پورے سال میں نہ ہوئی ہو جتنی موٹر وے نے اس ایک دن میں کر کے دکھا دی۔ لاہور کی سڑکوں پر جگہ جگہ پیلے کپڑوں اور پیلی پگڑیوں میں ملبوس ڈھول بجانے اور لڈی ڈالنے والے ''صاحبان ذوق'' کے منتظر بیٹھے تھے چنانچہ ان کے پاس کاریں آ کر رکتی تھیں اور انہیں پوری رات کے لئے بک کر کے ساتھ لے جاتی تھیں۔ اس کے بعد ان چھتوں پر ڈھول بھی بجتے رہے' لڈیاں بھی پڑتی رہیں اور دوستوں کے سروں پر سے وار کے ہزاروں روپوں کی ویلیں بھی فضا میں اچھالی گئیں۔ صرف یہی نہیں' بہت سی چھتوں پر مجرے بھی ہوئے اور اس مجرے کے ساتھ مجرے کے سارے لوازمات بھی شامل تھے۔ اکثر بڑی چھتوں پر پیچوں کے ساتھ عشق پیچے بھی پڑتے رہے کہ محفلیں مخلوط تھیں!

اس بسنت کے موقع پر ''کھلاڑیوں'' نے فاؤل بھی بہت کئے' کچھ فاؤل تو وہ تھے جو ایسے مواقع پر ہمیشہ کئے جاتے ہیں لیکن اس دفعہ ایک نیا فاؤل بھی دیکھنے میں آیا۔ بسنت کی رات کو ایک اجنبی چھت سے ایک سیاہ رنگ کا گڈا اڑایا گیا اور اسے فضا میں بہت اونچائی تک لے جایا گیا' حتیٰ کہ رات کی سیاہی میں وہ دوسرے کھلاڑیوں کو نظر آنا بند ہو گیا۔ اونچائی پر مناسب ہوا کی موجودگی کی وجہ سے یہ گڈا پوری طرح اپنے ''تن'' میں تھا اور کسی کو نظر بھی نہیں آتا تھا چنانچہ وہ شب خون کے انداز میں ڈائی مار کر کسی کمزور اور ادھاڑی پتنگ پر گرتا اور اسے کاٹ کر رکھ دیتا۔ جس کی پتنگ کٹتی تھی اسے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ اس کی پتنگ کون کاٹ گیا ہے' چنانچہ اس دکھائی نہ دینے والے گڈے کی وجہ سے پتنگ بازوں میں خوف و ہراس اور دہشت کی وہ فضا پیدا ہوئی کہ کئی ماہر پتنگ بازوں سے اس انجانی آفت سے بچنے کے لئے اپنی پتنگیں اتار لیں' مگر کچھ دیر بعد اپنے ہی ''تن'' کی وجہ سے اس گڈے کی ڈور ٹوٹ گئی اور بسنت پر پھر سے بہار آ گئی۔

لاہور ہی میں ایک بسنت اس کے علاوہ بھی تھی جس میں نہ باجے تھے' نہ ہزاروں روپوں کی ڈوریں تھیں' نہ سینکڑوں مہمان مدعو تھے' نہ پکوان تیار ہو رہے تھے اور نہ ہی وہ شور شرابہ تھا جو چھتوں سے سنائی دیتا تھا۔ یہ بسنت منانے والے اس شہر کے وہ غریب بچے اور نوجوان تھے جو اس بسنت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے جو شہر کی بے شمار چھتوں پر منائی جا رہی تھی۔ یہ لوگ گلیوں میں اور اپنے گھر کی ممٹیوں پر ''ٹہا نگیاں'' اور ''گاٹیاں'' ہاتھ میں پکڑے آسمان پر نظریں جمائے کھڑے تھے اور ہر کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ بیشتر اوقات پتنگ کسی کے حصے میں نہیں آتی تھی کہ محروم رہ جانے والا آگے بڑھ کر وہ پتنگ ہی پھاڑ دیتا تھا جو اس جیسے دوسرے محروم شخص کے ہاتھ میں آئی ہوتی تھی۔ پتنگ کے ساتھ آنے والی ڈور کی ''گٹھیں'' کی جاتیں اور جب بہت ساری ''گٹھیں'' اکٹھی ہو جاتیں تو گانٹھ لگا لگا کر انہیں یکجا کیا جاتا اور پھر کاغذ کا گولا بنا کر اس کے گرد یہ لوٹی ہوئی ڈور جس میں جوڑ ہی جوڑ ہوتے تھے' لپیٹ دی جاتی پھر یہ ''پنا'' ہاتھ میں پکڑے' کٹی پھٹی پتنگیں کو پیوند لگا کر یہ اسے فضا میں بلند کرتے اور سمجھتے کہ وہ بھی بسنت منانے والے ہجوم کا حصہ ہیں لیکن چند ہی لمحوں بعد ان کی پتنگ جوڑ لگے ہوئے ڈور کی وجہ سے خود ہی ٹوٹ جاتی اور یا پھر کوئی چھ فٹ کا گڈا اس پر جھپٹتا اور اسے ''اڑیس'' کر اپنے ساتھ لے جاتا! اور یہ لوگ ایک دفعہ پھر اپنی ''ٹہا نگیاں'' اور ''گاٹیاں'' پکڑے آسمان پر حسرت بھری نظریں جما دیتے۔

اس روز میں نے ایک منظر دیکھا جو میں بھول نہیں سکتا' ایک ٹانگوں سے معذور بچہ جسے اس کا ''مالک'' بھیک مانگنے کے لئے سڑک کے کنارے بٹھا گیا تھا لیکن اس روز اس کا دھیان پاس سے گزرتے ہوئے کسی ''سخی'' کی طرف نہیں تھا بلکہ آسمان پر اڑنے والی پتنگوں کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے بھاگنے والوں کی طرف تھا۔ اس دوران ایک پتنگ کٹ کر اس سے ذرا فاصلے پر جا گری۔ اس معذور بچے کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک نمودار ہوئی جو جانے کتنے عرصے بعد اس کی آنکھوں میں آئی تھی' یہ اپنے معذور جسم کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اس پتنگ کی طرف بڑھا اور جب یہ پتنگ اس کے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئی' ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور یہ پتنگ لوٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ معذور بچہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ پتنگ لوٹنے والے بچے کی آنکھوں میں بھی خوشی کی وہی چمک تھی جو چند لمحے پیشتر معذور بچے کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارا نظام بھی عجیب نظام ہے' ایک آنکھ کو خوشی دیتا اور دوسری آنکھ کو آنسوؤں سے بھر جاتا ہے۔

بسنت کا جشن پورے کروفر سے منانے والے' کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے مارے مارے پھرنے والوں کو ''لٹیرے'' کا نام دیتے ہیں۔ میں آج سارا دن سوچتا رہا کہ اس دفعہ ریس کورس پارک میں سرکاری طور پر بسنت منانے والی حکومت نے ''لٹیرا 2000ء'' کے

ایوارڈ کا اعلان کیا ہے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت لاکھوں روپے بسنت پر خرچ کرنے والوں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خیرات میں بسنت منانے والوں میں سے کس طبقے کو لٹیرا قرار دیتی ہے اور پھر اس طبقے میں کس ''خوش نصیب'' کو ''لٹیرا 2000ء'' کے خطاب سے نوازتی ہے؟ مجھے اس ایوارڈ یافتہ لٹیرے کا انتظار رہے گا۔ ویسے اگر میں مصنفین میں شامل ہوتا تو بسنت رات کو شب خون مارنے والے سیاہ گدڑے کے لئے متذکرہ ایوارڈ سے الگ ایک خصوصی ایوارڈ کا اعلان کرتا!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (3)

مجبوری

پاکستان میں میری ملاقاتیں سیاست دانوں اور صحافیوں سے بھی ہوتی رہیں۔ یہ لوگ بڑے وسیع القلب ہیں' غیر ملکیوں کے سامنے یہی اپنے ملک کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ سیاستدان کے حوالے سے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی اور وہ یہ کہ ان کی اکثریت اشاروں کنایوں میں خود کو جی ایچ کیو یا امریکہ کا بندہ ثابت کرتی ہے' حکمرانوں کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی گفتگوؤں میں اسی قسم کے اشارے دیتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر میرے دوست نے بتایا کہ یہ ان کی مجبوری ہے کیونکہ ہمارے ہاں حکومت میں آنے کا یا حکومت میں رہنے کے لئے جی ایچ کیو اور امریکہ کی اشیر باد ضروری سمجھی جاتی ہے!

امریکی سفیر

میرا ایک دوست مجھے ایک اپوزیشن لیڈر کے پاس لے گیا' اس نے میری بہت آؤ بھگت کی اور میرے کچھ پوچھے بغیر پاکستان کی خرابیاں گنوانا شروع کر دیں اور تان اس پر توڑی کہ ان خرابیوں کا حل صرف اس کی جماعت کے پاس ہے۔ اس دوران اسے انٹر کام پر ایک پیغام موصول ہوا جس کے جواب میں اس لیڈر نے کچھ کہا..... بعد میں میرے دوست نے مجھے بتایا کہ اسے پیغام ملا تھا کہ باہر پارٹی کے کارکن ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہیں جس کے جواب میں اس نے کہا کہ انہیں کہو کہ وہ انتظار کریں' میں اس وقت امریکی سفیر کے ساتھ کچھ ضروری امور پر تبادلہ خیال کر رہا ہوں۔ دوست نے بتایا کہ اس نے یہ بات بہت آہستہ سے کہی تھی مگر میں نے سن لی تھی۔ میں بہر حال اپنے مرتبے میں اس اچانک اضافے پر بہت خوش ہوا!

تیسری دنیا کے ممالک

جو دوست مجھے اس لیڈر کے پاس لے گیا تھا وہ خود بھی بہت کائیاں تھا اور لیڈروں پر اپنے تعلقات کا رعب جما کر ان سے کام نکلواتا تھا۔ میں کہیں اس کے سامنے کہہ بیٹھا کہ پاکستان میں امریکی سفیر میرے کالج کے زمانے کا دوست ہے' اس پر یہ اگلے روز

حکمران سیاسی پارٹی کے ایک لیڈر کو میرے پاس لایا اور درخواست کی کہ اس کی خفیہ ملاقات امریکی سفیر سے کرائی جائے۔ میرا تو پاکستان کے دورے کا مقصد ہی پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جاننا تھا کہ واپسی پر کتاب لکھ سکوں چنانچہ میں اس لیڈر کو اپنے دوست امریکی سفیر کے پاس لے گیا کہ دیکھیں خفیہ ملاقات میں یہ لوگ کس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو حکمران سیاسی پارٹی کے اس لیڈر نے بالواسطہ طور پر اور بہت محتاط لفظوں میں امریکی سفیر سے کہا کہ وہ اسے پاکستان میں سی آئی کا ایجنٹ مقرر کر دیں۔ اس پر میرے سفیر دوست نے بہت شائستگی سے کہا کہ تم میرے ایک عزیز دوست کے ساتھ آئے ہو' میں تمہارا کام ضرور کرتا مگر ایک پرابلم یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں سی آئی اے کا ایجنٹ صرف اس ملک کا سربراہ ہوتا ہے! میرے خیال میں میرے سفیر دوست نے یہ بات محض ٹرخانے کے لئے کہی تھی کیونکہ ممکن ہے ساری اسامیاں پر ہو چکی ہوں۔

خصوصی اہتمام

میں ابھی پاکستان میں ہی تھا کہ حسب معمول وہاں مارشل لاء لگ گیا' اتفاق سے اسی دن میری ملاقات ایک لیڈر سے طے ہوئی تھی' دوران ملاقات ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پھر یہ لیڈر میری موجودگی سے بالکل بے نیاز ہو کر آدھ گھنٹہ تک مسلسل باتیں کرتا رہا۔ جب اس نے بات ختم کی تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''معافی چاہتا ہوں' مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا فون تھا' وہ کچھ ضروری مشورے کرنا چاہ رہے تھے'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''سارے سیاست دانوں کے فون تو کاٹ دیئے گئے ہیں' آپ کا فون کیسے آ گیا'' اس پر وہ کچھ پریشان ہوا مگر سنبھل کر بولا ''میرے لئے خصوصی ٹیلی فون لائن کا بندوبست کیا گیا تھا۔'' شاید وہ ٹھیک کہتا ہو' کیونکہ مارشل لاء ایک غیر فطری نظام ہے اور یوں اس میں ہر غیر فطری اور ناممکن چیز ممکن ہے!

غیر معقول وجہ

میں ایک روز اپنے ایک پاکستانی میزبان کے گھر کھانے کی دعوت پر گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اس کا ایک بارہ چودہ سالہ بچہ بہت سہما ہوا تھا' میں نے اس کی وجہ اپنے میزبان سے دریافت کی تو اس نے کہا ''اس کا یہ سہم اور خوف مارشل لاء کی وجہ سے ہے'' میں نے پوچھا ''اس معصوم بچے کو مارشل لاء سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے'' میزبان نے جواب دیا ''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ اس طرح کے سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ' میں نے پہلے مارشل لاء کے بارے صرف سنا ہوا تھا' لیکن دیکھا اب ہے!'' مجھے یہ وجہ کوئی اتنی معقول نظر نہیں آئی۔ دراصل کچھ پاکستانی ایسے بھی ہیں جو میرے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھ سے بہت سی باتیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں!

بغیر خبروں والے اخبار

میں ایک کافی ہاؤس میں کافی پینے کے لئے گیا تو وہاں اردو کا ایک اخبار میز پر دھرا تھا' اس میں ایک ایک صفحے پر کئی تصویریں تھی' ان تصویروں میں سے میں صرف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی تصویر پہچانتا تھا' مجھے تجسس ہوا کہ پتہ کروں کہ اس کی تصویر اگر شائع ہوئی ہے تو اس نے کیا کہا ہے یقیناً کوئی بہت اہم بات کی ہوگی۔ کافی ہاؤس میں برابر کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے ایک پاکستانی سے میں نے اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کہا ہے کہ وہ تمام برائیاں نوے دن کے اندر ختم کر دیں گے۔ میں نے پوچھا اس کے علاوہ کیا کہا ہے' پاکستانی نے جواب دیا' اس کے علاوہ تو کچھ نہیں کہا۔ اس پر میں نے پوچھا ''پھر یہ بیان خبر کے طور پر شائع ہوا' اس میں خبر کہاں ہے'' بیچارہ پاکستانی میری اس حیرت پر حیران رہ گیا! شاید یہ لوگ بیانات ہی کو خبر سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ باقی صفحوں پر بھی اسی طرح کی ''خبریں'' تھیں جو وزیروں اور لیڈروں کے بیانات پر مشتمل تھیں۔ پاکستان شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اکثر اخبارات بغیر خبروں کے شائع ہوتے ہیں!

عوامی اخبار

اسی اخبار کا فرنٹ پیج اور بیک پیج مختلف قسم کی تصویروں اور خبروں سے بھرا ہوا تھا' برابر والی ٹیبل پر بیٹھے پاکستانی نے مجھے بتایا کہ یہ عوام کے مختلف طبقوں جن میں اپوزیشن رہنما' اداکارائیں اور کاروباری افراد وغیرہ شامل ہیں' کے بارے میں سیکنڈلز کی خبریں اور تصویریں ہیں' میں نے پوچھا کہ یہ شام کا اخبار ہے' اس نے کہا نہیں' میں بہت حیران ہوا کیونکہ ہمارے ہاں سنسنی خیز جرائم اور سکینڈل کی خبریں صرف شام کے اخبار شائع کرتے ہیں جو ہمارے عوام شوق سے پڑھتے ہیں' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان کی قومی صحافت بھی عوام کی پسند اور ناپسند کا کس درجہ خیال رکھتی ہے!

ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں

چند روز پیشتر ایک خبر شائع ہوئی کہ برطانیہ میں ہم جنس پرستوں کے مطالبہ پر ہم جنس پرستی کے لئے عمر کی حد 18 سال سے کم کر کے 16 سال کر دی گئی ہے' یہ خبر پاکستان کے مختلف شہروں میں بہت دلچسپی سے پڑھی گئی ہوگی' شنید ہے کہ برطانوی اخبارات میں اس خبر کی اشاعت کے بعد ایک بوڑھے انگریز نے اپنا بوریا بستر باندھا اور اعلان کیا کہ وہ برطانیہ سے ترک وطن کر کے کسی اور ملک منتقل ہو رہا ہے' اس کے دوست نے پوچھا کہ کون سی ایسی اچانک آفت آن پڑی ہے کہ تم ترک وطن کر رہے ہو۔ بوڑھے انگریز نے جواب

دیا ''جب میں بچہ تھا تو معاشرے میں ہم جنس پرستی کو انتہائی نفرت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا' جب ذرا بڑا ہوا تو محسوس ہوا کیا کہ اس نفرت میں قدرے کمی واقع ہوگئی ہے۔ جب مزید بڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ معاشرے نے نفرت تو کجا' اس فعل کو ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ چند سال پیشتر برطانوی پارلیمنٹ نے ہم جنس پرستی کو قانونی قرار دے دیا ہے۔ اب اس کی عمر گھٹا کر 16 سال کر دی گئی ہے' لہٰذا میں اب برطانیہ میں نہیں رہ سکتا''

دوست نے حیرت سے پوچھا ''اگر عمر 18 سال سے کم کر کے 16 سال کر دی گئی ہے تو تمہیں اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' بوڑھے انگریز نے جواب دیا ''جس طرح مرحلہ وار نوبت یہاں تک پہنچی ہے' مجھے ڈر ہے کہ اگلے مرحلے میں حکومت ہم جنس پرستی کو کہیں لازمی نہ قرار دے ڈالے' لہٰذا میں ترک وطن کر رہا ہوں''

کچھ اسی طرح کی صورت حال ہمارے ہاں بھی پیدا ہو چکی ہے' میں جب چھوٹا تھا تو معاشرے میں راشی شخص کو شدید نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا' کوئی بلیک کرتا تھا تو اس کا نام 'بلیکیا'' پڑ جاتا تھا' سمگلر کا سن کر تو خوف خدا سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے' کسی سیاستدان' کسی صحافی کسی جج یا کسی جرنیل کے بارے میں کبھی یہ سننے میں نہیں آیا تھا کہ وہ کسی قسم کی کرپشن میں ملوث ہے' مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا' زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ کرپشن میں ملوث ہوتے چلے گئے اور اب صورت حال یہ ہے کہ معاشرے میں وہی معزز ہے جس نے کرپشن سے پلازے کھڑے کئے ہیں بلکہ اب تو معاملہ یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر رزق حلال سے وابستہ رہے اور جنہوں نے اپنے بچوں کو ایک لقمہ بھی حرام نہیں کھلایا' کوئی ایک شخص کسی مجمع کے سامنے کرپٹ کہہ دے' سارا مجمع اسے کرپٹ مان لے گا' اب لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کوئی شخص کرپشن کی پوزیشن میں ہے اور وہ کرپٹ نہیں ہے۔

معاشرتی زوال صرف کرپشن کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' 1970ء تک لوگوں میں سیاسی اور مذہبی رواداری اور ایک دوسرے کے نکتہ نظر کو برداشت کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی اب تو پیدا ہوتے ہی ہم اپنے بچوں کے سروں پر بنے بنائے نظریات کے کلبوت چڑھا دیتے ہیں' جس کے نتیجے میں دولے شاہ کے چوہوں کی تعداد معاشرے میں بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اپنی ساٹھ کی دہائی کی تحریریں پڑھتا ہوں تو خود حیران ہونا شروع ہو جاتا ہوں کہ اتنی متنازعہ باتیں میں نے لکھیں کیسے' اور معاشرے نے برداشت کیسے کیں' مجھے یاد ہے کہ میں نے 69ء میں امریکہ سے ایک کالم مجید نظامی صاحب کو ارسال کیا جس میں' میں نے لکھا تھا کہ ہمارے معاشرے میں جنسی گھٹن بہت زیادہ ہے' جس کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کی ساری ذہنی انرجی سوچ کے اسی محور میں ضائع ہو جاتی ہے چنانچہ اس گھٹن کا کوئی OUT LINE ہونا چاہیے۔ میرا یہ کالم شائع ہوا تو اس پر دو افراد نے احتجاج کیا ایک میرے والد ماجد نے' جو خود نظامی صاحب کے پاس گئے اور کہا'' آپ نے عطاء الحق کی یہ کیا اخرافات شائع کی ہے'' جس کے

جواب میں نظامی صاحب نے کہا ''سچی بات یہ ہے کہ خود مجھے بھی اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے لیکن میں نے یہ سوچا کہ ایک نوجوان کے خیالات ضرور سامنے آنے چاہئیں'' دوسرا احتجاج میرے عزیزی دوست حافظ ادریس صاحب کا تھا جو ان دنوں اسلامی جمعیت طلبہ کے عہدیدار تھے اور آج کل جماعت اسلام کے سیکرٹری جنرل ہیں' ان کا احتجاج نہیں بلکہ اختلاف مراسلے کی صورت میں تھا جو نوائے وقت میں شائع ہو گیا!

مگر اب معاشرہ کسی بھی مسئلے پر ذرا سا اختلاف بھی برداشت کرنے کا اہل نہیں رہا ہم نے گوجرانوالہ کے ایک حافظ قرآن کو محض سنی سنائی بات پر زندہ جلا دیا اور اس کی لاش موٹر سائیکل سے باندھ کر پورے شہر میں گھسیٹتے رہے صرف مذہب ہی نہیں' ہم سیاسی مسائل پر بھی ایک دوسرے سے دست گریباں ہو جاتے ہیں اور غلیظ ترین الزامات بغیر کسی ثبوت کے عائد کرتے ہیں' ہم میں سے ہر ایک نے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا ہوا ہے اور مطالبہ کر رہا ہے کہ میری رائے سے اتفاق کرو ورنہ سر آگے کرو!

میں سوچتا ہوں جناح اور اقبال ایسے لبرل اور بے داغ راہنماؤں کی قوم نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا اور اختتام کہاں کرنا چاہتی ہے۔ بوڑھے انگریز نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا تھا مگر ہم لوگ تو ایسا بھی نہیں کر سکتے کہ بقول شاعر:

اذان پہ قید نہیں' بندش نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں

◆◆◆

عاشق گونگا!

عاشق گونگا میرا محلے دار ہے۔ میں جس بستی میں رہتا ہوں' یہ سفید پوشوں کی بستی ہے' یہاں پانچ اور دس مرلے کے مکان ہیں اور میری طرح باقی لوگوں نے بھی ہاؤس بلڈنگ والوں سے ایک لاکھ روپے قرض لے کر اپنے مکان بنائے تھے' جو سولہ سترہ برسوں میں دوگنی اور تگنی رقم ادا کر کے اب جا کر ''فارغ البال'' ہوئے ہیں' چنانچہ اس بستی میں نوے فیصد لوگ آپ کو ''فارغ البال'' نظر آئیں گے۔ مہنگائی کے اس دور میں حجامت کے چار پیسے بچ جائیں تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

عاشق گونگے کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے ہے۔ یہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اور بڑی دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد محکمہ تعلیم میں سیکشن افسر تھے اور اب وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں معمولی پنشن ملتی ہے اور مہنگائی غیر معمولی طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکی ہیں' بیوی فوت ہو چکی ہے چنانچہ اب وہ اکلوتے بیٹے عاشق گونگے اور اپنی بہو کے ساتھ رہتے ہیں۔

عاشق گونگا جب پیدا ہوا تو کسی کو اندازہ نہ تھا کہ قدرت نے اس کے ساتھ کیا مذاق کیا ہے' وہ تو تین چار سال کی عمر میں جب وہ غوں غاں سے آگے نہ بڑھا تو ماں باپ پر بھید کھلا کہ وہ پیدائشی گونگا ہے۔ اسے گونگوں کے سکول میں داخل کرایا گیا' مگر وہ وہاں بھی زیادہ چل نہ سکا' تاہم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب وہ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہے' اسے بڑی مشکل سے ایک رشتہ ملا' لڑکی گونگی تو نہیں تھی البتہ توتلی تھی' اتنی توتلی کہ اس کی نسبت عاشق گونگے کی بات زیادہ سمجھ میں آ جاتی تھی۔ گونگیوں کے رشتے بہت آ رہے تھے مگر عاشق کے والد کو وہم تھا کہ اگر ان کی بہو گونگی ہوئی تو ان کی آئندہ نسل بھی کہیں ''بے زبان'' نہ رہ جائے چنانچہ انہوں نے گونگیوں میں سے توتلی کو منتخب کیا' کئی سال بعد ابھی دو دن پہلے عاشق ایک بیٹے کا باپ بنا ہے' اب ڈاکٹر معائنے کے بعد ہی بتائیں گے کہ ان کی آئندہ نسل کو قدرت نے قوت گویائی عطا کی ہے یا وہ بھی گونگی رہے گی!

عاشق نے محلے میں کریانے کی دکان کھول رکھی ہے' اس کے سیکشن افسر باپ کو یہ اچھا تو نہیں لگتا لیکن جب زندگی کی مفلس حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو پھر اچھائی برائی کے معیار بدل جاتے ہیں۔ عاشق بہت زندہ دل شخص ہے' سارا دن لوگوں کو اپنی حرکتوں سے ہنساتا رہتا ہے چنانچہ اس کی دکان پر گاہکوں کے علاوہ ویسے بھی رونق رہتی ہے۔ میں انڈے ڈبل روٹی وغیرہ اس کی دکان سے لیتا ہوں اور

پھر اس کے ساتھ واہیات اشاروں سے گفتگو کر کے جب گھر لوٹتا ہوں تو بیوی کو کالج سے دیر ہو چکی ہوتی ہے اور یوں ہمارے مابین اکثر لڑائیاں عاشق گونگے کی وجہ سے ہوتی ہیں!

عاشق کو مذہب' فنون لطیفہ اور معاشرتی مسائل کے علاوہ محلے کی سیاست سے لے کر ملک کی سیاست تک ہر چیز میں بہت دلچسپی ہے تاہم اخبار پڑھتا کم ہے اور اس میں تصویریں زیادہ دیکھتا ہے۔ ایک دن مجھے اداکارہ نرما کی تصویر دکھانے لگا' اچھی تصویر تھی مگر مجھے سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ تصویر دکھانے کا مقصد کیا ہے' وہ کافی دیر تک مجھے اشاروں میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا رہا جب ''ککھ'' سمجھ نہ آئی تو اس نے کیسٹ نکالی اور ٹیپ ریکارڈ میں ڈال کر ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا اور پھر ''چن میرے مکھناں'' والے گانے پر نرما کے انداز میں گردن کو ہلانے اور جسم کو تھرکانے لگا..... اور پھر ٹیپ ریکارڈ بند کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی طرف سے نرما کو خراج تحسین تھا!

عاشق گونگا ہنستا بہت ہے۔ اور بعض دفعہ تو حد ہی کر دیتا ہے۔ ایک دفعہ اس بات پر ہنستے ہنستے دہرا ہوتا چلا گیا کہ شاعر حضرات غزل میں محبوب کے حوالے سے جو کچھ کہتے ہیں' اگر وہ وہی باتیں نثر میں کریں تو ان پر حدود آرڈیننس نافذ ہو سکتا ہے۔ مجھے اس کے اتنا زیادہ ہنسنے پر اعتراض نہیں تھا' مگر مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس بات کا پتہ مولوی مدن کو چل گیا تو اگلے جمعے شہر کی ہر مسجد کے باہر غزل کے خلاف اور غزل گوؤں کو کوڑے مارنے کے مطالبے پر مشتمل پوسٹر چسپاں ہوں گے اور اس سے اگلے جمعے شہر میں دھرنے بھی لگ سکتے ہیں' چنانچہ میں نے مولوی مدن کو آتے دیکھا تو اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا!

عاشق میرا بہت احترام کرتا ہے۔ گزشتہ روز میں صبح اس کی دکان پر ناشتے کا سامان لینے گیا تو وہ اخبار سامنے دھرے بیٹھا تھا اور خلاف معمول کافی سنجیدہ بھی لگتا تھا۔ اس نے ہیڈ لائن کی طرف اشارہ کیا جو نواز شریف کے سینئر وکلاء اعجاز بٹالوی اور خواجہ سلطان احمد کی طرف سے مقدمے کی پیروی سے دستبرداری کے اعلان سے متعلق تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ استغاثہ کے بیانات کی اشاعت کے بعد ان کے موکل کے بیان پر عدالتی پابندی کے بعد انہیں مقدمے کی پیروی کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا' اب اللہ ہی نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کا وکیل ہے۔ میں نے صبح کی چائے پیتے وقت یہ خبر پڑھ لی تھی۔ عاشق گونگے نے ایک دفعہ پھر اشارے سے پوچھا کہ تمہاری اس خبر کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میں دیکھا کہ دکان پر بہت لوگ کھڑے تھے' ان میں مولوی مدن بھی تھا جس نے کان کھڑے کر لئے تھے اور میرے جواب کا منتظر تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اشارے سے کہا کہ میرے پاس عینک نہیں ہے۔ اس پر مولوی مدن نے فوراً اپنی عینک پیش کر دی میں نے عینک اپنی ناک پر جمائی اور پھر فوراً یہ کہہ کر واپس کر دی کہ مجھے

اس سے کچھ نظر نہیں آتا' حالانکہ میرے اور مولوی مدن کے نمبر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا!

پھر نجانے کیا ہوا' عاشق گونگے کی ساری سنجیدگی ایک دم غائب ہوگئی اور اس نے بہت بری طرح ہنسنا شروع کر دیا۔ ہنستے ہنستے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا' مجھے اس کی اس بدتمیزی پر بہت غصہ آیا' اس نے زندگی میں پہلی دفعہ میرا اس طرح مذاق اڑایا تھا۔ کافی دیر بعد اس کی ہنسی تھمی تو اس نے اشاروں کی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور جلدی سے سودا شاپر میں ڈال کر گھر کو چل دیا' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ معزول وزیر اعظم پر فوجی حکومت کے دائر کردہ طیارہ کیس اور اس ضمن میں عدالتی رویے کے حوالے سے میری رائے لینا چاہتا تھا!

گھر پہنچ کر میں تیار ہونے کے لئے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو اس روز میں نے محسوس کیا کہ میں بہت زیادہ بدصورت ہو گیا ہوں مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اپنی بیوی کو آواز دینا چاہی مگر میری آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی اور میں صرف غوں غاں کر کے رہ گیا! دراصل جب روح مسخ ہوتی ہے تو جسم کی کیمسٹری بدلنے لگتی ہے اور اس کے نتیجے میں چہرے بھی مسخ ہونا شروع ہو جاتے ہیں' جو حساس لوگ ہوتے ہیں وہ بظاہر پہلے ہی کی طرح ہنستے بولتے رہتے ہیں لیکن انہیں اپنے طور پر لگتا ہے کہ وہ کچھ کہہ نہیں رہے' صرف غوں غاں کر رہے ہیں اور شاید گونگے ہو گئے ہیں!

میرے حلقہ احباب میں ڈاکٹر' پروفیسر' علماء' صحافی' جج صاحبان' اور ان کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگ شامل ہیں' میں آج ان کی طرف جاؤں گا اور مشورہ طلب کروں گا کہ مجھے نارمل ہونے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟ مجھے یقین ہے وہ مجھے صحیح مشورہ دیں گے۔

بشرطیکہ وہ بھی ابھی تک میری طرح اندر سے گونگے نہ ہو چکے ہوں!

◆◆◆

اتحاد مبارک ہو

میرے خیال میں انسان جو بات محسوس کرے وہ اسے کھل کر اور واضح طور پر بیان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ آج میں اسی موڈ میں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے بارے میں جو غلط فہمیاں مختلف حلقوں میں پائی جاتی تھیں' وہ اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود ان کی حکومت کو ان حلقوں نے دلی طور پر تسلیم کر لیا ہے' میرا اشارہ ملک کی بیشتر دینی جماعتوں کی طرف ہے۔ بلکہ اگر میں اپنا دل کھول کر آپکے سامنے رکھوں تو آپ کو یہ مسرت بھرا ملے گا کہ ایک عمر کے بعد میری خواہش پوری ہوئی ہے۔ میں پہلے دن سے اس امر کا خواہش مند تھا کہ مذہبی اور سیکولر حلقوں میں اختلاف رائے تو ہونا چاہیے لیکن یہ اختلاف رائے اس انتہا کو نہیں پہنچنا چاہیے کہ یہ تصادم کی شکل اختیار کر لے اور الحمد اللہ میری یہ خواہش جنرل پرویز مشرف کی حکومت میں پوری ہوئی کہ مذہبی اور سیکولر دونوں طبقے باہمی اختلافات اور جنرل صاحب کی حکومت سے بعض فروعی اختلافات کے بنیادی حق کو چیلنج کرتے ہیں۔ مذہبی طبقوں پر جو حلقے تنگ دلی کا الزام لگاتے تھے امید ہے وہ رواداری اور تحمل کے اس رویئے کے بعد اپنی رائے پر نظر ثانی کریں گے۔

اسی طرح ہمارا انگریزی دان' روشن خیال اور سیکولر طبقہ مغرب کی تقلید میں ماضی قریب اور ماضی بعید میں بھی انسانی حقوق' بنیادی حقوق' جمہوری حقوق اور آئینی حقوق وغیرہ کی رٹ لگا کر انتخابات کے ذریعے کامیاب ہونے والی حکومتوں کا ناطقہ بند کئے رکھتا تھا وہ بھی وقت کی ضرورت کو سمجھ گیا ہے اور اب اچھے بچوں کی طرح Behave کر رہا ہے بلکہ مغرب بھی موجود فوجی حکومت کی پالیسیوں سے خوش ہے' میں سمجھتا ہوں کہ مغربی اور مذہبی حلقوں میں یہ خوشگوار باہمی افہام و تفہیم پاکستان کی خوش فہمی ہے' اللہ تعالیٰ اس اتحاد کو نظر بد سے بچائے!

میرے متذکرہ دعوے کی تائید بارہ اکتوبر کے بعد مسلسل ہو رہی ہے چنانچہ روزانہ کے اخبارات میں شائع ہونے والے بیانات یا نہ شائع ہونے والے بیانات میرے اس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شروع شروع میں مذہبی حلقوں کو جنرل صاحب کی تصویر پر اعتراض ہوا تھا جو انہوں نے کتوں کو گود میں لے کر شائع کروائی تھی اسی طرح ان پر ''اتاترک'' ہونے کا ''الزام'' بھی لگا۔ مغربی ملکوں کی مالی امداد سے چلنے والی مشکوک قسم کی این جی اوز کے چھا جانے کی بات بھی ہوئی' جنرل صاحب کی ٹیم کے بعض ارکان کو قادیانی قرار دیا گیا اور بعض کے متعلق کہا گیا کہ ان کی حب الوطنی تک مشکوک ہے۔ اس طرح کی بے شمار باتیں ہوئیں اور

ابھی تک مذہبی حلقوں سے گاہے بگاہے اس نوع کے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں لیکن قوم و ملک اور اسلام کے وسیع تر مفاد میں ہمارے مذہبی طبقے رواداری اور تحمل کی شاندار اور بالکل نئی روایت قائم کرتے ہوئے جنرل صاحب معاشرے میں کرپشن کے خاتمے اور کشمیر کی فتح تک پورا وقت دینے کو تیار ہیں۔ رواداری اور معاملہ فہمی کی یہ فضا پاکستان میں پہلی دفعہ پیدا ہوئی ہے اور اس کا تھوڑا بہت کریڈٹ معزول وزیر اعظم میاں نواز شریف کو بھی جاتا ہے کہ بعض اوقات مختلف الخیال لوگ کسی ''مشترکہ دشمن'' کی وجہ سے اکٹھے ہو جاتے ہیں!

آج کے اخبار میں دو بہت اہم شخصیتوں کے بیانات شائع ہوئے ہیں جن سے ایک بار پھر میرے تھیسیز کی تائید ہوتی ہے' ایک شخصیت ہمارے مذہبی حلقوں میں ایک معتبر حیثیت رکھتی ہے اور دوسری شخصیت روشن خیال طبقوں کی نمائندہ ہے' میرا اشارہ جماعت اہلحدیث پاکستان کے سربراہ زبیر احمد ظہیر اور اداکارہ انجمن کی طرف ہے۔ علامہ صاحب نے کہا ہے کہ میاں نواز شریف کے جانے اور جنرل پرویز مشرف کے آنے سے بھارتی حکمرانوں کے تمام جواب چکنا چور ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''مرکزی جماعت اہلحدیث اس وقت تک موجود حکمرانوں کا ساتھ دیتی رہے گی جب تک یہ حکومت سیدھے راستے پر گامزن رہے'' سیدھے راستے کو عربی میں ''صراط مستقیم'' کہتے ہیں اور ہم مسلمان روزانہ نماز میں چودہ سو سال سے یہ دعا مانگتے چلے آ رہے تھے کہ ''(اے خدا) ہمیں سیدھے راستے پر چلا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام عطا کیا اور ان کے راستے پر نہ چلا جن پر تیرا غضب نازل ہوا'' علامہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمالی ہے چنانچہ موجودہ حکومت ''صراط مستقیم'' پر چل رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے تنبیہہ کر کے علمائے حق کی روایت کو زندہ رکھا ہے کہ جس روز یہ حکومت صراط مستقیم سے ہٹی اس روز اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لئے جائیں گے۔

روشن خیال طبقوں میں سے پاکستان فلم انڈسٹری کی ممتاز ہیروئن اداکارہ انجمن نے بھی موجودہ حکومت کی تعریف کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ روشن خیال جنرل پرویز مشرف فلمی صنعت کے لئے امید کی کرن ہیں' انہوں نے یہ فرمایا کہ گذشتہ حکومت فلم انڈسٹری اور اس سے وابستہ افراد کو نظر انداز کرتی رہی۔ اداکارہ انجمن کے علاوہ انگریزی اخباروں کے تمام روشن خیال کالم نگاروں اور دانشور جنرل صاحب کی حکومت سے بعض اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر ان کے حامی ہیں' اسی طرح اردو اخبارات میں احمد بشیر اور اعجاز الحسن ایسے روشن خیال دانشوروں کے مضامین میں نے پڑھے ہیں' اللہ انہیں جزائے خیر دے' انہوں نے بھی انسانی حقوق' جمہوری حقوق اور آئینی حقوق وغیرہ کی بے معنی رٹ ختم کر دی ہے اور وہ موجودہ حکومت کو روشن خیال اور سیکولر تصور کرتے ہوئے اس کی درازی عمر کے

لئے دعا گو ہیں۔ ماضی میں جنرل ایوب خان کی حمایت کا بھی یہی جواز پیش کیا گیا تھا۔ بہر حال اس دعا میں بھی صدق دل سے شامل ہوں، ممکن ہے ''صراط مستقیم'' پر چلنے والی حکومت کے دست بازو بننے سے میرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں!

◆◆◆

پاکستان کامیڈینز

کامیڈین عمر شریف بہت باصلاحیت فنکار ہیں' وہ ان کامیڈینز میں سے ہیں جو پڑھتے بھی ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ہوٹل سروسز انٹرنیشنل کی لابی میں ملے' میرے دوست نے ان سے میرا تعارف کرانے کی کوشش کی تو انہوں نے میرے دوست کے زبان کھولنے سے پہلے ہی میری چار پانچ کتابوں کے نام لئے اور کہا میں یہ کتابیں کئی کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں!

گذشتہ روز میں پی ٹی وی ایک اسٹیج شو دیکھ رہا تھا جس کی کمپیئرنگ عمر شریف کر رہے تھے' عمر شریف نے اس شو کے دوران ایک بہت مزے کی بات کہی' کہنے لگے عورتیں ہر عمر میں چھوٹی نظر آنے کی خواہش مند ہوتی ہیں بلکہ اپنے نام رکھتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کم عمر لگیں۔ مثال کے طور پر گلوکارہ منی بیگم کا نام ملاحظہ فرمائیں' 9 بچے عمر 53 سال اور ابھی تک منی! اس کے برعکس یہ خواتین مردوں کے ساتھ اس کے برعکس سلوک کرتی ہیں' لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام رکھ دیں گی حشمت اللہ خان' تاکہ پیدائش کے فوراً بعد 65 برس کا لگنے لگے۔ انہوں نے اس پروگرام میں ایک اور بات بہت مزے کی کہی۔ کہنے لگے ''میں ریڈیو سے فرمائشی پروگرام کی کمپیئرنگ کر رہا تھا' ایک غزل کی فرمائش آئی جس کے بول تھے'' چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ'' اور فرمائش کرنے والے کا نام تھا الیاس لنگڑا! ہمارے سٹیج کامیڈینز میں اس وقت جو فنکار عروج پر ہے ان میں امان اللہ' سہیل احمد' مستانہ اور عابد خاں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک نہایت اہم نام طارق جاوید کا بھی تھا لیکن انہیں کسی کی نظر لگ گئی ہے ان کا مزاح بہت تخلیقی نوعیت کا ہوتا تھا اور لگتا تھا انہیں ادب اور تاریخ کے مضامین میں خاصہ شغف ہے لیکن وہ غالباً بیمار ہو گئے اور ان سے اب بات بھی مشکل سے ہوتی ہے۔

اسٹیج کے فنکاروں پر بہت اعتراض کئے جاتے ہیں جن میں سے فحاشی کا الزام سرفہرست ہے اور یہ الزام بے بنیاد نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑا رجحان جو اسٹیج پر پروان چڑھا ہے' وہ لوگوں کو ہنسانے کے لئے فنکاروں کا ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں پر رکیک حملے کرنے کا ہے۔ مجھے یہ سب دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کیونکہ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ ہمارے یہ اسٹیج کے فنکار ذہانت فی البدیہہ جگت بازی اور حاضر دماغی میں دنیا کے کسی فنکار سے کم نہیں ہیں۔

یہ بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ ہمارے ان فنکاروں کو گندگی کا سہارا لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ جو فنکار اتنی تخلیقی حس مزاح رکھتے ہوں کہ گلاس میں پانی منگوانے پر پانی لانے والے کو کہیں کہ اس میں تھوڑا سا پانی اور ملا لاؤ میں ذرا پتلا پانی پیتا

ہوں۔ یا جعلی پہلوان کا کردار کرنے والا اس سوال کے جواب میں کہ پہلوان جی آپ نے کبھی کوئی مقابلہ جیتا بھی ہے' جواب دے کہ ایسی کون سی بات ہے' مدمقابل پہلوان کی مرضی ہو تو مقابلہ جیت بھی لیتے ہیں یا کالی رنگت کے فنکار کے متعلق کہا جائے کہ اتنا بدنصیب ہے کہ ایک دفعہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد گیا مگر لوگوں نے اسے دروازے پر ہی روک لیا اور کہا تمہیں اتنی جلدی کیا ہے' لوگوں نے نماز پڑھ کر آخر باہر ہی نکلنا ہے۔ تو میرے خیال میں انہیں فحاشی اور ایک دوسرے پر گندے حملے کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے!

اسٹیج اداکاراؤں میں ایک اداکارا امانت چن بھی ہے جس کی رنگت خاصی سیاہی مائل ہے' وہ فنکاروں کی جگتوں کا خصوصی ہدف بنتا ہے لیکن اس کی حاضر جوابی اور معصومیت کا انداز ناظرین کو بہت محظوظ کرتا ہے۔ امانت چن پر جگت کی جاتی ہے کہ جب یہ نہاتا ہے تو سکول کے بچے باہر نالی کے پاس اپنی دواتیں سیاہی سے بھرنے کے لئے قطار اندر قطار بیٹھے ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ جس صابن سے نہاتا ہے' وہ صابن کاندھے پر تولیہ رکھ کر خود نہانے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب جگتیں سن کر امانت چن بڑی معصومیت سے انہیں مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے ''بھائی جان! میری بات ہو رہی ہے؟'' اس پر اسے جواب ملتا ہے ''آہو شاہ رخ تیری ہی بات ہو رہی ہے''

مزاح میں ایک بہت بڑا نام معین اختر کا ہے' یہ جگت باز نہیں ہیں' ان کی حیثیت ایک نہایت اعلیٰ درجے کے نقال کی ہے اور اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں نے ہر بہروپ بھرا ہے اور سو فیصد وہی تاثر چھوڑا ہے جو اس کردار کو چھوڑنا چاہیے تھا۔ ہمارا یہ مایہ ناز فنکار شائستہ اور مہذب ہے اور اس میں پھکڑ پن نام کو بھی نہیں ہے!

پاکستان کے نامور کامیڈینز میں اگر دلدار پرویز بھٹی مرحوم کا ذکر نہ کیا جائے تو اس سے بڑی ناانصافی کوئی نہیں ہوگی۔ انگریزی کا یہ پروفیسر' خوبصورت کالم نگار اور اردو اور انگریزی میں نہایت عمدہ شاعری کرنے والا فنکار جن اسٹیج پر آتا تھا تو اس کے جملے فضا میں قہقہے بکھیر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مرحوم صدر ضیاء الحق ایک ثقافتی تقریب میں مہمان خصوصی تھے اور دلدار بھٹی کمپیئرنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ چاروں صوبوں کے فنکار وہاں موجود تھے۔ غلام فرید صابری قوال مرحوم بھی اپنی لمبی زلفوں اور گلے میں پڑے منکوں سمیت مدعوئین میں شامل تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد حسب عادت با آواز بلند اور اپنے مخصوص لہجے میں ''اللہ'' کی صدا لگاتے جس پر لوگ ہنس پڑتے اور بھٹی کی کمپیئرنگ میں خلل پڑتا' جب تیسری چوتھی دفعہ صابری مرحوم نے ''اللہ'' کا نعرہ بلند کیا تو بھٹی نے صابری مرحوم کو مخاطب کر کے کہا ''صابری صاحب آپ اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں' ڈریں اس وقت سے جب اللہ نے آپ کو یاد کیا'' اس پر محفل زعفران زار بن گئی۔ جنرل ضیاء الحق دلدار پرویز بھٹی اور غلام فرید صابری' تینوں کو اللہ نے باری باری یاد کیا اور آج

تینوں ہم میں نہیں ہیں!

میں نے اپنے کالم میں جن کامیڈینز کا ذکر کیا ہے' میرے نزدیک یہ سب کے سب بین الاقوامی معیار کے فنکار ہیں مگر انہیں اچھی زندگی گزارنے کے لئے بہت بری زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ یہ مشین کی طرح دن رات کام کرتے ہیں اور پھر ایک دن عارضہ قلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا کسی نشے کی زد میں آ کر مداحوں سے اپنا ناطہ توڑ بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ پھکڑ پن اور فحش گوئی کے ذریعے اپنے مرتبے کو کم کرتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کے اہم لوگوں کی طرح ہمارے آنسوؤں کو مسکراہٹوں میں بدلنے والے کامیڈینز بھی ہماری قومی امانت ہیں۔ حکومت اور معاشرے کو اور خود ان کو بھی اس امانت کی حفاظت کرنا چاہیے!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (4)

اللہ لوک

ہم یورپین لوگ موت سے زیادہ خوف زدہ رہتے ہیں جب کہ پاکستانی قوم کے دل کے کسی گوشے میں مجھے موت کا خوف نظر نہیں آیا۔ یہ بہادر لوگ ہر محاذ پر اپنی جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خصوصاً تیز رفتار ٹریفک والی سڑک پر جس اطمینان قلب کے ساتھ یہ لوگ سڑک پار کرتے ہیں' اسے دیکھ کر کار کی چیخیں نکل جاتی ہیں' مگر ان کے چہرے پر جو سکون نظر آتا ہے' وہ اپنے ہاں صرف کسی بڑے ''سینٹ'' ہی کے چہرے پر دکھائی دے سکتا ہے۔ سینٹ کو یہاں ''اللہ لوک'' کہتے ہیں۔

باکمال معاشرہ

ہمارے ہاں مصروف سڑکوں کی وجہ سے اور کچھ بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کی بنا پر ڈرائیونگ کے دوران لوگ ایک دوسرے سے ہیلو ہیلو بھی نہیں کر پاتے جب کہ یہاں حکومت نے میل ملاپ اور محبت کو فروغ دینے کی غرض سے کار ڈرائیوروں کے لئے ڈیٹنگ پوائنٹ بنائے ہوئے ہیں جن کے لئے چوراہوں کا انتخاب کیا گیا ہے' میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ آمنے سامنے سے دو گاڑیاں آ رہی ہیں' دونوں کے ڈرائیور ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور پھر اپنی اپنی گاڑیاں وہیں چوراہوں میں روک کر باہر نکلتے ہیں اور ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور بھولی بسری یادیں دہرانے لگتے ہیں۔ اس دوران اگرچہ ٹریفک جام بھی ہو جاتا ہے اور بعض مادہ پرست قسم کے لوگ ہارن بجا کر اپنی بے صبری اور بے مروتی کا اظہار بھی کرتے ہیں مگر ان دوستوں کی گفتگو میں خلل نہیں پڑتا۔ بڑا کمال کا معاشرہ ہے۔

باہمی تعاون

میں نے لاہور میں قیام کے دوران ایک اور چیز نوٹ کی' وہ مقامی لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی فضا تھی' جو بدقسمتی سے ہم یورپ والوں میں مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کہ ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے سے سرپٹ دوڑے ہوئے ریڑھے' تانگے' کاریں' ویگنیں' ٹرک' موٹر سائیکل' سائیکل اور پیدل سوار ایک دوسرے میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ ابھی کوئی گاڑی کسی گاڑی سے ٹکرا جائے گی مگر اس سے پہلے ہی ان میں سے کوئی ایک اپنی گاڑی کو دائیں یا بائیں

(دیکھے بغیر) موڑ دیتا ہے اور اس جانب کی کوئی گاڑی بھی فوری تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ آپ پیدا کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ صورت ایک دن بھی پیدا ہو جائے تو اعصابی طور پر کمزور ہماری قوم کے افراد اگلے دن دماغی ہسپتال پہنچ جائیں۔ ممکن ہے یہ لوگ بھی دماغی ہسپتال سے ہو کر آئے ہوں اور ڈاکٹروں نے انہیں تندرست قرار دے دیا ہو۔

سکوٹر میں ٹرک کا ہارن

ہمارے ہاں اگر کوئی ٹریفک کی خلاف ورزی کرے تو لوگ اپنے غصے کا اظہار ہارن بجا کر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہارن کی آواز کبھی کبھار سنائی دیتی ہے جب کہ لاہور میں قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ لوگ شوقیہ ہارن بجاتے ہیں اور بجائے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہارن کی مختلف ورائیٹیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ میوزیکل ہیں۔ کچھ سادے ہیں اور زیادہ تر پریشر ہارن ہیں جو عموماً بسوں اور ٹرکوں میں فٹ ہوتے ہیں۔ یہ جب آپ کے قریب پہنچ کر اچانک ہارن بجاتے ہیں تو لگتا ہے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ صرف کانوں میں کھجلی سی ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ یہ کھجلی دور کرنے کے لئے کانوں میں جب کاٹن بڈ یا ماچس کی تیلی پھیری جاتی ہے تو بہت مزا آتا ہے۔ میرے ایک سیاسی دوست نے بہت عجیب بات کہی' اس نے کہا کہ ہمارے ہاں بعض چھوٹی جماعتوں کے لیڈر ایسے ہیں جن کے بلند بانگ دعوے سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سکوٹر میں ٹرک کا ہارن فٹ کیا گیا ہو۔ میں اس کی بات سمجھ گیا سیاست میرا مسئلہ نہیں!

محبت کرنے والی قوم

پاکستانی بہت محبت والے لوگ ہیں۔ یہ مختلف تہواروں پر ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں جس سے فطری طور پر باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے' اس ضمن میں چھوٹے بڑے میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا چنانچہ اکثر ماتحت گاہے گاہے اپنے افسروں کے لئے تحفے لے کر جاتے ہیں۔ ان میں کار کی چابی اور بقر عید پر بکروں کے تحفے بھی شامل ہیں۔ تحفے دینا پاکستانیوں کے کلچر میں شامل ہیں حتیٰ کہ راہ چلتے ہوئے کوئی ٹریفک کا اہلکار انہیں روکتا ہے تو اسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھما دیتے ہیں۔

مامتا!

آج میں کیمپ جیل کے سامنے سے گزرا تو مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا!

ہمارے وزیر آباد کے گھر میں ایک چڑیا نے روشن دان میں گھونسلا بنایا تھا۔ میں نے اسے یہ گھونسلا بناتے خود دیکھا تھا' وہ اپنی چو

نیچ میں پتہ نہیں کہاں سے ایک تنکا لے کر آتی اور وہاں رکھ دیتی' پھر یہ تنکے جمع ہوتے گئے اور ان تنکوں نے ایک گھونسلے کی شکل اختیار کر لی۔

ایک دن میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھے ایک نامانوس سی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کا پیچھا کیا تو یہ اس گھونسلے میں سے آ رہی تھی۔ ہمارے گھر میں ایک سیڑھی ہوتی تھی دوپہر کا وقت تھا' سب سو رہے تھے میں نے اپنے دوست سمیع کو بلایا۔ ہم دونوں نے مل کر سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی' سمیع نے سیڑھی کو سہارا دیا اور میں زینہ زینہ طے کر کے گھونسلے تک پہنچ گیا۔ اور یہ دیکھ کر خوشی سے میری چیخ نکل گئی کہ گھونسلے میں ایک ننھا منا سا ''بوٹ'' (چڑیا کا بچہ) سکڑا ہوا بیٹھا چوں چوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ میں نے اسے نرمی سے ایک ہاتھ میں پکڑا اور احتیاط سے سیڑھی کے زینوں پر پاؤں دھرتا نیچے اتر آیا جہاں سمیع بے تابی سے میرا منتظر تھا۔ سمیع نے میرے ہاتھ میں پیارا سا ''بوٹ'' دیکھا تو خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ہم نے اسے بہت پیار سے فرش پر رکھا اور اس تقریباً نوزائدہ بچے کی حرکات وسکنات سے محظوظ ہوتے رہے۔ ہم سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے اپنی اس کامیابی اور اس نوکھے تجربے پر اظہار مسرت کر رہے تھے۔ اتنے میں چڑیا باہر سے روشن دان میں داخل ہوئی اور گھونسلے میں اپنے بچے کو نہ پا کر دیوانہ وار کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگانے لگی۔ اس دوران اس کی نظر اپنے بچے پر پڑ گئی جو ہمارے پاؤں کے قریب فرش پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ بچے کو دیکھتے ہی چڑیا کی بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سخت اضطراب کے عالم میں میرے اور سمیع کے گرد چکر لگانے لگ گئی۔ اب وہ صرف چکر ہی نہیں کاٹ رہی تھی بلکہ اس نے چوں چوں کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا' اس کی آواز جو کبھی چہکار ہوتی تھی' اب چیخ میں بدل گئی تھی اس چیخ میں مامتا کی فریاد بھی تھی۔ احتجاج بھی تھا اور بے بسی کا اظہار بھی تھا۔ میرا دل ماں کی اس پکار سے پگھلنا شروع ہو گیا تھا اور میں خود کو مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہی کیفیت سمیع کی بھی تھی۔ اس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا اور ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ چڑیا کی چیخ و پکار سے امی کی آنکھ کھل گئی' انہوں نے کمرے میں قدم رکھا تو چڑیا نے فریاد کرتے ہوئے امی کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیئے جیسے ایک ماں ایک دوسری ماں سے اپنے بچے کی رہائی کی درخواست کر رہی ہو۔ بیشتر اس کے امی ہمیں کچھ کہتیں میں چپکے سے سیڑھیوں کے زینے طے کرتا ہوا گھونسلے تک پہنچا اور بوٹ واپس اس جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یوں لگا جیسے چڑیا کی بے قرار روح کو قرار آ گیا ہو جیسے مامتا کی بے چینی چین اور سکون میں بدل گئی ہو۔ مجھے اور سمیع کو یوں لگا جیسے اس ماں نے ہمیں جتنی بددعائیں دی تھیں وہ سب واپس لے لی ہیں اور اس نے نہ صرف یہ کہ ہمارا قصور معاف کر دیا ہے بلکہ اس کے لبوں پر ہمارے لئے دعا ہے کہ خدا تمہیں اور کسی کو بھی اپنی ماں کی مامتا سے محروم نہ رکھے۔

آج اس واقعہ کو چالیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ میرا گزر جب کبھی کسی جیل کے سامنے سے ہوتا ہے مجھے وہ چڑیا اور اس کا بوٹ یاد آجاتا ہے' میں سوچتا ہوں اس بلند و بالا چار دیواری کے پیچھے خدا جانے کتنے بے گناہ قید ہیں۔ جن کا یا تو سرے سے کوئی قصور نہیں ہے یا ابھی تک انہیں ان کا قصور ہی نہیں بتایا گیا اور یا کئی برسوں سے وہ ''ملزم'' کی حیثیت سے جیل کاٹ رہے ہیں اور عدالتوں کے پاس انہیں بے گناہ یا گناہ گار قرار دینے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ مجھے ان جیلوں میں بے گناہ کی کھولیوں کے گردان کی ماؤں کی بے چین روحیں چکر کاٹتی نظر آتی ہیں۔ جو اپنی چہکار بھول چکی ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ایک چیخ ہے۔ اس چیخ میں غصہ بھی ہے۔ فریاد بھی ہے اور بے بسی کا اظہار بھی ہے۔

ہم سب کو ماتا کی دعاؤں کی تمنا کرنا چاہیے اور ان کی بددعا سے ڈرنا چاہیے۔ جو ''بوٹ'' کی طرح معصوم ہوں!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (5)

میں نے چینیوں کے ''سب ہضم'' بارے میں سنا تھا کہ وہ فضا میں اڑنے والی ہر چیز سوائے ہوائی جہاز کے' پانی میں تیرنے والی ہر چیز سوائے بحری جہاز کے اور زمین پر رینگنے والی ہر چیز سوائے انسان کے کھا جاتے ہیں۔ جس طرح مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی اسی طرح پاکستانیوں کی خوراک کے بارے میں جان کر بھی حیران ہوا۔ جو گوشت اور اس سے جڑی ہوئی ہر چیز بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ میں نے لکشمی چوک میں کئی دکانیں دیکھیں' جہاں کئی لوگ جانوروں کے ''اعضائے رئیسہ'' کھلم کھلا کھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں گائے کی زبان' جس سے ہر وقت رال ٹپکتی رہتی ہے' یہاں بہت شوق سے کھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گائے کا تالو' جسے مقامی زبان میں ''کھد'' کہا جاتا ہے لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ بلکہ ایک دوست نے بتایا کہ کئی لوگ ''اوجڑی'' بھی کھاتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر جب اس نے اوجڑی کے بارے میں بتایا کہ یہ گائے کے کس حصے کو کہتے ہیں اور اس نے مجھے پکی ہوئی دکھائی بھی' تو میں نے گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے بعد میں نے پاکستانی خوراک کی تفصیل نہیں پوچھی۔ یہ لوگ سب کچھ کھا سکتے ہیں حتیٰ کہ دماغ بھی کھاتے ہیں۔

پسندیدہ سبزی

دراصل پاکستانی گوشت کے بہت شوقین ہیں' پاکستان بنانے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی' میں نے ایک دوست سے پوچھا ''تمہیں سبزیوں میں سے کون سی سبزی سب سے زیادہ پسند ہے'' بولا ''سبزیوں میں سے میری پسندیدہ سبزی گوشت ہے۔''

حلال گوشت

ہمارے ہاں یہودی کوئی جانور ذبح کرنے سے پہلے مقدس کلمات ادا کرتے ہیں جو جانور اس کے بغیر کیا جائے وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان بھی اس سلسلے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ میرا مقامی دوست مرغی کا گوشت خریدنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ دکاندار کے پاس پہلے سے ذبح شدہ گوشت موجود تھا مگر میرے دوست نے وہ نہیں خریدا' اسے شبہ تھا کہ خدا جانے اسے ذبح کرتے وقت مقدس کلمات پڑھے گئے تھے کہ نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے سامنے مرغی ذبح کرنے کے لیے کہا۔ دکاندار نے

مرغی ذبح کرنا شروع کی تو میرا دوست' مرغی خریدے بغیر وہاں سے چل دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا" یہ حرام خور مرغی ذبح کرتے وقت مقدس کلمات پڑھنے کی بجائے اپنے ساتھی کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا" بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اکثر ایسے ہی ہوتا ہے۔

حلال حرام

صرف پاکستان میں رہنے والے پاکستانی ہی نہیں بلکہ یورپ میں جو پاکستانی آباد ہیں وہ بھی گوشت کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں اب جگہ جگہ حلال گوشت کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ میں نے بیک ہوم میں اپنے ایک پاکستانی بزنس پارٹنر کو ایک دفعہ اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا' جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو میں نے اسے بتایا کہ جو گوشت تمہارے سامنے ہے وہ میں نے ایک حلال گوشت کی دکان سے خریدا تھا مگر اس کے باوجود اس نے خرابی معدہ کا بہانہ بنا کر گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بلکہ سلاد کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ میرے اس پاکستانی دوست پر ایک مقامی عدالت میں دس پونڈ کے فراڈ کا مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے پہلے بتایا نا کہ پاکستانی مسلمان زیادہ تر گوشت کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں حساس واقع ہوئے ہیں۔

پرہیزگار پاکستانی مسلمان

میں اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز اور سب سے بڑا گناہ وہ گوشت کھانا ہے جس پر مقدس کلمات نہ پڑھے گئے ہوں' اس کا اندازہ ابھی بیان کردہ واقعہ کے علاوہ مجھے اس وقت بھی ہوا جب بیک ہوم میں میرا ایک پاکستانی دوست' جس کے ساتھ میری بہت بے تکلفی ہے شام کو میرے گھر آیا' وہ شراب میں دھت تھا اور میری ایک ہم وطن لڑکی اس کی بغل میں تھی۔ آتے ہی کہنے لگا" مجھے سخت بھوک لگی ہے' کھانے کے لئے کچھ ہے تو نکالو" میں نے فریج میں سے بکرے کے گوشت کی ایک ڈش نکالی اور اسے اوون میں گرم کرنے لگا تو اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔" یہ رہنے دو میں ڈبل روٹی پنیر کھالوں گا۔" مجھے یقین ہے یہ پرہیزگار پاکستانی مسلم بھی صرف مشکوک گوشت سے بچنا چاہتا تھا۔

◆◆◆

ماورائے عدالت ''پھینٹی''

بہت پرانا لطیفہ ہے' جب پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک افغان مہاجر نے اپنا تعارف افغانستان کے ریلوے کے وزیر کے طور پر کرایا۔ مخاطب نے حیران ہو کر کہا۔ ''وہ کیسے' افغانستان میں تو ریلوے ہے ہی نہیں'' اس پر افغان مہاجر نے جواب دیا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے' آخر پاکستان میں وزیر قانون بھی تو ہوتا ہے۔''

یہ لطیفہ مجھے آج پی ٹی وی پر پنجاب کے وزیر قانون ڈاکٹر خالد رانجھا کو دیکھ کر یاد آیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ان دنوں وجہ شہرت تقریبات میں آنے کا وعدہ کر کے اور کارڈ میں نام چھپوا کر تقریب میں شرکت نہ کرنے کی ہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لالہ موسیٰ میں کالج کے پرنسپل سید شعیب شاہ نے جاوید چودھری کی کتاب کی رونمائی کا اہتمام کیا تو موصوف حسب معمول وعدہ کے باوجود وہاں تشریف نہ لائے۔ جس پر جاوید چودھری نے اپنی تقریر میں کہا کہ رانجھوں کا یہ پرانا وتیرہ ہے اگر رانجھا موقع پر پہنچ جاتا تو ہیر کبھی کھیڑوں کے ساتھ نہ جاتی۔

خیر یہ دل کی بات تو یونہی درمیان آ گئی' جو بات مجھے آپ کو بتانا تھی' وہ یہ تھی کہ نعیم بخاری کے قد کاٹھ کا وکیل' کمپیئر' پرکشش شخصیت کا حامل یار باش اور انسان دوست شخص متذکرہ ٹی وی پروگرام میں ڈاکٹر خالد رانجھا کے ساتھ محو کلام تھا اور ان دونوں برگزیدہ وکلاء کے چہروں پر اس حوالے سے اطمینان کی گہری چھائیاں نظر آ رہی تھیں کہ گزشتہ تین چار ماہ سے ماورائے عدالت قتل ہونا بند ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس اطمینان نے نعیم بخاری کے علاوہ خالد رانجھا کے چہرے پر بھی نور کا ایک ہالا سا بنا دیا تھا۔ ماورائے عدالت قتل قاتلوں' ڈاکوں کے دوران شریف اور گھریلو عورتوں کی عصمت دری کرنے والوں' اور شرفاء کی زندگیاں اجیرن بنانے والوں کے خلاف پولیس آپریشن کو کہا جاتا ہے۔ پولیس کبھی جعلی مقابلوں اور کبھی اصلی مقابلوں میں بدنام زمانہ جرائم پیشہ افراد کو مار دیتی ہے اور شرفاء اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ قانون کی خلاف ورزی ہے اور اس سے پولیس جیسے بدنام ادارے کو بے گناہوں کو مارنے کا لائسنس بھی مل سکتا ہے' ان جرائم پیشہ افراد کے قتل پر جشن مناتے ہیں۔ چنانچہ بطور وکیل ان دونوں وکلاء کا اس امر پر اظہار اطمینان کہ ماورائے عدالت کا سلسلہ ختم ہو گیا' سمجھ میں آتا تھا' گو حقیقی صورت حال یہ نہیں ہے' جاوید اقبال کیس میں اس نوع کے قتل ابھی زیادہ دور کی بات نہیں!

لیکن جو سوال میں ان فاضل وکلاء سے پوچھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ماورائے عدالت قتل کے علاوہ ایک چیز ماورائے عدالت ''پھینٹی'' بھی ہے جس میں گزشتہ تین چار ماہ کے دوران کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ دونوں فاضل وکلاء بھیس بدل کر کسی دن شہر کے کسی بھی تھانے میں تشریف لے جائیں' انہوں نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوں اور چہرے سے غربت ٹپکتی ہو اور یہ سائیکل چوری کی رپورٹ لکھانے کے لیے محرر سے درخواست کریں اور اس کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کریں' اگر اس کوشش کے آغاز ہی میں انہیں دو چار موٹی گالیاں اور پانچ چھ ٹھڈے نہ پڑیں تو اگلے دن ٹی وی پر آ کر جو چاہے بیان دیں میں اس پر اعتراض نہیں کروں گا۔

اور اگر خدانخواستہ کوئی بے آسرا اور بے نوا بھی ہے اور پر سائیکل چوری کا مقدمہ بھی بن جاتا ہے تو تیل میں بھگویا ہوا تیرہ نمبر لتر باہر نکلے گا اور یہ لتر اس وقت واپس اندر جائے گا جب تک یہ بے گناہ شہری دو چار ڈاکوں کا اقرار نہیں کر لیتا۔ اس اقرار کے لئے اس کو پنکھے کے ساتھ باندھ کر پنکھا چلایا بھی جا سکتا ہے۔

شلوار کے پائنچوں میں چھچھوندر بھی چھوڑی جا سکتی ہے۔ کسی نازک مقام پر شہد لگا کر وہاں کیڑے بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔ یہ ماورائے عدالت تشدد تھانوں میں روزانہ ہوتا ہے 90 فیصد صورتوں میں بے گناہوں کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ ماورائے عدالت قتل کی زد میں اپنی تمام تر قانونی بدشکلی کے باوجود 99 فیصد جرائم پیشہ افراد ہی آتے ہیں۔

گزشتہ تین چار ماہ میں ماورائے عدالت ''پھینٹی'' کی ایک اور قسم متعارف ہوئی ہے اور آج کل یہ بہت ''مقبول'' ہے۔ اور یہ قسم عوام کے منتخب نمائندوں کو پھینٹی لگانے کے حوالے سے ہے چنانچہ ان دنوں عوام کے منتخب نمائندوں کو ماورائے پھینٹی لگائی جا رہی ہے اس کی اتنی زیادہ تعداد میں مثالیں شاید ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں بھی نہ مل سکیں' ابھی تک جن عوامی نمائندوں اور اہم شخصیتوں کو اس اعزاز سے نوازا گیا ہے ان میں صدیق الفاروق' سینیٹر پرویز رشید' حاجی منان ایم بی اے' شیخ اعجاز ایم پی اے' حاجی امداد ایم پی اے' رانا ثناء اللہ ایم پی اے اور کئی دوسرے سیاستدان شامل ہیں۔ جن کا کوئی قصور ہی نہیں بتایا گیا۔ صدیق الفاروق کو تو پانچ دن مسلسل بھوکا پیاسا کھڑا رکھا گیا اور پھر تیس کوڑے مارے گئے۔ جرائم پیشہ لوگوں کے ماورائے عدالت قتل پر احتجاج کرنے والوں کو اس ماورائے عدالت پھینٹی ماورائے عدالت نامعلوم مقام پر منتقلی' اور ''ماورائے عدالت عدالتوں'' کے بارے بھی اظہار خیال یا کم از کم اظہار اطمینان ضرور کرنا چاہیے۔ میں اس کی امید کم از کم نعیم بخاری سے ضرور رکھتا ہوں کہ ماورائے عدالت اور ماورائے آئین جو کچھ بھی ہے وہ اس پر آواز ضرور بلند کریں گے۔

◆◆◆

اوپر والا' نیچے والا!

ان دنوں میں بھی جنرل پرویز مشرف کی طرح اردو اخبارات کی صرف موٹی موٹی سرخیاں پڑھتا ہوں' شاید اس لئے کہ میں دوسرا مصروف ترین شخص ہوں' پہلا پتہ نہیں کون ہے؟ اخبار کی موٹی سرخی یہ تھی "حکومتی کارکردگی اچھی نہیں" قصور اوپر والوں کا ہے جنہیں ٹھیک کردوں گا۔ "پرویز مشرف" مجھے یہ سرخی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ جنرل صاحب کے اوپر بلحاظ منصب صدر رفیق تارڑ ہیں اور یا پھر خدا کی ذات ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جنرل صاحب کا بیان شائع ہوا تھا کہ "میں کہتا کچھ اور ہوں اور نیچے والے کچھ اور کر دیتے ہیں" البتہ ان کا یہ بیان کچھ کچھ سمجھ میں آیا تھا کیونکہ نیچے ان کی کابینہ ہے اور بیوروکریسی ہے۔ اور یا پھر عوام ہیں جو سب کے نیچے لگے ہوئے ہیں۔

تفنن برطرف' میں جنرل صاحب کی الجھن سمجھتا ہوں' جو شخص اقتدار سنبھالتا ہے' ان میں سے کون ہوگا جس کی یہ خواہش نہ ہو کہ معاملات ٹھیک ہو جائیں' ملک میں امن و امان ہو' غربت کا خاتمہ ہو' لوگوں کو انصاف ملے' چنانچہ جنرل صاحب کے دل میں بھی یہ خواہش موجود ہے کہ اور وہ اپنے طور پر اصلاح احوال کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر بات نہیں بن رہی' اس طرح میرے خیال میں ہر وہ شخص جو اقتدار سے باہر ہے۔ اسے اس امر کا سو فیصد یقین ہے کہ اگر اقتدار اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ تین مہینوں کے اندر معاشرے اور حکومت کی تمام برائیاں ختم کر سکتا ہے' اس بات کا صرف محروم اقتدار جماعت کے رہنماؤں ہی کو نہیں' میرے محلے میں جو پان سگریٹ کا کھوکھا ہے' اس کے مالک جناب بلا راکٹ صاحب کو بھی یقین ہے کہ وہ حکومت چلا سکتے ہیں چنانچہ موصوف مجھے کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ آپ جنرل پرویز مشرف سے سفارش کر کے حکومت صرف ایک دن کے لئے میرے سپرد کریں' میں دیکھوں گا اس کے بعد کون مائی کا لال چوں بھی کرتا ہے۔ بلا راکٹ تو شاید حکومت چلا لے کیونکہ جب اس نے کسی کو چوں نہیں کرنے دینی تو چونکہ' چنانچہ کی نوبت ہی نہیں آئے گی' راکٹ کے آگے کون چونکہ' چنانچہ کر سکتا ہے؟ مگر مسئلہ یہ ہے کہ حکومت میں آنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ جنرل صاحب حکومت سنبھال چکے ہیں' یہ مشکل کام اپنے ذمے لینے سے پہلے انہیں یقین ہوگا کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر دیں گے لیکن چار ماہ گذر چکے ہیں' کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ بلکہ معاملات مزید الجھتے جا رہے ہیں۔

میں باقی معاملات یہاں زیر بحث نہیں لاؤں گا' صرف ایک مسئلے کا ذکر کرتا ہوں' جنرل صاحب بار بار غریب عوام کا ذکر کرتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ غربت کا خاتمہ ان کی اولین ترجیحات میں سے ہے لیکن غریب عوام کو ان بیانات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ کیونکہ مہنگائی کم نہیں ہوئی۔ تھانوں' کچہریوں' جیلوں' دفتروں اور کارخانوں میں عوام کی رسوائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی' اس پر میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہے کہ کہیں ''قصور اوپر والوں کا ہے'' سے ان کی مراد آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک وغیرہ تو نہیں کیونکہ امپورٹڈ وزیران اداروں کی تمام شرائط پوری سعادت مندی سے پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں مہنگائی کا عفریت اپنے پنجے غریب عوام کی گردنوں میں گاڑتا چلا جا رہا ہے۔ غریبوں کے لئے طیارہ کیس والی حکومت نے میرا گھر سکیم شروع کی تھی جس کے لئے مفت زمین حکومت نے فراہم کی تھی اور لاکھوں گھر بے گھر عوام کے لئے تیار کئے جا رہے تھے جن کی صرف لاگت عوام سے وصول کی جاتی' اس سے مختلف کاروبار جو بند پڑے تھے' ان میں بھی حرکت پیدا ہوتی' مگر ''اوپر والوں'' نے اس سکیم میں کتر بیونت کر دی ہے' چنانچہ بیشتر زمین جو گزشتہ حکومت نے ان مکانوں کے لئے مفت الاٹ کی تھی' متعلقہ اداروں کو واپس کی جا رہی ہے' اسی طرح اس اسکیم کے تحت جو تھوڑے بہت گھر بنیں وہ عوام کو لاگت پر نہیں' بلکہ مارکیٹ ریٹ پر فروخت کئے جائیں گے۔ جنرل صاحب صحیح کہتے ہیں' وہ کہتے کچھ اور ہیں اور کبھی اوپر والے اور کبھی نیچے والے کرتے کچھ اور ہیں۔ اس سلسلے میں بیچارے عوام کو کچھ مشورہ ہی دیا جائے کہ وہ اس صورت حال میں کیا کریں؟

میرے خیال میں انہیں ''اوپر والے'' سے شکایت کرنا چاہیے جو وہ صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کی شکایات کی فائل ہر دفعہ کوئی ''نیچے والا'' دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (6)

قیام پاکستان کے دوران مجھے ایک بکرا عید جسے پاکستانی بڑی عید کہتے ہیں لاہور میں گذارنے کا اتفاق ہوا' یہ میری زندگی کا ایک بہت دلچسپ تجربہ تھا۔ مسلمان عید پر بکرے کی قربانی دیتے ہیں میں نے مقامی علماء سے اس کا مقصد پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ بکرے کی قربانی ایک علامتی چیز ہے' اس کا اصل مقصد مسلمان قوم کو ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار کرنا ہے جس میں جان و مال اور نفس کی قربانی بھی شامل ہے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی۔ دنیا میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ یقیناً یہ سب بکرے کی قربانی کے علاوہ جان و مال اور نفس کی قربانی بھی دیتے ہوں گے۔ میرے علم میں تو نہیں' لیکن اس سے لگتا ہے کہ امریکہ کی بجائے مسلمان قوم اس وقت تک دنیا کی سپر پاور بن چکی ہوگی۔

مذہبی رسم؟

میں نے عید کے تین دن اپنے ایک مقامی دوست کے ساتھ مختلف مقامات پر گزارے۔ میں ایک سیاست دان کے گھر بھی گیا جو الیکشن میں ہار گیا تھا وہ اس وقت قربانی کی رسم ادا کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا' اس نے چھری تیز کر کے قصاب کے ہاتھ میں پکڑائی اور اس کے ساتھ مل کر بکرے کو زمین پر لٹا دیا' جب قصاب بکرے کی گردن میں چھری پھیرنے لگا تو اس سیاست دان نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے دوست سے پوچھا کہ قصاب کے ہاتھ میں چھری پکڑانا' اس کے ساتھ مل کر زمین پر گرانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بکرے کی گردن پر چھری پھیرتے وقت منہ دوسری طرف پھیر لینا' کیا یہ کوئی مذہبی رسم ہے؟ دوست نے کہا یہ مذہبی نہیں' سیاسی رسم ہے..... میں نے اس کی تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سیاست میرا موضوع نہیں ہے۔

سپیشلائزیشن؟

میں جس دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا' وہاں ایک روز پہلے ایک پلمبر اس کے باتھ روم کا نلکا ٹھیک کرنے آیا تھا عید والے دن دستک پر میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ میں چھری پکڑی ہوئی تھی' میں سمجھا میرے دوست کے ساتھ اس کے پیسوں کے سلسلے میں جھگڑا ہو گیا ہے مگر دوست نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں آج یہ بکرا ذبح کرنے

آیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ عید کے روز موچی اور ترکھان بھی قصائی بن جاتے ہیں اس کے علاوہ سبزی فروش، پھل بیچنے والے اور عام دکان دار وغیرہ سب اپنی چھریاں تیز کرتے ہیں اور ذبح کرنے کے علاوہ پوری مہارت کے ساتھ کھال بھی اتارتے ہیں یقیناً یہ ہر فن مولا لوگ ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو سپیشلائزیشن اتنی بڑھ چکی ہے کہ دائیں اور بائیں نتھنے کے علیحدہ علیحدہ اسپیشلسٹ ہیں۔

بڑی عید کا دورانیہ

بڑی عید کے متعلق پتہ چلا کہ یہ اگلی چھوٹی عید تک چلتی ہے، بڑی عید کی ان خوشیوں کا دورانیہ بڑھانے کے لئے فریز راستعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کی فروخت بقرعید کے قریب بہت بڑھ جاتی ہے۔

عجیب رسم

یہاں عید کے روز گلے ملنے کا بہت رواج ہے، مگر عجیب بات ہے کہ مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ گلے ملتی ہیں۔

آسان مذہب

عید کی نماز کے دوران سیدھی قطار بنانے پر بہت زور دیا جاتا ہے امام صاحب اس وقت تک نماز شروع نہیں کرتے جب تک صفیں سیدھی نہ ہو جائیں ہم لوگوں کو تو بس سٹاپ پر سینما میں، بنک میں، غرض کہ ہر جگہ پر قطار بنانا پڑتی ہے۔ اسلام واقعی آسان مذہب ہے اس میں صرف نماز کے دوران صفیں سیدھی رکھنا پڑتی ہیں۔

سلام اور سلامی

عید کے ایک روز قبل میں ایک بیوروکریٹ کا مہمان تھا۔ میری موجودگی میں بہت سے لوگ اس بیوروکریٹ سے ملاقات کے لئے آئے ان میں سے ہر ایک نے بکرے کی رسی تھامی ہوئی تھی اور بکرے کے پیٹ پر مہندی سے ''عید مبارک'' لکھا نظر آتا تھا۔ میں سمجھا شاید بکرے کو سلام کرنے کے لئے لائے ہیں کیونکہ بیوروکریٹ سے اس درجہ ادب و احترام سے ملتے تھے جس طرح پاکستانی بزرگوں سے ملتے ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ بکرے اسلام کے لئے نہیں، سلامی کے لئے لائے گئے تھے۔ یہ سب مقامی رسمیں ہیں، مجھے نہ تو سلام کی سمجھ آتی ہے اور نہ سلامی کی، یقیناً یہ اچھی چیزیں ہوں گی۔!

تیسرا حصہ

مجھے ایک عالم دین نے بتایا تھا کہ اسلام میں قربانی کے گوشت کے تین حصہ کئے جاتے ہیں ایک حصہ اپنے لئے' دوسرا عزیز و اقارب کے لئے اور تیسرا غربا و مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے' یہ اوجڑی (جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں) آنتوں اور چھچھڑوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے' میرے خیال میں اس سے غریبوں کا حق تو شاید ادا ہو جاتا ہو' لیکن میرے نزدیک اس سے سراسر بلیوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (7)

کالوں کے خلاف تعصب

ہمارے ہاں کی طرح پاکستان میں بھی کالوں کے خلاف خاصا تعصب پایا جاتا ہے اور لوگ اس کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لوگوں کے غصے کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان پر کوئی مصیبت آن پڑے تو وہ اس کا غصہ کالے بکرے پر اتارتے ہیں۔ چنانچہ اسے ذبح کر کے اس کا گوشت چیلوں اور کووؤں وغیرہ کو ڈال دیتے ہیں' اسے یہاں صدقہ دینا کہا جاتا ہے' گلیوں بازاروں اور کئی پر ہجوم چوکوں میں اکثر کسی کالے بکرے کی سری پڑی ہوتی ہے اور لوگ اس سے دو قدم پرے ہو کر چلتے ہیں' سنا ہے ان پر ٹونا وغیرہ کیا گیا ہوتا ہے' اسی طرح اگر کوئی کالی بلی کسی کار استہ کاٹ جائے تو وہ شخص اس روز اپنا سفر ملتوی کر دیتا ہے۔ میں نے ایک زیرو میٹر بی ایم ڈبلیو کار دیکھی جس کے بمپر کے ساتھ پھٹی پرانی کالے رنگ کے کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس خوبصورت کار کے ساتھ یہ بدصورت چیز کار کو نظر لگنے سے بچانے کے لئے باندھی گئی ہے۔ کئی مائیں اپنے بچوں کے ماتھے پر سرمے سے ایک کالا نقطہ سا ڈال دیتے ہیں' سنا ہے یہ بھی نظر لگنے سے بچانے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر کئی دفعہ بچے کے اپنے رنگ کی وجہ سے یہ سیاہ نقطہ نظر نہیں آتا۔ کالے رنگ کے حوالے سے ناپسندیدگی کا دائرہ اس حد تک وسیع ہے کہ لاہور کے ایک نواحی شہر میں قائم ایک انڈسٹری کی وجہ سے اردگرد کے علاقوں میں کیمیکل کی بو پھیلی ہوتی ہے۔ جس کا لوگوں کو بہت غصہ ہے۔ چنانچہ غصے کے اظہار کے طور پر اس شہر کا نام ''کالا شاہ کاکو'' رکھ دیا گیا ہے۔ ''کالا شاہ'' کا مطلب ہوتا ہے ''بہت ہی کالا'' اور ''کاکو'' اس سیاہی میں مزید اضافے کے لئے لگایا گیا ہے۔ کالوں کے خلاف نفرت کا الزام ہم گوروں پر لگایا جاتا ہے جو صحیح ہے۔ لیکن پاکستان آ کر اندازہ ہوا کہ ہم تو پاکستانیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہاں تو اگر کوئی سید کالا نظر آئے تو اسے سید ماننے سے ہی انکار کر دیا جاتا ہے' حالانکہ عام حالات میں سیدوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سید کا لفظ ''جناب'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور پاکستان ہندوستان میں پرافٹ محمد کی اولاد کو سید کہا جاتا ہے!

زیادتی کی بات

پاکستانیوں نے کالوں کے خلاف ناپسندیدگی کے اظہار کے بہت سے طریقے ایجاد کئے ہیں مثلاً ان کا مذاق اڑانے کے لئے انہیں ''بٹ صاحب'' کہنا شروع کر دیں گے (بٹ کشمیریوں کی ایک ذات ہے اور یہ لوگ بہت گورے ہوتے ہیں) یا کسی کالے کو اس کے اصل نام سے پکارنے کی بجائے اس کا نام ہی ''کالا'' رکھ دیں گے اور پھر اسے اس نام سے پکارنے لگیں گے۔ حالانکہ ہم لوگ نیگروز کو ان کی پیٹھ پیچھے نفرت سے ''نگیر'' کہتے ہیں' اگر ان کے سامنے کہیں تو کبھی نہ ختم ہونے نسلی فسادات شروع ہو جائیں جب کہ یہاں بیشتر صورتوں میں یہ نام قبول کر لیا جاتا ہے بلکہ اگر اس طرح کے شخص کو کبھی کوئی بھول چوک سے اس کے اصلی نام سے پکار بیٹھے تو اسے پوچھنا پڑتا ہے کہ ''بھائی صاحب آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟'' یہ بہت زیادتی کی بات ہے!

ہنسنے کے بہانے

لفظ ''زیادتی'' سے یاد آیا کہ پاکستانی اخبارات میں بوجہ مشرقی شرم وحیا ''زیادتی'' کا لفظ ''ریپ'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ اب عام گفتگوؤں کے دوان شرفا یہ لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں' اگر کوئی غلطی سے یہ لفظ استعمال کر بیٹھے تو لوگ اس پر ہنسنے لگتے ہیں اور پوچھتے ہیں کتنے لوگ تھے؟ شاید یہاں لوگ ہنسنے کے بہانے ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔

نظر لگنا

میں نے ابھی بتایا تھا کہ پاکستانی لوگ نظر سے بچنے کے لئے کالے رنگ کا استعمال کرتے ہیں' میں مقامی دوستوں کے بہت سمجھانے کے باوجود نظر لگنے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ خدا جانے یہ کیا چیز ہوتی ہے' تاہم مجھے اس ضمن میں کچھ ہلکا سا اندازہ ہوا ہے' چنانچہ مجھے شبہ ہے کہ شاید نظر سے بچنے ہی کے لئے ہماری گوریاں کالوں کو ساتھ لئے پھرتی ہیں۔

آنکھیں رونے کے لئے بھی ہوتی ہیں!

چند لمحہ قبل اسلام آباد سے اکیڈمی آف لیٹرز کے ڈائریکٹر جنرل خالد اقبال یاسر کا فون آیا کہ شفیق الرحمن کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے گذشتہ دو برسوں کے دوران اپنے بہت سے محبوب ادیبوں کے انتقال کی خبریں سنی ہیں لیکن شفیق الرحمن کے انتقال کی خبر سن کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرا محبوب ادیب فوت نہیں ہوا' بلکہ میرا محبوب مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔

میرا جن بزرگ ادیبوں سے ادب کے علاوہ نہایت گہری ذاتی محبت کا تعلق ہے ان میں سے احمد ندیم قاسمی' مشتاق احمد یوسفی' اشفاق احمد' بانو قدسیہ' سید ضمیر جعفری' کرنل محمد خاں اور محمد خالد اختر شامل ہیں۔ ان میں سے ابن انشاء' سید ضمیر جعفری' کرنل محمد خاں

اوراب شفیق الرحمن اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اوراب اردو مزاح نگار کی عمارت مشتاق احمد یوسفی اور محمد خالد اختر ایسے دو مضبوط ستونوں پر کھڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور دوسرے تمام سچے حرف لکھنے والے ادیبوں کو عمر خضر عطا فرمائے کہ ایک خوبصورت معاشرے کا خاکہ ان لوگوں کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔

میرے لئے شفیق الرحمن کے بارے میں کچھ لکھنا شاید میری تحریری زندگی کا سب سے مشکل کام ہے۔ شفیق الرحمن صاحب ان مزاح نگاروں میں سے تھے جو اس صنف کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نام سے ابتداء کرنا پڑتی ہے۔ میں نے پطرس بخاری' شفیق الرحمن اور مشتاق احمد یوسفی کو پڑھ کر قلم پکڑنا سیکھا اور اس کے بعد دوسرے مزاح نگاروں یعنی ابن انشاء' ضمیر جعفری' دلاور نگار اور محمد خالد اختر کی طرف متوجہ ہوا' مداح اپنے ممدوح پر محبت نچھاور کرتا ہے جیسے پروانہ شمع کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتا ہے اور اپنی والہانہ محبت کا ثبوت فراہم کرتا ہے مگر میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں اپنے ممدوح کے ساتھ کی جانے والی محبت کے جواب میں اتنی ڈھیروں محبت اور شفقت ملی کہ مجھ سے سمیٹنا مشکل ہو گئی۔ شفیق الرحمن صاحب کے ساتھ میرا تعلق شمع اور پروانہ والا تھا مگر جب میں ان کے طواف کو نکلتا تھا' وہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے تھے' میں جب کبھی اسلام آباد جاتا' ان سے فون پر گفتگو ہوتی یا میں انہیں ملنے چلا جاتا' شفیق الرحمن صاحب جو بہت کم آمیز تھے اور بہت کم لوگوں کے سامنے کھلتے تھے۔ میرے اور امجد اسلام امجد کے سامنے وہ بالکل کسی اور روپ میں ہوتے۔ لطیفوں کی محفل جمتی اور وہ سب لطیفے ایک دوسرے کو سنائے جاتے جو بزرگ نوجوانوں سے اور نوجوان بزرگوں سے سن لیں اور بہت بے تکلفی کا مظاہرہ بھی کریں تو منہ دوسری طرف پھیر کر ہنس لیتے ہیں۔

شفیق الرحمن ان معدودے چند ادیبوں میں سے تھے جو ساری عمر ریڈیو' ٹیلی ویژن اور اخبارات سے دور رہے' بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ شفیق الرحمن صاحب پبلسٹی سے الرجک تھے یا یوں کہہ لیں کہ بے حد شرمیلے تھے' اس حد تک کہ کسی تقریب کی صدارت تک نہیں کرتے تھے۔ یہ اعزاز میرے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہوا ہو تو میں پورے یقین سے اس کی تائید کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ان کا افسانوی کردار ''شیطان'' شیطان کی طرح ادب میں لازوال ہے مگر یہ شیطان انتہائی شستہ مزاح اور معاشرتی ناہمواریوں پر طنز کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے لازوال ٹھہرا ہے۔ ان کا برساتی' ان کا دجلہ' ان کا ڈینوب' ان کی ''تزک نادری'' ''حماقتیں'' مزید حماقتیں اردو ادب کی لافانی تحریریں ہیں مگر شفیق الرحمن سے ان کے عام ملاقاتی ان کی کم آمیزی اور ان کے شرمیلے پن کی وجہ سے سوچ میں پڑ جاتے ہوں گے کہ کیا ان سب تحریروں کا خالق یہی شخص ہے جو اس وقت ان کے سامنے بیٹھا ہے؟

شفیق صاحب کا بڑھاپا بھی بہت خوب صورت تھا' اور جوانی تو ایسی تھی کہ کئی زلیخائیں اپنی انگلیاں کٹوا بیٹھیں' آج سے ساٹھ سال پہلے بندہ فوج میں ''لیفٹین'' ہوا خوبصورت اتنا کہ بس اسے دیکھتے جائیں اور آنکھوں کی پیاس نہ بجھے اور تحریر ایسی کہ تکیے بھی بھگو دے اور فضا کو قہقہوں سے بھی بھر دے۔ تو آپ سوچیں گے کہ زلیخاؤں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ مگر زندگی بھر اس یوسف ثانی اور یوسف تحریر کا کوئی سکینڈل سامنے نہ آیا۔ کئی برس فوج میں جرنیل رہے' اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین کے طور پر خدمات انجام دیں لیکن ان کے دامن پر مالی آلودگی کی ایک چھینٹ تک نہیں۔ ساری عمر کی کمائی ایک گھر ۲۶ ویسٹرج ون راولپنڈی' اس کے علاوہ کچھ نہیں' میں اس شخص کو محبوب کی طرح نہ چاہوں تو میرا کلیجہ غم سے شق ہو جائے۔

میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں' بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں' ہر عید اور ہر نئے سال پر باقاعدگی سے اس وضعدار بزرگ دوست کے بھیجے ہوئے کارڈ' لندن سے شائع ہونے والا پنچ (جو بند ہو گیا) اور پرانی کتابوں کے بنڈل' یہ شفیق صاحب کے تحفے ہوتے تھے' جو مجھ تک پہنچتے رہتے تھے ان کا آخری تحفہ ان کی وہ تصویر ہے جو انہوں نے چند ماہ قبل میرے شدید اصرار پر مجھے ارسال کی جو میں ''معاصر'' کے آنے والے شمارے میں رنگین پوسٹر کے طور پر شائع کرنا چاہتا تھا۔ اس تصویر میں شفیق صاحب ایک لمبی سی کار کے ساتھ کھڑے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں خط لکھا کہ کار کی تصویر مل گئی۔ اپنی تصویر بھی ضرور بھیجیں مگر مجھے اس کا جواب نہ آیا۔

میں یہ کالم یہیں ختم کر کے راولپنڈی روانہ ہو رہا ہوں' جہاں آج بیس مارچ کو ڈھائی بجے دوپہر ریس کورس راولپنڈی میں ان کی نماز جنازہ میں شرکت کروں گا۔ شفیق صاحب بہت کم آمیز اور شرمیلے ہیں چنانچہ وہاں بے شمار لوگوں کے موجودگی کی وجہ سے انہوں نے اپنا چہرہ سفید کفن میں چھپایا ہوگا۔ میں ان سے پوچھنا چاہوں گا کہ میں جب ویسے ہی آئندہ چند دنوں میں آپ سے ملنے کے لئے راولپنڈی جانے کا پروگرام بنا رہا تھا آخر ایسی کون سی ایمرجنسی آن پڑی تھی کہ آپ نے اپنے چاہنے والوں کو اپنے عاشقوں کو کئی دن پہلے بلا لیا۔ میں جانتا ہوں اور وہ میری بات کا جواب دیں گے' صرف کفن کے نیچے زیر لب مسکرائیں گے اور دل میں کہیں گے ''میرے عزیز! میں نے تمہیں کب بلایا ہے' مجھے تو خود وہاں سے بلاوا آ گیا ہے جہاں سے ہر ذی نفس کو ایک دن بلاوا آتا ہے۔ مگر تم پریشان کیوں ہو' آنکھیں صرف دیکھنے کے لئے نہیں ہوتیں' آنکھیں رونے کے لئے بھی ہوتی ہیں اور جو آنکھیں اپنے پیاروں کے لئے روتی ہیں' وہ بہت خوشگوار آنکھیں ہوتی ہیں۔ تم میرے افسانے ''برساتی'' کی یہ دونوں کیفیتیں کیوں بھول گئے ہو؟

◆◆◆

آزمائش شرط ہے!

سو بچوں کے قاتل جاوید اقبال کو جج نے جو سزا سنائی ہے' اس کے مطابق سات سو سال قید' ایک سو مرتبہ پھانسی اور اس کے علاوہ اس کے جسم کے ایک سو ٹکڑے کر کے بچوں کے لواحقین کے سامنے تیزاب میں ڈالنا ہے۔ مجھے جج صاحب کے اس فیصلے پر دو لحاظ سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس فیصلے پر عمل ہو نہ ہو لیکن اس سے عوام کے دلوں کی بھڑاس نکل گئی ہے جن کے بچے قتل ہوئے ہیں یا جن کے بچے قتل نہیں ہوئے دل ان سب کا یہی چاہتا ہے کہ اس سفاک قاتل کو اگر اس سے بھی بڑی کوئی سزا مل سکتی ہو تو وہ ملنا چاہیے مثلاً چڑیا گھر کے شیروں کے حصے کا گوشت چڑیا گھر کے ملازمین کھا جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ شیر اکثر بھوکے سوتے ہیں چنانچہ ان شیروں کو کم از کم ایک دن پورا ناشتہ جاوید اقبال کو ان کے پنجرے میں دھکیل کر کرایا جا سکتا ہے (یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میری جبلی زندگی کو کس قدر تسکین حاصل ہو رہی ہے) یا ان شیروں کو ''بوفے'' پر مدعو کیا جا سکتا ہے جس میں جاوید اقبال کی مختلف ڈشیں تیار کر کے وہاں سلیقے سے دھری ہوں' بلکہ اس بوفے سے ایک دن پہلے جاوید اقبال کو کسی بدکردار شیر کے پنجرے میں اکیلا چھوڑ دیا جائے اور اگلے دن اس کے بچے کھچے جسم کی ڈشیں مہمان شیروں کے لئے تیار کر کے میزوں پر سجائی جائیں۔ غرض کہ ایسے بہت سے طریقے ہیں جن پر عمل کر کے ہم ایک درندے کو کیفر کردار تک بھی پہنچا سکتے ہیں اور بہیمانہ مظالم کی فلمیں دیکھ کر اپنی جبلت کو تسکین پہنچانے کی بجائے ہم اپنی آنکھوں کے سامنے ایک زندہ فلم چلا سکتے ہیں۔ جس سے نہ صرف یہ کہ ہمیں اس ظالم کے انجام پر دلی خوشی حاصل ہو گی بلکہ ہزاروں سال پہلے جنگلوں میں رہنے والے ہمارے آباؤ اجداد کی روحیں بھی خوش ہو جائیں گی اور اس روز ان کی زبان پر شعیب بن عزیز کا یہ شعر ہو گا

چلا جو شہر کو انسان کسی نے یہ نہ کہا
یہ تیغ و تیر انہیں جنگلوں میں رہنے دے

ایک سو بچوں کے سفاک قاتل جاوید اقبال کو عدالت کی طرف سے سنائی جانے والی سزا کے حوالے سے مجھے دوسری خوشی اس لحاظ سے ہوئی کہ فوری طور پر انسانی حقوق کی تنظیموں کے بیانات ایک عرصے کے بعد اخبارات میں نظر آئے جن میں سزا کو بہیمانہ قرار دیا گیا ہے اور سو بچوں کے قاتل جاوید اقبال جو بچوں سے بدفعلی کے بعد انہیں قتل کرتا تھا اور پھر ان کے جسم کے ٹکڑے کر کے انہیں

تیزاب کے ڈرم میں پھینک دیتا تھا اور اس سارے عمل سے اسے پہلے ان کی تصویریں اور ان کے کپڑے بھی ''سوونیئر'' کے طور پر اپنے پاس سنبھال لیتا تھا' کے لئے رحم کے جذبات سامنے آنا شروع ہو گئے۔ ناروے میں ایک پاگل کتے نے معصوم بچی کو چیر پھاڑ ڈالا' پولیس فوراً موقع پر پہنچی اور انہوں نے کتے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میں نے اگلے روز اخبار میں ایک تصویر دیکھی جس میں ایک عورت کتے کے مالک سے اس کے لاڈلے کتے کی افسوس ناک موت پر اظہار تعزیت کر رہی تھی۔ بہر حال مجھے بے حد خوشی ہے کہ ایک عرصے کے بعد ہمارے اہل دل حضرات کے بیانات بھی اخبار میں شائع ہوئے ہیں جن میں مذہبی' سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے بیانات بھی شامل ہیں ان بیانات میں جج صاحب کی طرف سے سنائی گئی سزا کی مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس نوع کی سزا کی کوئی گنجائش نہ ملکی قانون میں ہے اور نہ اسلام میں' اگر اس سزا پر عمل ہوا تو مغرب میں اسلام اور پاکستان کے خلاف یہ پراپیگنڈہ ہو جائے گا کہ اسلام ایک ظالمانہ مذہب ہے اور پاکستانی قوم ایک سفاک قوم ہے جسے اسلامی حقوق کی بھی کوئی پروا نہیں۔

انسانی حقوق کی تنظیموں اور خصوصاً مذہبی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے یہ بیانات میرے نزدیک اس لحاظ سے بھی بہت خوش آئند ہیں کہ انہوں نے جاوید اقبال کے خلاف ذاتی غصے کو ایک طرف رکھ کر انسانی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق طرز عمل اختیار کیا ہے' ان بیانات میں کہیں انتقام کی بو نہیں آتی بلکہ ایک سو بچوں کی سسکیوں اور ان کی آخری ہچکیوں کو اپنے ذہن سے جھٹک کر وہی کچھ کہا گیا ہے جو ملکی قانون اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا' ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ہماری سیاست عیش میں یاد خدا اور طیش میں خوف خدا بھول جاتی ہے۔

مغربی ملکوں کی امداد سے چلنے والی انسانی حقوق کی تنظیموں نے تو سزا کی مذمت غالباً اسی مغربی اصول کی روشنی میں کی ہے جس کے مطابق ناروے میں شائع ہونے والی تصویر میں قاتل کتے کی مالکہ سے تعزیت کی جا رہی ہے۔ یہ تنظیمیں اس کیس کے علاوہ فوجی حکومت کے سیاسی اسیروں کے بارے میں جو رویہ اختیار کریں گی اس سے مغرب کے رویے کا بھی اندازہ ہو گا مگر اسلام کے نام پر سیاست کرنے والوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں لوگ ان کے کردار کو مغربی آقاؤں کی خواہشات پر نہیں اسلامی اور اخلاقی معیار کے نہایت کڑے پیمانے پر ماپتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے مذہبی سیاسی رہنماؤں نے جہاں جاوید اقبال ایسے سفاک قاتل کے حوالے سے انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کی پامالی کی مذمت کی ہے' وہ اپنے سیاسی حریفوں سے ماضی میں ہونے والی سیاسی

چپقلشوں اور زیادتیوں جن کی حیثیت موجودہ کیس سے موازنے کی صورت میں برائے نام رہ جاتی ہے' کے باوجود ان کے لئے بھی انسانی حقوق اور ایک اسلامی عدل کے حوالے سے آواز اٹھائیں گے۔ یہ بات ان کے وقار میں اضافے کا باعث بنے گی اور ان کے کردار کی اس عظمت کو دیکھتے ہوئے لوگ انہیں دنیادار سیاست دانوں پر ترجیح دیں گے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری مذہبی سیاسی جماعتیں مسلسل اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ ان کی گفتار' ان کا کردار قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسا ہے' یا کم از کم جو دنیادار سیاست دان ہیں ان سے کہیں بہتر ہے۔ تو آئندہ انہیں یہ شکایت کبھی نہیں رہے گی کہ لوگ انتخابات میں انہیں ووٹ نہیں ڈالتے۔ اس نسخے کی کامیابی شرطیہ ہے۔ بے شک آزما کر دیکھ لیں!

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (8)

صحبت کا اثر

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے پاکستان میں ایک بقر عید گزارنے کا موقع ملا۔ ان تین دنوں میں میری ملاقات لوگوں سے زیادہ بکروں سے ہوئی۔ جدھر نظر اٹھتی تھی بکرے ہی بکرے دکھائی دیتے تھے' بکروں میں رہتے ہوئے ان کے مالکوں کی شکلیں بھی بکروں جیسی ہوگئی تھیں۔ میرے ایک دوست نے تو بے خیالی میں بکروں کو ٹٹولتے ان کے ایک مالک کو بھی ٹٹول ڈالا' جس پر اس نے بکروں کی "بے" کی آواز نکالی۔ مجھے تو کم از کم یہی محسوس ہوا' ممکن ہے اس شخص نے کچھ اور کہا ہو۔ میرے خیال میں انسانوں کو زیادہ وقت انسانوں کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ صحبت انسان کی شخصیت تبدیل کر دیتی ہے۔

کمیونسٹ دوست

مجھے ان تین دنوں میں تین لفظ بہت سننے کو ملے' دوندا' چوگا' اور کھیرا' دوندا' دو دانت والے اور چوگا چار دانت والے کو کہتے ہیں اور انہی کی قربانی جائز ہے۔ کھیرا ایک طرح سے نابالغ جانور کو کہا جاتا ہے اور اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ بکرا منڈی میں ایک موٹے پیٹ والا شخص جو لینڈ کروزر پر آیا تھا اور جس کے ساتھ چار گن مین تھے۔ قربانی کے لئے دوندے اور چوگے چھانٹ کر الگ کر رہا تھا۔ اس نے دس بارہ بکرے خریدے' میرے دوست نے اس موٹے پیٹ والے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ خود بھی چوگا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ذبح ہونے والے بکروں کو حکم ہوگا کہ وہ ان موٹے پیٹ والوں میں سے جو دوندے اور چوگے ہیں ان کی قربانی کریں" میرا خیال ہے میرا یہ مقامی دوست کمیونسٹ ہے!

محروم شخص

میرے اسی دوست نے بتایا کہ جس جانور کا سینگ ٹوٹا ہو' ٹانگ میں خرابی ہو یا آنکھ میں نقص ہو اسلام میں اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ میرے اس دوست نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومتوں کو بھی یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے لیکن وہ الٹا محروم طبقے ہی کو قربانی کا بکرا بناتی ہے اور صحت مند اور تگڑے "جانوروں" کی طاقت میں ہر آنے والی حکومت حیلے بہانوں سے اضافہ ہی کرتی ہے۔

مجھے پتہ چلا کہ کمیونسٹ خیالات کا حامل یہ محروم شخص خود بھی اس طاقت ور طبقے میں داخل ہونے کے لئے ایک عرصے سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

بے زبان مخلوق

پاکستان میں عید پر اخبارات خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں' جن کے سرورق پر خانہ کعبہ کی تصویر ہوتی ہے اور اندر کے صفحات پر فلمی ہیروئنوں کی تصویریں بکروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر بکروں کو گلے لگایا ہوتا ہے' بکرے بڑے خوش نظر آتے ہیں' شاید انہیں علم ہوتا ہے کہ جس نے اسے گلے سے لگایا ہوا ہے اس نے اگلے روز اسے ذبح کرنا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ فلمی ہیروئنیں یہ سلوک صرف بکروں کے ساتھ ہی نہیں انسانوں کے ساتھ بھی کرتی ہیں اور سارا سال کرتی ہیں۔ انہی صفحات میں فلمی ہیرو بھی بکروں کے ساتھ نظر آتے ہیں' مجھے یہ حق تو پہنچتا ہے کہ میں پاکستان کے بعض مقبول ہیروؤں کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کروں' تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ انہیں بکروں کے ساتھ تصویر اتروانا چاہیے۔ بکرے بیچارے تو بے زبان ہوتے ہیں۔

وفاداران

میں نے سنا ہے کہ عید پر امیر لوگ کسی دوسرے امیر شخص کو پاؤ ڈیڑھ پاؤ گوشت بھیجنے کی بجائے بکرے کی پوری ران بھیجتے ہیں۔ میرے مقامی دوست نے بتایا کہ یہ ران گھوم پھر کر واپس پھر اس شخص کے پاس پہنچ جاتی ہے جس نے ابتداء میں یہ ران ارسال کی تھی۔ پالتو کبوتروں کے بارے میں تو مجھے علم تھا کہ وہ سارا دن فضا میں پرواز کرنے کے بعد شام کو واپس اپنی منڈیر پر آ بیٹھتے ہیں۔ لیکن کسی مرحوم بکرے کی ران میں وفاداری کا یہ عنصر میرے لئے حیران کن ہے۔

بکرے اور عوام

مجھے یہاں ایک بات اچھی نہیں لگی' اور وہ یہ کہ جو لوگ بکرا خریدنے جاتے ہیں وہ بڑی بے دردی سے بکرے کا منہ کھول کر اس کا دوندا یا چوگا ہونا چیک کرتے ہیں یہ بکرے مسلسل تین دن تک دن میں بیسیوں مرتبہ نہایت تکلیف دہ مرحلے سے گزرتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جس بکرے کے منہ میں دانت ہیں وہ اپنے ساتھ اس نوع کی زیادتی کرنے والے شخص کے خلاف اپنے یہ دانت استعمال کیوں نہیں کرتا؟ اس کی وجہ تو خدا جانے کیا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ اس طرح کی زیادتی ہوتی انہی کے ساتھ ہے جو منہ میں دانت رکھتے ہوئے ان دانتوں کا استعمال نہ کریں۔ میرے ایک مقامی طنز نگار دوست نے کہا تم بکروں اور ان کے دانتوں کی بات

کرتے ہو۔ ہمارے عوام تو ان بکروں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ وہ ہر طرح کا ظلم سہتے ہیں یا ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ لیکن منہ ہوتے ہوئے بھی وہ ان مظالم کے خلاف زبان نہیں کھولتے!

بکرے کی ماں

کئی لوگ عید پر بکرا نہیں خریدتے بلکہ وہ سال دو سال اسے پالتے ہیں اور پھر عید پر اس کی قربانی دیتے ہیں۔ اس دوران بچے اسے چہل قدمی کے لئے باہر لے جاتے ہیں اور کئی شرارتی بچے اس معصوم سے جانور کو ٹکریں مارنا بھی سکھاتے ہیں جس سے وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے عید کے تیسرے دن میں ایک گھر میں مہمان تھا جہاں اس طرح کے سدھائے ہوئے بکرے کی قربانی ہونا تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک ہٹا کٹا قصائی ہاتھ میں تیز دھار چھری پکڑے فاتحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس میں یہ غرور اس لئے آیا تھا کہ وہ کئی برسوں سے کتنے ہی بکرے بغیر کسی مزاحمت کا سامنا کئے بغیر ذبح کرتا چلا آ رہا تھا۔ مگر جونہی وہ اس سدھائے ہوئے بکرے کی طرف بڑھا بکرا تین چار قدم الٹے پاؤں چلا اور پھر اس نے ایک بھرپور ٹکر قصائی کو ماری۔ جس پر چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پتہ چلا کہ صبح یہ تیسرا قصائی تھا جس کے ساتھ یہ بکرا اس نوع کا سلوک کر چکا تھا چنانچہ بکرے کے مالک نے اس کی قربانی کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ مجھے یقین ہے اگلے سال یہ بکرا ضرور قابو آ گیا ہوگا کیونکہ یہاں ایک محاورہ رائج ہے ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' ویسے بکروں کی مائیں خیر منانا چھوڑ دیں تو شاید بکروں کی جانیں بچ جائیں لیکن مامتا بڑی کمزور ہوتی ہے۔

◆◆◆

یادرہ جانے والے کام

بہاولپور سے کرنل (ر) ایم اے چودھری کا ایک خط مجھے موصول ہوا ہے' آپ پہلے خط ملاحظہ فرمائیں' اس پر گفتگو بعد میں کرتے ہیں۔

محترم قاسمی صاحب!

السلام علیکم! پچھلے دنوں میاں شہباز شریف کو چند گھنٹوں کی رہائی ملی تو انہوں نے لاہور آ کر تقریر کرتے ہوئے اپنی خدمات گنوائیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کالم کے ذریعے مشورہ دیں کہ شہباز شریف کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ کام تو خوشبو کی طرح پھیلتا اور محسوس ہوتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں شریف خاندان کے مخالفوں نے اس خاندان پر اتنا زہر اگلا ہے کہ ملک بھر کے سانپوں کا زہر اکٹھا کیا جائے تب بھی اتنا نہیں بنے گا..... لیکن اس مہم کے دوران بھی مخالفین شہباز کی کارکردگی سراہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

لوگ لاہور کی بات کرتے ہیں میں کہتا ہوں جو شخص آج بہاولپور اور ملتان کی سڑکیں دیکھ لے اس کے منہ سے بھی بے اختیار شہباز شریف کے لئے داد تحسین نکلے۔ سرکاری افسروں سے پوچھیں تو وہ کہتے ہیں۔ شہباز شریف زبان کا تو سخت تھا مگر دیانتدار افسروں کو Protect کرتا تھا اور کسی ایم این اے یا ایم پی اے کے کہنے پر کسی اچھے افسر کا تبادلہ نہیں کرتا تھا۔ پولیس افسر بتاتے ہیں کہ اس نے پڑھے لکھے انسپکٹر میرٹ پر بھرتی کر کے انہیں سہالہ میں پی ایم اے کی طرز پر بہترین ٹریننگ دلوائی تا کہ پڑھے لکھے نوجوان تھانوں کا فرسودہ کلچر تبدیل کریں۔

والدین اور استاد دونوں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ خود امتحانی سنٹروں میں پھرتا تھا۔ رحیم یار خاں سے اٹک تک وہ خود چیکنگ کرتا رہا اور بال آخر اس نے نقل ختم کر کے دکھا دی اور امتحانی سسٹم پر لوگوں کا پھر سے اعتماد بحال ہو گیا۔

میرے اپنے کولیگ جنہوں نے اسے کام کرتے دیکھا بتاتے ہیں کہ کیا سول اور کیا ملٹری' ہم نے چالیس سالوں میں اس طرح کا محنتی' انتھک اور Dynamic شخص نہیں دیکھا جس نے قوم کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لئے اتنا کام کیا ہو' اس طرح کے لوگ قوموں کے لئے ایک rare asset ہوتے ہیں اس کا ضائع ہونا..... اور وہ بھی پاک فوج کے ہاتھوں..... بہت بڑا المیہ ہو گا۔

12 اکتوبر کو لوگوں کی آنکھوں میں اور طرح کی چمک تھی..... آپ کسی محفل میں بیٹھے ہیں تو سول لوگوں کی باتوں میں شکایت'

مایوسی' تنقید اور طرز کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے خدا کرے کہ پاک فوج کی تنقید اور طنز سے محفوظ رہے۔

کرنل (ریٹائرڈ) ایم اے چودھری..... بہاولپور)

☆☆☆

قارئین کے اس نوع کے خطوط کی پوری ''بوری'' میں سے یہ ایک خط میں محض مشتے از نمونہ خروارے کے مصداق شائع کر رہا ہوں۔ یہ بات کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ ممکن ہے حکومت کو عوامی جذبات کے حوالے سے اندھیرے میں رکھا جا رہا ہو' بلکہ میری خواہش ہے کہ میں قارئین کے تمام خطوط ان کے ایڈریس حذف کر کے جنرل پرویز مشرف صاحب کی خدمت میں ارسال کر دوں تا کہ ان کے ذہن میں جو بھی پروگرام ہو یا وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتے ہوں تو عوامی جذبات کے حامل یہ خطوط بھی ان کے مدنظر رہیں۔ جنرل صاحب اس وقت قوم کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں ان کے فیصلے پاکستان کی قسمت پر اثر انداز ہوں گے لہٰذا ان کے ساتھ جو لوگ حکومت میں ہیں اور ان میں سے کچھ ممکن ہے زیادہ سے زیادہ حکومت میں رہنا چاہتے ہوں۔ لہٰذا جنرل صاحب کو ملک و قوم کی قسمت کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کی رائے بھی جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بعض سیاسی جماعتوں کے جو رہنما شریف خاندان کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی حمایت میں اتنے لوگ ہیں جتنے ان جماعتوں کے ووٹر ہیں' لہٰذا اخبارات میں جو شور و غوغا ہے' اسے بھی بے شک دھیان میں رکھیں لیکن جن کا شور سنائی نہیں دے رہا ان کے وجود سے منکر ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ مسلم لیگ اور اس کا ووٹ بنک تو بہر حال موجود ہے!

جہاں تک میاں شہباز شریف کا تعلق ہے' وہ ایک لحاظ سے میاں نواز شریف سے بہتر پوزیشن میں ہیں اور ایک لحاظ سے ان کی پوزیشن اس سے مختلف بھی ہے' یہی صورت حال میاں نواز شریف کو بھی درپیش تھی کیونکہ میاں نواز شریف ملک کے وزیر اعظم تھے' ملک کے کسی بھی حصے میں' کسی بھی حوالے سے کوئی اچھا کام ہو تو اس کا کریڈٹ وزیر اعظم کو جاتا ہے اور غلط کام کا ڈسکریڈٹ بھی وزیر اعظم ہی کے حصے میں آئے گا۔ چنانچہ میاں شہباز شریف نے پنجاب میں جو اچھے کام کئے ان کا ''اجر'' میاں شہباز شریف' میاں نواز شریف دونوں کو جائے گا۔ تاہم میرے خیال میں اور پنجاب کے عوام کی بہت بڑی تعداد کے نزدیک دوسرے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کی نسبت میاں شہباز شریف کے اچھے کاموں کا پلڑا بھاری ہے کہ ان کی لغزشیں کہیں بہت نیچے دب گئی ہیں۔ کرنل صاحب نے جن کارناموں کا ذکر کیا ہے' وہ کوئی معمولی نوعیت کے نہیں (ان میں سے ابھی وہ بہت کام بھول گئے ہیں جن میں خوبصورت بسوں کے اجراء اور نئے بس سٹاپوں وغیرہ کی تعمیر بھی شامل ہے) اور ان کی کامیابی کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے سیاست دانوں اور ایم پی ایز وغیرہ کے کسی دباؤ کو خاطر میں نہیں لائے اور وزیر اعظم کی طرف سے نہ صرف یہ کہ ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا

بلکہ انہیں وزیر اعظم کی مکمل اشیر باد اور رہنمائی حاصل تھی۔ نیز انہیں اے کے زیڈ شیر دل جیسا چیف سیکرٹری میسر تھا' بہر حال شہباز شریف نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ چنانچہ جب میاں نواز شریف اوسلو میں پی ٹی وی کے افتتاح کے لئے تشریف لائے تو میں نے ان سے ازراہ تفنن عرض کیا تھا کہ وہ میاں شہباز شریف کو ''ڈیپوٹیشن'' پر دوسرے صوبوں میں بھی بھیجیں تا کہ وہاں کے حالات بھی پہلے سے بہتر ہو سکیں۔

کرنل صاحب نے اپنے خط میں لاہور اور بہاولپور کی سڑکوں کا ذکر کیا ہے میرے ایک عزیز دوست پورے اعتماد سے (مگر مجھے چھیڑنے کی غرض سے) یہ بات کہتے ہیں کہ لاہور میں جتنی سڑکیں بنی ہیں' وہ سب رائے ونڈ کو جاتی ہیں' کرنل صاحب کے خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ صرف لاہور نہیں بلکہ بہاولپور کی سڑکوں کا رخ بھی رائے ونڈ ہی کی طرف ہے' میں گزشتہ ہفتے راولپنڈی میں تھا میں نے وہاں مری روڈ کو بھی رائے ونڈ کی طرف جاتے دیکھا ہے' بلکہ ایک دوست جو کراچی سے آئے تھے' انہوں نے مجھے وہاں سڑکوں اور فلائی اوورز وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بتایا ان کے متعلق بھی تحقیق کرنا پڑے گی۔ ممکن ہے آج نہیں تو کل وہ بھی رائے ونڈ ہی کا رخ کر بیٹھیں۔

خیر یہ تو چھیڑ خوباں سے چلی جائے والی بات تھی۔ ایک بات جو مجھے سنجیدگی سے موجودہ حکومت سے عرض کرنا ہے' وہ یہ کہ اچھے کام کبھی رائیگاں نہیں جاتے چنانچہ سابقہ مرکزی حکومت اور صوبوں نے جو اچھے کام ادھورے چھوڑے تھے' موجودہ حکومت اگر انہیں مکمل کر دے تو یہ نیکی آدھی ہی سہی مگر دونوں کے نامہ اعمال میں لکھی جائے گی۔ میری یہ درخواست چیف ایگزیکٹو اور چاروں صوبوں کے گورنروں سے ہے۔

◆◆◆

پروفیسر پرویز مشرف

میرے گذشتہ روز کے کالم میں پروف ریڈنگ کی دو غلطیاں ہوئی ہیں (حالانکہ میرا کالم بہت احتیاط سے پڑھا جاتا ہے) جن میں سے ایک غلطی بہت دلچسپ ہے یعنی جنرل پرویز مشرف کو جنرل ''پروفیسر'' مشرف لکھا گیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ غلطی نہیں بلکہ پروف ریڈر نے اصلاح کی ہے یا جنرل صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ ایک تو وہ اپنے نام کے ساتھ ''پرویز'' لکھنا ترک کر دیں کہ پرویز وہ بدنصیب شخص تھا جس نے نبی اکرم کا نامہ مبارک پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور دوسرے اس ''غلطی'' میں پرویز کی جگہ ''پروفیسر'' کہلوانے کا مشورہ بھی شامل ہے۔

اگر یہ واقعی پروف کی غلطی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت مشورے کی ہے تو اس مشورے کے تائید کنندگان میں میرا بھی نام شامل کر لیں۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ کہ جب سے جنرل صاحب برسر اقتدار آئے ہیں اور وہ ایک پروفیسر کی طرح قوم کو لیکچر دے رہے ہیں' یہ اچھا ہے۔ وہ برا ہے' یہ نہ کریں۔ وہ نہ کریں۔ چونکہ میں خود ہی ایک ''کرانک'' پروفیسر ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ ہم لوگ کبھی کلاس روم میں پوری تیاری کے ساتھ جاتے ہیں اور کبھی موقع نہ ملے تو بھی ٹائم پاس کر ہی لیتے ہیں چنانچہ ''پروفیسر'' مشرف صاحب کا لیکچر سنتے ہوئے مجھے ان دونوں چیزوں کا اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً کبھی وہ متاثر کرتے ہیں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظام میں تبدیلی کے حوالے سے ان کی باتیں اگرچہ صحیح ہیں لیکن اس ضمن میں کوئی ہوم ورک نہیں کیا گیا' یا جو ''ٹیوٹر امپورٹ کئے گئے ہیں انہیں زمینی حقائق کا کچھ علم ہی نہیں ہے۔ چنانچہ گزشتہ پانچ ماہ سے محض ٹائم پاس کیا جا رہا ہے۔

میرے ذاتی خیال میں جنرل صاحب کے لیکچر میں گاہے گاہے تاثیر کی جو کمی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پروفیسر۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتے ہیں اور ان اداروں میں طلبہ کو دلیل سے قائل کیا جاتا ہے' انہیں کان نہیں پکڑوائے جاتے۔ انہیں ناک سے لکیریں نکالنے کے لئے نہیں کہا جاتا' انہیں بید نہیں مارے جاتے' انہیں مرغا بنا کر ان کی پیٹھ پر اینٹیں نہیں رکھی جاتیں' انہیں تھپڑ نہیں مارے جاتے' ان کی دو انگلیوں کے درمیان پنسل رکھ کر انگلیوں پر دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ غرض کہ ان کے ساتھ سکول کے بچوں والا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ہماری قوم بھی گزشتہ باون سال میں سیاسی طور پر پوری طرح بالغ ہو چکی ہے' اب وہ ''سکول گوئنگ'' نہیں بلکہ یونیورسٹی گوئنگ ہیں چنانچہ انہیں اپنی بات دلیل سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اپنے موقف کا قائل کرنا ہو تو اسے اپنے اچھے

عمل سے کیا جا سکتا ہے اور یا پھر دلیل کام آتی ہے۔ کسی کو ذلیل کر کے دلیل نہیں منوائی جا سکتی۔ چنانچہ جنرل صاحب سے درخواست ہے کہ اول تو وہ کلاس میں مانیٹر رکھیں ہی نہ کیونکہ مانیٹر صرف سکول میں ہوتے ہیں اور اگر مانیٹر رکھنے ہی ہیں تو پھر اسے یہ حق نہ دیں کہ وہ بالغ قوم کے کسی فرد پر تشدد کرے یا اس کے قومی افتخار کو دھچکا پہنچائے۔

کالم نگار کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ بات سے بات نکالنے کے شوق میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جابر شہنشاؤں کے زمانے میں اخبارات نہ ہونے کی وجہ سے کالم نگار بھی نہیں ہوتے تھے ورنہ انہیں وہاں پہنچا دیا جاتا جہاں وہ ابھی پہنچنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر یہ جو جنرل مشرف کے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لگ گیا ہے وہ غلطی ہی سے لگا ہے تاہم میری خواہش ہے کہ اب جنرل صاحب اسے اپنے نام کا حصہ ہی بنا لیں۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو کسی کالج یا یونیورسٹی میں پروفیسر نہیں ہیں مگر لوگ انہیں ان کے علم و فضل یا کسی ہنر کی وجہ سے پروفیسر صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ایک اڑتی سی خبر ہے کہ اپریل میں پنجاب یونیورسٹی جنرل صاحب کو ''ڈاکٹر آف لاء'' کی اعزازی ڈگری دے رہی ہے۔ مجھے اس خبر پر یقین تو نہیں آیا لیکن سب کچھ ممکن ہے اور اگر جنرل صاحب کو واقعی قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جاتی ہے تو اس کے بعد پروفیسری کیا چیز ہے اس اعزاز پر مجھ ایسے ایک حقیر کالم نگار سے تو وہ پیشگی مبارکباد قبول فرمائیں' اس پر تائیدی اور مبارکبادی اداریے اور مقالے تو بعد میں شائع ہوتے رہیں گے۔

◆◆◆

ایک اشارہ ہی کافی ہے!

پاکستانی عوام بلوں سے بہت تنگ ہے اور اب تو دن بدن ان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے' بجلی کا بل' ٹیلی فون کا بل اور پٹرول کا ''بل'' تو ایسا آیا ہے کہ لوگ ''بل بلا'' اٹھے ہیں۔ اوپر سے آج کل کلنٹن بھی پاکستان آ رہے ہیں ان کے آنے کی خوشی بھی ہے اور ان کے کی آمد کے خیال سے دل پر اداسی بھی طاری ہے۔

تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

ان کے آنے کی خوشی اس لئے ہے کہ مہمان گھر آ رہا ہے اور اداسی کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام کے بلوں میں دن بدن اضافہ بل کلنٹن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ پانچ مہینے میں دو مرتبہ پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ تیسری دفعہ ان کے جانے کے بعد ہوگا

دو ہی گھڑیاں مجھ پہ گزری ہیں کٹھن
اک تیرے سے پہلے اور اک تیرے جانے کے بعد

بلکہ موصوف کے جانے کے بعد خدا جانے یہ آسماں کیا کیا رنگ بدلے گا۔ آسماں سے بجلیاں گریں گی یا رنگ و نور کی بارش ہوگی' یہ تو کوئی منجم ہی بتائے گا۔

ہمارے صاحبان اقتدار اور صاحبان سیاست دونوں صدر کلنٹن کی آمد کے حوالے سے بہت ہی امیدیں باندھے ہوئے ہیں' حکومت کو این اوسی درکار ہے۔ مسلم لیگ اسمبلی کی بحالی چاہتی ہے اور پیپلز پارٹی وغیرہ جمہوریت واپس مانگ رہے ہیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں اللہ تعالیٰ سے ارباب حکومت اور ارباب سیاست کے لئے قومی غیرت اور انا کی دعا مانگ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ صدر کلنٹن کی آمد پر ہم ان سے اس طرح ملیں جس طرح ایک غریب رشتے دار' اپنے امیر رشتے دار سے ملتا ہے۔ ان سے حکومت کے لئے این اوسی مانگنا یا جمہوریت مانگنا دونوں پاکستانی قوم کو امریکہ اور دنیا کی نظروں سے مزید گرانے والے فعل ہیں۔ کلنٹن سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت مند خود کلنٹن ہے۔ ارباب حکومت اور ارباب سیاست دان میں سے جو اس کی ضرورتیں پوری کرے گا کلنٹن اسی کا ہوگا۔

دوست احباب پوچھتے ہیں کہ صدر کلنٹن کے دورہ پاکستان کے اثرات کیا ہوں گے اور اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں کیا تبدیلی آئے گی؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ امریکہ دوستی کے پاکستان پر ''اثرات'' بہت دیرینہ ہیں اور اب مزید ''اثرات'' اور ثمرات'' کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ جہاں تک دونوں ملکوں کے تعلقات میں تبدیلی کا تعلق ہے ''تعلقات'' اسی طرح رہیں گے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے امریکہ ہمیں اپنا ''جان وجگر'' کہتا تھا' چنانچہ جب اسے ضرورت پڑتی تھی' وہ کبھی ہمارا جگر اور کبھی کلیجی بھون کر کھا جاتا تھا' اب اس نے دوستی کا اظہار کم کر دیا ہے۔ اب وہ ہمیں ''جان وجگر'' نہیں کہتا کہ ان دونوں چیزوں میں سے ہمارے پاس کچھ نہیں بچا لیکن وہ ہم سے دوستی جتاتا رہے گا۔ یہ اس دوستی کا صدقہ ہے کہ صدر کلنٹن بھارت میں پانچ دن موج میلہ کر کے پانچ گھنٹے کے لئے پاکستان تشریف لا رہے ہیں اور وہ بھی شاید اسی لئے کہ کسی سے احمد فراز کا یہ شعر سن لیا ہوگا۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو ہم سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

چنانچہ زمانے کو دکھانے کے لئے صدر صاحب آج پاکستان میں ہوں گے۔ گو بھارت کے ساتھ ان کی گفتگو کے موضوعات منہ میں پانی لانے والے تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے سارے موضوعات ہمیں ''یرکانے'' والے ہیں!

تاہم مجھے ذاتی طور پر خوشی اس بات کی ہے کہ پاکستان کے بعد اب امریکہ ''دوستی'' کا نیا دور بھارت کے ساتھ شروع کر رہا ہے۔ پاکستان کے حق میں اس سے زیادہ بہتر اور کوئی بات نہیں ہے۔ امریکہ جب دوستی کرتا ہے تو کسی قوم سے نہیں کرتا' وہ ان کی حکومت سے کرتا ہے' سیاست دانوں سے کرتا ہے۔ فوج سے کرتا ہے' حساس اداروں سے کرتا ہے۔ دانشوروں سے کرتا ہے۔ اخبار نویسوں سے کرتا ہے' مذہبی رہنماؤں سے کرتا ہے اور اوپر سے نیچے تک کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کرتا' سب کچھ وہی کرتے ہیں جن سے اس نے ہاتھ ملایا ہوتا ہے اور ہاتھ ملانے کے بعد ایک آنکھ میچ کر یہ ہاتھ تھوڑا سا دبایا بھی ہوتا ہے۔ یہ سب عقل مند لوگ ہوتے ہیں اس کے بعد ان کے لئے امریکہ کا ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

◆◆◆

گھوڑے اور گھاس کی دوستی

امریکی صدر کلنٹن کے دورہ پاکستان سے وہ لوگ بہت مایوس ہوئے ہیں جو اس کے دورے کے حوالے سے پر امید تھے۔ حالانکہ امریکی صدر نے جنوبی ایشیا کے دورے میں ایک اچھے اداکار کی طرح اپنا کردار ادا کیا' انہوں نے ڈائیلاگ اچھی طرح یاد کئے ہوئے تھے' انڈیا' بنگلہ دیش اور پاکستان میں آمد کے دوران ان کا ہر ''جیسچر'' ہر ''موومنٹ'' اور چہرے کا اتار چڑھاؤ سکرپٹ اور سکرین پلے کے عین مطابق تھا۔ اس تین ایکٹ ڈرامے کے دورانئے بھی جنوبی ایشیا کے ممالک کے رویوں کے حوالے سے امریکہ کی نئی پالیسی کے عکاس تھے۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا صرف اس کے ''ننگے'' اظہار نے پاکستانی قوم کو مایوس کیا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکی پالیسی میں یہ نیا انداز پاکستانی فوجی حکومت کی وجہ سے سامنے آیا ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ امریکہ کو کبھی اس سے غرض نہیں رہی کہ پاکستان میں حکومت کون کر رہا ہے' اس کی دلچسپی صرف اس امر تک ہوتی ہے کہ جو حکومت کر رہا ہے وہ امریکی مفادات کی کس حد تک حفاظت کرتا ہے۔ میرے نزدیک پاکستان سے منہ موڑ کر انڈیا کی طرف رخ کرنے کی امریکی وجوہات تین ہیں' ایک صدر کلنٹن کے پانچ مرتبہ ٹیلی فون کے باوجود کہ پاکستان ایٹمی دھماکے نہ کرے وزیر اعظم نواز شریف کا ایٹمی دھماکہ کرنا' دوسرے پاکستان میں مسلسل سیاسی عدم استحکام اور اس کی وجہ سے معیشت کی بربادی اور اس کے مقابلے میں انڈیا کا مسلسل ایک معاشی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آنا' اور تیسرے مغربی دنیا کا تاثر کہ پاکستان ایک جنوبی مذہبی ریاست ہے اور اس کے مقابلے میں انڈیا ایک سیکولر ملک ہے۔

آخری بات انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ پاکستان نہیں بلکہ انڈیا ایک مذہبی جنوبی ریاست ہے جہاں مسلمانوں کے بعد سکھوں اور اب عیسائیوں کو بھی برداشت نہیں کیا جا رہا۔ اسی طرح مغربی ممالک کے عوام نہیں البتہ حکومتیں پوری طرح ''مسیحی'' ہیں' ان کی تمام پالیسیاں عالم اسلام کو کچلنے کے محور کے گرد گھومتی ہیں۔ بلند ایجوت ایسے روشن خیال ترک رہنما کو یہ کہنا پڑا کہ ترکی کو یورپین یونین کا رکن اس لئے نہیں بنایا جا رہا کہ ترکی ایک مسلمان ملک ہے اور یورپین یونین دراصل کرسچین یونین ہے لیکن انڈیا اور مغربی ممالک نے اپنے چہروں پر سیکولرازم کا خوبصورت نقاب اوڑھا ہوا ہے اور وہ دنیا کو مسلسل پوری کامیابی سے دھوکا دے رہے ہیں' اس کے برعکس ہم صرف اسلام کی بڑھکیں لگاتے ہیں اور خونخوار قسم کے بیانات اور خونخوار قسم کے اجتماعات سے بیرون

ملک پاکستانی عوام کا تشخص مجروح کر کے پاکستان کے مفاد کو غیر ارادی طور پر نقصان پہنچانے میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے اسلام بھی بدنام ہوتا ہے' پاکستان بھی اسلام یا پاکستان کو اس سے فائدہ بھی کچھ نہیں پہنچتا۔ کاش ہمارے مذہبی رہنما پاکستان کو ایک مضبوط اسلامی فلاحی مملکت بنانے کے لئے قوم کو جہالت سے نکالیں' ان کے مذہبی جذبات ایکسپلائٹ کرنے والوں کو بے نقاب کریں' غیر ممالک سے امدادی رقوم حاصل کرنے والے حکمرانوں' سیاستدانوں اور مولویوں سے اعلان لاتعلقی کریں۔ پاکستان میں سیاسی استحکام کے لئے منتخب حکومتوں کے خلاف محاذ آرائی کی حوصلہ شکنی کریں۔ قوم کو جدید ٹیکنالوجی' معاشی ترقی اور روشن خیالی پر ابھاریں اور دشمنان اسلام و پاکستان کی چالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی حکمت عملی اپنائیں کہ کسی کو اسلام اور پاکستان کے خلاف ہزیان بکنے کا موقع نہ ملے۔ پاکستان طاقت ور ہو تو اسلام خود بخود طاقت ور ہو جائے گا۔ اس وقت بہترین تبلیغ اور بہترین جہاد پاکستان کو ایک معاشی دیو بنانا ہے۔

اور جہاں تک پاکستان میں سیاسی عدم استحکام اور معیشت کے زوال اور اس کے مقابلے میں انڈیا کا ایک سیاسی اور معاشی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آنا ہے۔ اس کی زیادہ تر ذمہ داری ان عناصر پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے پاکستان میں جمہوریت کی گاڑی کو چلنے ہی نہیں دیا۔ یہ گاڑی دو قدم چلتی ہے اور کوئی زنجیر کھینچ کر اسے ویرانے میں کھڑی کر دیتا ہے' کبھی ڈرائیور کو کان سے پکڑ کر نیچے اتار لیا جاتا ہے اور کبھی وہ موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور یوں یہ گاڑی ڈرائیور کے انتظار میں برسوں ویرانے میں کھڑی رہتی ہے۔ بھارت کے سیاست دان پاکستان سے پانچ گنا زیادہ کرپٹ ہیں' بلکہ پوری دنیا میں حکومت جس کے پاس بھی ہے۔ سیاست دانوں کے پاس ہے یا فوجیوں کے پاس ہے وہاں کرپشن لامحالہ ہوتی ہے۔ جاپان میں سیاسی حالات کافی دگرگوں رہتے ہیں لیکن جمہوری نظام چلتا رہتا ہے۔ جاپان اور اس کے بعد انڈیا اپنے نظام میں تمام تر خرابیوں کے باوجود صرف اس کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے ایک سیاسی اور معاشی طاقت بن کر سامنے آئے ہیں۔ اگر ہم بھی ذاتی انا کے خول سے باہر نکل آئیں اور صرف قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر فیصلے کریں تو ہمیں کسی صدر کلنٹن کے آنے یا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

صدر کلنٹن کے دورے سے قوم میں پائی جانے والی مایوسی کی وجہ ہمارا غیر حقیقت پسند ہونا ہے کہ وہ ہمیں ایک طاقت ور ملک کا پروٹوکول دے۔ ہمارے نزدیک دوستی کا تصور وہ ہے جو پاکستانی فلموں میں پیش کیا جاتا ہے ''یار کی یاری کو دیکھا جاتا ہے' اس کے عیبوں کو نہیں'' مگر ڈپلومیسی میں یار نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی' گھوڑے اور گھاس میں کیسے یاری ہو سکتی ہے؟ آپ کو دنیا اتنا ہی پروٹوکول دے گی' جتنا آپ کے ڈولوں میں دم خم ہے۔ باقی بڑھکیں جتنی چاہے لگا لیں' اس سے بھلا کون کسی کو روک سکتا ہے؟

◆◆◆

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور (9)

ٹی وی پروڈیوسر سے ملاقات

پاکستان میں ایک ٹی وی پروڈیوسر سے میری شناسائی پیدا ہوئی۔ عمر تو اس کی پچپن سال تھی لیکن پچھتر برس کا لگتا تھا۔ اس کے سر پر چھ سات بال تھے جنہیں وہ مسلسل سر پر جمانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور سخت گرمی میں بھی کسی کو پنکھا نہ چلانے دیتا۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا مگر جب میں اس کے ساتھ ٹی وی سٹیشن گیا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کا کمرہ خوبصورت لڑکیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور وہ اس کی ایک ایک ادا پہ قربان ہو رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ ان میں سے کچھ اس کے ڈراموں میں کام کر رہی ہیں اور باقی کام کرنے کی خواہشمند ہیں۔ ٹی وی پروڈیوسر نے دوران گفتگو مجھے مخاطب کر کے کہا "یہاں کام بہت زیادہ ہے اور تنخواہ بہت کم ہے" میں یہ سن کر حیران ہوا کہ اس شخص کو اس کام کی تنخواہ ملتی ہے؟

بے حیائی

ایک بزرگ مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے' ان کا چہرہ بہت روشن تھا وہ اپنی داڑھی' وضع قطع اور روشن چہرے سے مجھے یسوع مسیح کی شبیہ کی طرح لگے' میں انہیں دلی احترام سے ملا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "سنا ہے آپ کے ملک میں بے حیائی بہت ہے؟" میں ان کا سوال نہ سمجھ سکا' وہ میری مشکل بھانپ گئے' انہوں نے "بے حیائی" کے لفظ کی تشریح کی بال آخر میں سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ ہمارے ہاں پائی جانے والی عریانیت کی طرف ہے' مگر عریانیت تو عریانیت ہے۔ یہ "بے حیائی" تو نہیں ہے۔ ہمارے ہاں "بے حیائی" وقت پر نہ پہنچنا وعدہ پورا نہ کرنا' جھوٹ بولنا' اپنے کام سے بد دیانتی کرنا وغیرہ سمجھا جاتا ہے۔

یہاں بے حیائی کا مطلب صرف کم لباسی ہے' غالباً باقی سارے کام "حیا" کے دائرے میں آتے ہوں گے۔ یہ حیا کا لفظ میں نے بار بار کوما میں اس لئے لکھا ہے کہ "غیرت" کی طرح یہ لفظ بھی ہماری ڈکشنری میں نہیں ہے چنانچہ میں نے اس کے معنی پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے "حیا" کا لفظ ڈائری میں اردو ہی میں لکھا!

نفسیاتی مسئلہ

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھ سے تقریباً ہر شخص یہ سوال کرتا تھا اور میرے مختصر جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص میری زبان سے اس کی تفصیل سننا چاہتا تھا' میں نے ابھی جن بزرگ کا ذکر کیا ہے بھی مجھ سے اس کی تفصیل سننے کے لئے بہت بے قرار تھے' میں نے ایک دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا ''کوئی خاص وجہ نہیں'' یہ سب ٹھرکی لوگ ہیں۔ صرف چسکے لینا چاہتے ہیں۔''

مجھے لفظ ٹھرکی کی سمجھ نہ آئی میرے دوست نے اس کا ترجمہ DIRTY OLD MAN کیا جو ہمارے ہاں انہی معنوں میں رائج ہے۔ تاہم میری تسلی نہیں ہوئی' کیونکہ اس نوع کی گفتگو سے چسکے لینے والوں میں بوڑھے ہی نہیں جوان لڑکے بھی شامل تھے۔ یقیناً یہ قوم اس سلسلے میں کسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہے!

درویش صفت سائنس دان

مجھے پاکستان میں ایک چیز نے بہت متاثر کیا اور وہ یہ کہ ہماری لیبارٹریاں کھربوں ڈالر کی لاگت سے گذشتہ برس ہا برس سے ریسرچ کر رہی ہیں مگر ابھی تک کینسر' شوگر' بلڈ پریشر' ایڈز اور اس نوع کی دوسری موذی بیماریوں کا کوئی مستقل علاج دریافت نہیں کر سکیں۔ جب کہ پاکستان میں ان تمام بیماریوں کا جڑ سے خاتمہ کرنے کی ادویات ایجاد کی جا چکی ہیں اور یہاں مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ جس کا ثبوت اخبارات میں شائع ہونے والے بڑے بڑے اشتہارات ہیں ان کی اشاعت سے مالکان اخبار کا دال دلیہ تو ہو جاتا ہے مگر استعمال کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ان ادویات کے موجد سائنس دان بڑے درویش صفت لوگ ہیں اور انہیں دولت کی کوئی طمع نہیں ہے ورنہ اگر یہ کسی ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی سے بات کریں تو دنوں میں کھرب پتی ہو جائیں مگر ان میں سے بعض تو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کینسر اور ایڈز کی جڑ مارنے والی دوائیں چند ٹکوں میں فروخت کرتے ہیں۔

منکسر المزاج سکالر

پاکستان میں صرف درویش صفت سائنس دان ہی نہیں نہایت بے نیاز اور منکسر المزاج سکالر بھی موجود ہیں۔ ڈارون' ہیگل' مارکس' فرائڈ' نیوٹن' آئن سٹائن' اور دوسرے مغربی مفکرین نے برس ہا برس کے غور و فکر کے بعد ہزار ہا صفحات میں اپنی تھیوریاں بیان کی ہیں لیکن یہاں ان مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا مسکت جواب ایک دو جملوں میں دینے والے لوگ موجود ہیں جس پر مجمع عش عش کر اٹھتا ہے۔ یہ بات میرے ایک پاکستانی دوست نے بتائی۔ اس ضمن میں تھوڑا سا تجربہ مجھے بھی ہوا' ایک صاحب میرے پاس آئے' ان کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ ٹرک ڈرائیور ہیں مگر بڑے عالم انسان ہیں۔ انہوں نے سولہ صفحے کا ایک پمفلٹ مجھے

عنائت کیا (جو اردو زبان میں تھا) اور کہا ''اس میں آپ کے تمام مفکرین کے گمراہ کن فلسفوں کے جواب موجود ہیں۔ کبھی موقع ملے تو کسی سے ترجمہ کروا کر اسے پڑھیں'' یقیناً میں ایسا کروں گا!

◆◆◆

جذباتیت

اپنے بارے میں جو بات میں بتانے والا ہوں' اس سے میرا مقصد نہ تو اپنی بڑائی بیان کرنا ہے اور نہ اپنی کسی بڑائی سے آپ کو آگاہ کرنا ہے بلکہ وہ محض میرے کردار کے ایک جزو کا بیان ہے' جس سے میں بہت تنگ ہوں لیکن اپنے اس انداز زندگی سے جان اس لئے نہیں چھڑا سکتا کہ انسان فطری رویوں میں چھوٹی موٹی ترامیم تو کر سکتا ہے۔ انہیں مکمل طور پر تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور اس لحاظ سے میں خود کو مجبور پاتا ہوں؟

میں دراصل پاکستان کے بارے میں انتہائی جذباتی واقع ہوا ہوں' زندگی میں اس حوالے سے میں نے جتنے فیصلے کئے ہیں ان میں بیشتر پاکستان سے محبت کے حوالے سے ہیں اور اس نوع کے فیصلے کرتے وقت میں نے کبھی نہیں سوچا کہ فلاں فیصلہ میرے نقصان میں جائے گا یا اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ ایوب خان (طالب علمی کے زمانے میں) یحییٰ خان' ذوالفقار علی بھٹو' جنرل ضیاء الحق' میاں نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کا پہلا دور اور اب جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے دوران میں نے جو رویہ اپنایا' اس میں سراسر نقصان ہی نظر آتا تھا اور نظر آتا ہے لیکن کسی فائدے کے لئے اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا۔ انڈیا کے ساتھ ایک بہترین ہمسائے ایسے تعلقات کا حامی ہوں مگر جب کبھی ادبی سیمینار یا مشاعرہ میں شرکت کے لئے انڈیا گیا' میں نے وہاں مراثی اور بے غیرت دانشوروں کے دوران' بھارت میں لعنتی قسم کی مقبولیت حاصل کرنے والوں کے لئے دوقومی نظریے کے خلاف بات کرنا تو کجا' انٹرویو لینے والے کے منہ پر اس واہیات بات کی دھجیاں بکھیر دیں' چنانچہ چار سال تک انڈیا میں میرے داخلے پر حکومت ہند نے پابندی عائد کر دی کہ جب تک بھارت کشمیری اور بھارتی مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے خلاف رویئے میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا' میں انڈیا نہیں جاؤں گا' چنانچہ اس دوران کتنے ہی دعوت نامے موصول ہوئے' میرا دل بھی بہت چاہتا ہے کہ اپنے انڈین ادیبوں سے اور دانشور دوستوں سے ملاقات کروں لیکن اپنی یہ خواہش دبائے بیٹھا ہوں!

میں معذرت چاہتا ہوں کہ مجھے ان کالموں میں اپنے بارے میں بات کرنا پڑی لیکن ایسا میں نے ایک ضرورت کے تحت کیا۔ گذشتہ دنوں کلنٹن پاکستان کے دورے پر آئے تو پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے ان سے ملاقات کے دوران ایک خودمختار اور غیور قوم کے فرد کا کردار ادا کرتے ہوئے ان سے کسی قسم کی ڈکٹیشن لینے سے انکار کر دیا۔ سارے پریس نے ان کے

اس رویئے کو سراہا۔ میرے جیسا ایک جذباتی پاکستانی جو حالانکہ جنرل صاحب کو پاکستان کا قانونی حکمران تسلیم نہیں کرتا' ان کے اس دلیرانہ موقف پر بے انتہا خوش ہوا' اس رویئے سے جنرل صاحب کو اگر ذاتی طور پر کوئی نقصان پہنچ رہا ہوتا تو وہ مجھے اپنے بہت نزدیک محسوس ہوتے کہ انہوں نے ذاتی نقصان کی پرواہ کئے بغیر وہی رویہ اپنایا جو ایک سچے پاکستانی کو اپنانا چاہیے تھا' لیکن میں اپنی تمام تر مسرت کے باوجود اور جنرل صاحب کے اس رویئے کو سراہنے کے باوصف ذہن میں کچھ سوال رکھتا ہوں اور پاکستان سے محبت کا تقاضا ہے کہ ان سوالوں سے ہم آنکھیں نہ چرائیں' جن سے آنکھیں چرانے کو جی چاہتا ہو۔

صدر کلنٹن جاتے جاتے تقریباً اس طرح کی بات کہہ گئے کہ اگر پاکستان نے اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ دنیا میں تنہا رہ جائے گا اور اگلے دن بھارتی فوج کے چیف کا یہ اعلان سامنے آیا کہ پاکستان محدود جنگ کے لئے تیار ہو جائے۔ اب اس ضمن میں چند سوال یہ ہیں۔

کیا پاکستان جنگ کے لئے تیار ہے؟

ہمارے پاس اسلحہ کے کتنے ذخائر ہیں اور وہ کتنے دنوں کے لئے ہیں؟

کیا ہماری معیشت کے دوران کوئی نازک مقام آتا ہے تو کوئی دوست ملک ہماری مدد کو پہنچے گا؟

کیا انڈیا' اسرائیل' امریکہ اور ان کے حواری ملکوں کا اکیلا پاکستان سامنا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے؟

کیا ہماری فوج جس نے ٹرانسفروں' تبادلوں' اور بھل صفائی کا کام سنبھالا ہوا ہے' محاذ جنگ پر پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتی ہے؟

کیا سیاسی محاذ آرائی کی موجودہ صورت حال میں پاکستان انڈیا کے ساتھ جنگ افورڈ کر سکتا ہے؟

کیا پاکستان کا سرمایہ دار طبقہ اور بے پناہ پریشانیوں کے شکار عام پاکستانی کسی جنگ کے لئے ذہنی طور پر تیار ہیں؟

کیا قوم میں اس وقت وہ اتحاد اور وہ جذبہ موجود ہے جو محاذ جنگ پر اپنی جانیں قربان کرنے والے فوجیوں کو حوصلہ اور توانائی بخشتا ہے؟

انڈیا اگر ہمارے ساتھ جنگ کرنے پر تل ہی جائے تو پھر ان سوالوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جو میں نے اوپر کی سطور میں درج کئے ہیں کہ بقول فیصل ہاشمی:

ہار جانے کے لئے جنگ ضروری تو نہیں
بعض اوقات امن بھی انساں کو ہرا دیتا ہے

لیکن ہم اگر بڑھک کے طور پر نہیں سچ مچ خودمختار قوم کے طور پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے مندرجہ بالا سوالات کی روشنی میں اپنی ساری کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مسئلہ پاکستان کی بقاء اور سلامتی کا ہے' اسے مفروضوں اور جذباتی نعروں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا' کارگل ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے۔

◆◆◆

اہم لوگ!

پروفیسروں کے متعلق بہت سے لطائف مشہور ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق ان کی مخبوط الحواسی سے ہے' مگر میرے دوستوں میں ایک پروفیسر صاحب ایسے بھی ہیں' جن کے متعلق کچھ بیان کرنے کے لئے لطائف کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن میں ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا مگر دوران گفتگو میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر صاحب میری طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہیں' بار بار گھڑی دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا ''کیا مسئلہ ہے پروفیسر صاحب! آپ بہت بے چین نظر آ رہے ہیں؟'' اس پر انہوں نے ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھی اور کہا عطاء الحق قاسمی صاحب نے گیارہ بجے آنا تھا' پونے بارہ ہو گئے ہیں' ابھی تک نہیں آئے۔''

انہی پروفیسر صاحب کے اور بھی بہت سے قصے ہیں مگر میں چونکہ ان کا عینی شاہد نہیں لہٰذا ان قصوں کو پورے یقین سے آپ کو نہیں سنا سکتا' لیکن جو واقعہ میں نے ابھی بیان کیا ہے اس سے متذکرہ پروفیسر صاحب کی صرف مخبوط الحواسی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس حوالے سے میرا دھیان کچھ اور لوگوں کی طرف بھی چلا جاتا ہے مثلاً ہمارے ہاں جو لوگ معاشرے میں اہم ہوتے ہیں یا کسی وجہ سے اہم ہو جاتے ہیں' ان کی بصارت' اہمیت کی حامل اس کرسی پر بیٹھتے ہی چلی جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک مشہور مصنف سے کسی محفل میں میری ملاقات ہوئی۔ ایک دوست نے ان سے میرا تعارف کرایا تو بولے آپ تو شاید کسی اخبار میں کچھ لکھتے لکھاتے بھی ہیں۔ میں نے کہا ''جی ہاں اس اخبار کا نام نوائے وقت ہے۔ اور بتیس سال میں کالم لکھ رہا ہوں۔ کیا آپ بھی کچھ لکھتے ہیں یا آپ کو صرف پڑھنے وڑھنے کا شوق ہے۔''

انہی کی طرح کے ایک اور صاحب نے دوران ملاقات مجھے اپنا جو پوسٹل ایڈریس دیا' وہ یہ تھا ''مرزا جاوید بیگ..... راولپنڈی'' انہوں نے جواباً مجھ سے ایڈریس مانگا میں نے چٹ پر یہ ایڈریس لکھ کر دیا ''عطاء الحق قاسمی..... پاکستان'' میں تو ''پاکستان'' کی بجائے ''ایشیا'' لکھنا چاہتا تھا مگر پھر سوچا بیچارے ڈاکئے کو خواہ مخواہ تھوڑی زحمت اٹھانی پڑے گی!

اس نوع کے تجربات بیوروکریسی کے بعض افراد ملتے ہوئے بھی اکثر لوگوں کو پیش آتے ہیں۔ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لئے اپنے پرانے دوستوں کو نہیں بسا اوقات خونی رشتوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ ایک صاحب کے متعلق شنید ہے کہ ان کے غریب باپ نے جو کسی دفتر میں نائب قاصد تھا' اپنا پیٹ کاٹ کر اور مانگ تانگ کر اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی' بیٹا ذہین تھا' تعلیم کے بعد سی ایس

ایس کے امتحان میں بیٹھا تو کامیاب ہو گیا۔ اور پھر ایک دن ترقی کرتے ہوئے کمشنر بن گیا۔ ایک روز وہ اپنے بیوروکریٹ دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا گپ شپ میں مشغول تھا کہ اس کے والد' جنہیں ہدایت تھی کہ وہ اس کے دوستوں کے سامنے نہ آیا کریں' غلطی سے دھوتی اور قمیض میں ملبوس کمرے میں داخل ہوئے۔ کمشنر صاحب نے والد کو دیکھا تو گھبرا گئے' تاہم فوراً حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے دوستوں سے تعارف کرایا "یہ بزرگ میرے والد صاحب کے دوست ہیں" والد صاحب پتہ نہیں کب سے اپنے اس سپوت سے جلے بھنے بیٹھے تھے۔ فوراً بولے "صاحب زادے کو غلط فہمی ہوئی ہے میں ان کے والد کا دوست نہیں ان کی والدہ کا دوست ہوں"

ہمارے حکمرانوں کا بھی یہی حال ہے' وہ ووٹ کے لئے لوگوں کے سامنے گھگھیاتے نظر آتے ہیں اور جب ووٹوں کے صدقے میں انہیں اقتدار ملتا ہے تو وہ عوام سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اقتدار میں آنے کا ایک طریقہ ایسا بھی ہے جس کے لئے عوام کو ووٹ کی زحمت ہی نہیں دینا پڑتی چنانچہ اس نوع کے صاحبان اقتدار پر عوام سے آنکھیں پھیرنے کا الزام عائد ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بس جب یہ جاتے ہیں تو عوام کا ایک بازو کٹ چکا ہوتا ہے۔ یا کوئی اور معذوری انہیں اپنی لپیٹ میں لی چکی ہوتی ہے!

عالمی اداروں کا بھی یہی حال ہے' جتنے اہم عالمی ادارے ہیں' انہیں اپنی مرضی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا' یعنی وہ صرف وہی کچھ دیکھتے ہیں جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یو این او نے کشمیر پر قراردادیں پاس کی تھیں' انڈیا نے ان قراردادوں کو "پاس" کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ان یو این او کو کشمیر کہیں نظر نہیں آتا اور انڈیا کو جتنا نظر آتا ہے' وہ اسے کشمیریوں سمیت مٹا دینے پر تلا ہوا ہے۔ چنانچہ میری نظر تو جس طرف اٹھتی ہے مجھے وہ اپنے پروفیسر دوست ہی گھڑی دیکھتے اور بے چینی سے ٹہلنے کے دوران اپنے سامنے بیٹھے ہوئے عطاء الحق قاسمی سے یہ کہتے نظر آتے ہیں "عطاء الحق قاسمی نے گیارہ بجے آنا تھا' پونے بارہ ہو گئے ہیں' ابھی تک آئے نہیں!"

◆◆◆

دولہا، دلہن اور بھکشو

بعض خبریں اپنی نوعیت میں بہت عجیب وغریب ہوتی ہیں' اس طرح کی خبر چند روز قبل اخبارات میں شائع ہوئی جس کے مطابق ایک دولہا نے ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے اپنی دلہن کی پٹائی کر دی۔ اور اس کے ساتھ ہی طلاق کا اعلان کر دیا مگر دونوں طرف کے بزرگوں نے سات گھنٹوں کے طویل مذاکرات کے بعد معاملہ رفع دفع کرا دیا اور دولہا اپنی نئی نویلی پٹائی شدہ دلہن کو لے کر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

دلہن کی پٹائی کی جو وجہ اخبار میں بیان کی گئی ہے وہ یہ تھی کہ دلہن کو اس کا کزن گود میں اٹھا کر ڈولی میں بٹھانے کے لئے ڈولی کی طرف بڑھا تو اس پر دولہا طیش میں آ گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی دلہن پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ آپ اوپر کی سطور میں پڑھ چکے ہیں۔

مجھے یہ خبر اس لئے عجیب وغریب لگی کہ خبر میں دلہن کو گود میں اٹھا کر اس کے کزن کے ڈولی میں بٹھانے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی' چنانچہ مجھے اپنی طرف سے اس سلسلے میں کچھ مفروضات بیان کرنا پڑیں گی مثلاً یہ کہ ممکن ہے کہ پنجاب کے کچھ علاقوں میں یہ رسم ہو کہ بھائی' دلہن کو گود میں اٹھا کر ڈولی میں بٹھاتا ہو اور متذکرہ دلہن کا کوئی سگا بھائی نہ ہو اور اس کا کزن ہی اس کے سگے بھائیوں کی طرح ہو' اگرچہ شرعی طور پر کزن کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ اعمال کا تعین نیتوں پر بھی کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دلہن کا وزن زیادہ ہو اور اس کا سگا بھائی سنگل پسلی کا ہو اور یوں کزن سے صرف ''پانڈی'' کا کام لیا گیا ہو۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ دلہن کے پاؤں میں کوئی خرابی ہو اور وہ چلنے سے معزور ہو اور سگے بھائی کی عدم موجودگی یا اس کے دبلے پتلے ہونے یا نہایت کم عمر ہونے کی وجہ سے دلہن کو ڈولی تک پہنچانے کی ذمہ داری اس کے کزن پر ڈالی گئی ہو کیونکہ میرج ہال بننے سے پہلے ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر مہمانوں کو خوش آمدید کہنا' کھانا لگانا' دیگ پر بیٹھ کر کھانا ''ورتانا'' شامیانے لگانا' کراکری کا انتظام کرنا اور اس طرح کے دوسرے کاموں کے لئے کزن اور دلہن کے رشتے داروں کی ڈیوٹیاں لگائی جاتی تھیں' یہ شادی چونکہ ایک قصبے میں ہو رہی تھی جہاں میرج ہال نہیں تھا' لہٰذا ممکن ہے کزن کی ڈیوٹی مندرجہ بالا وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی بناء پر دلہن کو ڈولی میں بٹھانے پر لگی ہو مگر دولہا سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور انہوں نے وہیں اپنی دلہن کی پٹائی شروع کر دی۔ یہاں ایک دفعہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلہا نے دلہن کی پٹائی کیوں کی' دلہن بیچاری تو اس روز دوسروں کے رحم وکرم پر ہوتی ہے' اسے تو رونے کے علاوہ کسی بات کی اجازت ہی نہیں ہوتی اس کی

کوئی وجہ میرے ذہن میں نہیں آ رہی' سوا اس کے کہ دولہا پٹائی تو دلہن کے کزن کی کرنا چاہتا ہو مگر کزن کا ڈیل ڈول ایسا ہو کہ دولہا نے اس سے متھا لگانا مناسب نہ سمجھا ہو۔

میں اس واقعہ کا عینی شاہد تو نہیں ہوں مگر اس کے باوجود پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دولہا نے جو حرکت کی' وہ سراسر ''میل شاووزم'' (Male Chauvinisim) کے ذیل میں آتی ہے' جو کزن اپنے ہاتھوں سے دلہن کو ''غیر'' کے گھر پہنچانے کے لئے ڈولی میں بٹھائے' اس معصوم پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص شکی مزاج ہے تو بھی اسے کسی بے بس لڑکی کو جو چند لمحے پہلے اس کی بیوی بنی ہے' جس کے ذہن میں آنے والی گھڑیوں کے حسین خواب ہیں اسے اس کے خاندان سمیت بھری بارات کے سامنے ذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ میں اس واقعہ کا عینی شاہد نہیں ہوں مگر اپنے معاشرے میں پائی جانے والی ''میل شاووزم'' کے حوالے سے مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس ذلت پر بجائے اس کے دولہا کو چھتر مار کر بارات واپس بھیج دی جاتی' الٹا لڑکی کے والدین اور رشتہ داروں نے ہاتھ جوڑ کر لڑکے والوں کے پاؤں میں گر کر معافیاں مانگی ہوں گی۔ ہماری بچیاں اور خصوصاً ان کے والدین کتنے مجبور ہیں کہ اس شخص کے ساتھ اپنی بچی کو رخصت کر دیتے ہیں' جس نے پہلے ہی روز ثابت کر دیا ہو کہ وہ اس اعتماد کا مستحق نہیں ہے۔ آخر میں دولہا میاں اور دوسرے ایسے بہت سے دوستوں کے لئے ایک حکایت جو عورت اور مرد کے سرسری تعلقات کو بھی عجیب و غریب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ دو بھکشو سالہا سال سے ایک دریا کے کنارے دھیان گیان میں مشغول رہتے تھے' ایک روز ایک خوبصورت لڑکی دریا پار کرنے لگی تو پانی میں اتر کر اسے اندازہ ہوا کہ پانی اس کے قد سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے کہ اس اثناء میں ایک بھکشو اٹھا اور اسے گود میں اٹھا کر دوسرے کنارے پر چھوڑ آیا اور واپس آ کر دوبارہ گیان دھیان میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بھکشو نے اسے مخاطب کیا اور کہا ''تم سالہا سال سے عبادت کر رہے تھے' مگر تم نے ایک لڑکی کو گود میں اٹھا کر اپنی ساری ریاضت پر پانی پھیر دیا'' یہ سن کر پہلے بھکشو نے حیرت سے کہا ''میں تو اس لڑکی کو دوسرے کنارے پر چھوڑ کر واپس بھی آ گیا ہوں' مگر تم ابھی تک وہیں ہو؟''

◆◆◆

جہادی تنظیمیں

پاکستان میں اس وقت مختلف دینی تنظیمیں مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہیں' کچھ تنظیموں کا کام محض تبلیغی نوعیت کا ہے کچھ ملکی سیاست سے وابستہ ہیں اور کچھ نے خود کو جہاد کے لیے وقف کیا ہوا ہے' ان کے کسی عمل یا کسی قول سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے وابستہ افراد ان لوگوں سے یقیناً بہتر ہیں جن کی زندگی کا مشن کھانے پینے' سونے اور کمانے کے علاوہ کچھ نہیں۔

میرا روئے سخن آج ان دینی تنظیموں کی طرف ہے جو عملی طور پر جہاد میں شریک ہیں' ان کا یہ جہاد مظلوم کشمیری مسلمان اور ان کے حق خودارادیت کے لئے ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ بھارتی اور مغربی استعمار کو بھی للکارتی رہتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ دونوں استعمار اور ان کا میڈیا پاکستان پر دہشت گردی کا الزام لگاتا ہے اور بیرون ملک پاکستان کا امیج ایک مذہبی جنونی کے طور پر پیش کر کے پاکستان کو دنیا میں تنہا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے بہترین دوست ترکی کے وزیر اعظم نے بھارت میں یہ بیان دیا ہے کہ بھارت اور ترکی دونوں ممالک سرحد پار ہونے والی دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں پاکستان کے بہترین دوست کے اس بیان کی ذمہ داری' خدا جانے موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر عائد ہوتی ہے یا اس کی ذمہ داری وزارت خارجہ ہے یا جہادی تنظیموں کی حکمت عملی میں کوئی خامی ہے کہ ہم اپنے ترکی ایسے دوستوں کو بھی اپنے موقف کا قائل کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔

پوری دنیا میں ایک مسلمہ کلیہ ہے اور وہ یہ کہ کسی عمل کے اچھے یا برے ہونے کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اسے اس عمل سے برآمد ہونے نتیجہ پر پرکھا جاتا ہے چنانچہ اس ضمن میں انگریزی کا محاورا

ALL IS WELL THAT ENDS WELL

بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر نتیجہ اچھا نکلا ہو تو پھر سب کچھ ہضم ہو جاتا ہے۔ اچھے نتیجے کے لئے صرف اچھا کام کافی نہیں بلکہ اس کے لئے حکمت عملی اور اس کی ٹائمنگ سب سے زیادہ اہم ہیں اگر کوئی کام وقت سے پہلے یا وقت کے بعد کیا جائے تو وہ لاکھ اچھا ہو مگر اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلیں گے۔

اس سلسلہ کی سب سے اہم مثال 1857ء کی جنگ آزادی ہے۔ تاجروں کے روپ میں ہندوستان میں داخل ہونے والے

انگریز' زوال پذیر مغلیہ سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا خزانہ خالی اوران کی بیاض غزلوں سے بھری ہوئی ہے۔ شہنشاہ معظم انگریز کو لکھ کر دے چکے ہیں کہ ان کے بعد ان کا بیٹا شہنشاہ کے ٹائٹل کا حقدار نہیں ہوگا بلکہ اسے صرف وظیفہ ملے گا۔ اس دوران انگریز کی سخت گیری سے تنگ اور بعض مذہبی وجوہ کی بناء کچھ رجمنٹس انگریز کے خلاف جدوجہد آزادی کا آغاز کرتی ہے۔ کچھ والیان ریاست بھی ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ علمائے کرام بھی آزادی کی اس جنگ میں اپنا ناقابل فراموش کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدین دلی پر قبضہ کر لیتے ہیں اوران کا قبضہ چھ ماہ تک برقرار رہتا ہے' مگر چونکہ ملکی خزانہ خالی تھا' چنانچہ مجاہدین تو کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ہتھیاروں سے مسلح لوٹ مار کرنے والے عناصر دلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ اس دوران انگریز اپنے ساتھ سکھوں اور مرہٹوں کو ملا کر مجاہدین کے خلاف کاروائی کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ وہ دلی پر دوبارہ قابض ہو جاتے ہیں بلکہ وہ پورے ہندوستان پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت' جو اگرچہ برائے نام رہ گئی تھی' کا بھی مکمل طور پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انگریز مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں اور واجد علی شاہ کو کلکتہ میں قید کر دیتے ہیں اور یہ دونوں فرنگی کی قید میں انتقال کر جاتے ہیں' بخت خان اور جھانسی کی رانی انگریز کے خلاف لڑتے ہوئے مارے جاتے ہیں اور پھر ہندوستان کو ایک باقاعدہ غلام ملک کی حیثیت سے سلطنت برطانیہ کی عملداری میں دے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آزادی کے پروانوں خصوصاً مسلمانوں پر جو قیامت گزرتی ہے انگریز کی تاریخ اس سے اپنا منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ برصغیر سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے' ہندوستان کے سلطنت برطانیہ کی عملداری میں جانے اور اس کے بعد آزادی کی منزل ڈیڑھ سو سال دور چلے جانے کی وجہ سے مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ جدوجہد آزادی وقت سے پہلے شروع کر دی گئی تھی' اس کے لئے مکمل تیاری موجود نہیں تھی سلطنت مغلیہ کی سیاسی اور معاشی حالت اتنی کمزور تھی کہ وہ عملی طور پر مجاہدین کے لئے کچھ نہ کر سکتی تھی اور عوام جو غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہے تھے' اس جہاد کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے اور نہ ہی انہیں اس کے لئے تیار کرنے کی کوئی سائنسی کوشش کی گئی تھی' چنانچہ استعمار کے خلاف ایک ابال تھا جو اٹھا اور ختم ہو گیا مگر اس کا نتیجہ مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ سلطنت کے خاتمہ اور ہندوستان کے استعمار کے ہاتھ مزید ڈیڑھ سو سال تک مضبوط کرنے کی صورت میں نکلا!

جہادی تنظیموں سے میری گذارش ہے کہ وہ پورے غور و فکر کے ساتھ اپنی حکمت عملی کا جائزہ لیں اور اگر وہ اس کی ضرورت سمجھیں تو مغلیہ سلطنت کے آخری دور اور پاکستان کی موجودہ سیاسی' معاشی اور بین الاقوامی صورت حال کے موازنے کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا لائحہ عمل مرتب کریں کیونکہ اچھے سے اچھے عمل کو بھی اس کے نتیجے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

◆◆◆

بھٹو کی برسی

پیپلز پارٹی آج (۴ اپریل) پورے پاکستان میں سابق وزیر اعظم پاکستان اور سیاسی رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی ۲۱ ویں برسی منا رہی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب سیاسی حکومت کا خاتمہ کر کے مارشل لاء نافذ کیا تھا اور پھر ان پر قتل کا مقدمہ دائر کیا گیا جس پر عدالت نے انہیں پھانسی کی سزا سنائی تھی جو اگرچہ متفقہ نہیں تھی مگر اس سزا پر عملدرآمد کیا گیا اور بھٹو کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا!

بھٹو ۲۱ ویں برسی صرف پیپلز پارٹی والے منائیں گے' ان تقریبات میں کوئی اور سیاسی جماعت شریک نہیں ہوں گی' کیونکہ سیاست دان ہی سیاستدان کا دشمن ہے یوں بھی بھٹو کی منتخب سیاسی حکومت کے خاتمے اور اس کی جگہ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت لانے میں سیاسی جماعتوں ہی نے اہم کردار ادا کیا تھا انہوں نے ہی مخالف سیاسی لیڈروں کی میٹنگ میں کہا تھا مارشل لا آتا ہے تو آئے بھٹو تو جائے گا بلکہ جناب اصغر خاں نے تو بھٹو کو کوہالہ کے پل پر پھانسی دینے کی تجویز پیش کی تھی اور ایک سیاست دان نے جنرل ضیاء سے وہ تاریخی قلم اپنے لئے سوغات کے طور پر حاصل کیا تھا جس سے جنرل صاحب نے بھٹو کی پھانسی کی سزا پر عملدرآمد کے لئے دستخط کئے تھے' بھٹو کی موت پر خوش ہونے والوں میں وہ مذہبی لوگ اور جماعتیں بھی شامل تھیں جو بھٹو کے شراب نوشی پر پابندی' اتوار کی بجائے جمعے کی چھٹی اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے وغیرہ کے فیصلے کو سراہتیں تھیں' چنانچہ آج یہ برسی صرف پیپلز پارٹی والے منائیں گے کیونکہ پھانسی چڑھنے والا سیاسی لیڈر جس جماعت کا ہو' اس کا سوگ بھی صرف وہی سیاسی جماعت مناتی ہے۔ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' ایک بہترین پالیسی ہے جس کے بہترین نتائج ہر دور میں سامنے آتے ہیں!

اس سطور سے قارئین کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ بھٹو مرحوم نے اپنے دور میں جو فاشسٹ پالیسی اپنائی میں اس کا حامی تھا' میرے لئے تو بھٹو مرحوم کا وہ کردار خصوصاً قابل معافی ہے جو انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں ادا کیا..... مگر مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس شخص نے پاکستان ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی اور امریکہ اور مغربی ممالک کے دباؤ اور دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک اور منتخب وزیر اعظم میاں نواز شریف نے ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنایا' ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد کیا اور یہ سرسری اور رسمی سربراہ کانفرنس نہیں تھی' اس میں مشرق وسطیٰ کے ممالک نے تیل کو مغرب کے خلاف بطور

ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے تک پہنچنے میں شاہ فیصل شہید نے اہم کردار ادا کیا۔ بھٹو مرحوم نے پاکستان کو ۱۹۷۳ء کا آئین بھی دیا اور قوم کو ایک متفقہ آئین دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ امریکہ کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگا۔ ہنری کسنجر کے بقول بھٹو کو ''خوفناک انجام کی عبرت ناک مثال'' بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا' اس فیصلے پر عمل کی راہ بھٹو مرحوم نے اپنی داخلی پالیسیوں سے خود بھی ہموار کی' بال آخر ۱۴ اپریل کو وہ سانحہ وقوع پذیر ہوا جس نے اس ملک کے لاکھوں لوگوں کے دل زخمی کر دیئے' اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وقت نے ان زخموں کو مندمل کر دیا ہے تو وہ اکیس سال بعد بھی کبھی بھٹو کے حامیوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھے' ان میں سے کچھ تو اس طرح کے یا اس سے ملتے جلتے کسی اور سانحہ کے خواہش مند اور منتظر ہیں تا کہ اس ملک میں ان کے دکھ کو صحیح طور پر سمجھنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہوں اور یوں فوج کے خلاف نفرت عام کر دی جائے جسے اس کے سربراہ کے عمل کی وجہ سے اس سانحے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی یہ خواہش پوری ہوتی ہے تو یہ پاکستان کی بدقسمتی ہوگی' لیکن ان کی نیک بخت لیڈر کم سے کم اس حوالے سے اعلانیہ ایسی کسی خواہش کی مخالفت کر رہی ہے۔

بہر حال آج کا دن کسی بھی لحاظ سے کوئی اچھا دن نہیں ہے۔ اس روز اس کے حوالے سے اینٹی پاکستان طبقے کی طرف سے صرف ایک ادارے نہیں بلکہ بے شمار دلوں میں ملک کے خلاف نفرت کے بیج بونے کی کوشش کی گئی اور اس نفرت کو بیرونی دشمنوں نے مزید ہوا دینے کا کام پوری تندہی سے کیا اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ پاکستانی عوام اور پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے لئے آج کے دن کے حوالے سے صرف ایک سبق ہے اور وہ یہ کہ جس رہنما کو ہم اپنا مجرم سمجھیں' اسے اپنے ووٹوں سے سیاسی طور پر کیفر کردار تک پہنچائیں اور کسی بیرونی طاقت کو یہ حق نہ دیں کہ وہ ہمارے کسی رہنما کو سزا دینے کی جرات کرے کیونکہ یہ طاقتیں اس رہنما کو اس کے گناہوں کی نہیں اس کی نیکیوں کی سزا دیتی ہیں جو پاکستان کے حق میں اور ان طاقتوں کے خلاف جاتی ہیں!

◆◆◆

فیصلے کا انتظار

انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت کے جج جناب رحمت حسین جعفری پر اللہ کی بہت رحمت ہے کہ اس وقت پوری دنیا کی نظریں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہونا اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ تاہم ہر وقت خدا سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں دیکھے جانے والے کے لئے محبت اور احترام کے جذبات ہوں۔ محترم جج نے ۲ اپریل کو ''طیارہ سازش کیس'' کا فیصلہ سنانا ہے۔ کسی بے گناہ کو مجرم یا کسی گناہ گار کو بے گناہ قرار دیئے جانے کا خوف ہی ایسے شخص پر لرزہ طاری کر دیتا ہے' جسے خدا نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ذمہ داری سونپی ہو اور اسے اس ذمہ داری کے حوالے سے دنیا اور آخرت میں جواب دہی کا احساس بھی ہو۔ ملک کے چیف ایگزیکٹو اور ایک لحاظ سے مقدمے کے فریق جنرل پرویز مشرف بار بار ملکی پریس' غیر ملکی پریس اور بین الاقوامی رہنماؤں کے سامنے یہ بات کہہ چکے ہیں کہ پاکستان کی عدلیہ آزاد ہے چنانچہ طیارہ کیس کے فیصلے میں بھی حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوگی' یہ بیان جہاں بہت خوش آئند ہے اور اس سے جہاں جنرل صاحب کی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کسی سے انتقام لینے کے قائل نہیں ہیں' وہاں اس سے عدالت کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری عدالتیں گئے گزرے حالات میں بھی اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں! اسی مقدمے کے حوالے سے اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ جواریوں نے سزا یابریت کے حوالے سے جوئے کا کاروبار شروع کر دیا ہے' لوگ اس سفا کی پر بہت حیران ہوئے' لیکن میں حیران اس لئے نہیں ہوا کہ پاکستان کے قبرستانوں میں روزانہ اس بات پر جوا ہوتا ہے کہ اب جو لاش آئے گی وہ کسی عورت کی ہوگی یا مرد کی ہوگی؟ چنانچہ میں تو اپنے دوستوں کے سامنے یہ کہا کرتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں مختلف مذاہب کے اربوں پیروکار پائے جاتے ہیں تاہم سب سے زیادہ پیروکار جس مذہب کے ہیں' وہ مذہب پیسہ ہے اور اس مذہب زر کے ماننے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو بظاہر کسی دوسرے مذہب کے پیروکار ہیں کیونکہ جہاں پیسے کا سوال آتا ہے' بڑے بڑوں کا مذہب اور وطن وغیرہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے' کئی لوگ تو گولی کے سامنے ٹھہر جاتے ہیں' پیسے کے سامنے نہیں ٹھہر پاتے۔

میری اس بات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب سے طیارہ کیس کے فیصلے کی تاریخ کا اعلان ہوا ہے' ملک میں جو تھوڑی بہت سرمایہ

کاری ہورہی تھی' وہ بھی رک گئی ہے چنانچہ اب اس کیس کے فیصلے کا تعلق صرف انصاف سے نہیں رہا بلکہ ملکی معیشت کی بحالی یا مکمل بربادی کا انحصار بھی اس فیصلے پر ہے۔ صرف یہی ہیں بلکہ اس فیصلے کے اثرات ہمارے خارجی تعلقات اور بین الاقوامی برادری سے ہمارے آئندہ کے تعلقات پر بھی پڑیں گے جو بہت گہرے اور بہت دورس ہوتے جارہے ہیں!

میں جب یہ ساری باتیں سوچتا ہوں اور اپنے آپ کو جناب رحمت حسین جعفری کی جگہ رکھ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ نے ان کے کاندھوں پر کتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ اس کیس پر کسی ممکنہ فیصلے کے حوالے سے رائے زنی کو میں مناسب نہیں سمجھتا' محترم جج' استغاثہ اور صفائی کے بیانات کا جائزہ ابھی تک لے چکے ہوں گے اور اس حوالے سے وہ کسی فیصلے پر بھی پہنچے ہوں گے۔ ۱۴ اپریل کو عالمی پریس' غیر ملکی سفارت کار' بین الاقوامی رہنما' سرمایہ کار اور پاکستانی عوام سمیت پوری دنیا کے لوگوں کی نظریں فیصلے پر ہوں گی۔ محترم جج سے میری درخواست ہے کہ جب وہ حسب معمول عشاء یا فجر کی نماز سے فارغ ہوں تو ان لمحات کو اپنے بہترین استعمال میں لائیں' یہ وقت وہ ہوتا ہے جب خدا اپنے بندوں کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے چنانچہ ان لمحوں میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین فیصلے تک پہنچنے میں مدد فرمائیں ایسا فیصلہ جو حق انصاف پر مبنی ہو اور ملک اور قوم کے لئے خوشخبریاں لانے والا بھی ہو۔ ساری قوم ان کے ساتھ اس دعا میں شریک ہوگی!

◆◆◆

انصاف مرحوم!

آج انصاف مرحوم کی برسی ہے' انصاف مرحوم میرے استاد تھے' ان کا نام حکیم عبدالحکیم اور تخلص انصاف تھا' مرحوم بہت اچھے شاعر تھے اور بہت اچھے حکیم تھے' نہایت شریف النفس' با اخلاق' با حیا اور وضعدار قسم کے انسان تھے۔ آخری عمر میں ایک عفیفہ پر عاشق ہوئے مگر وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ہم شاگردوں کے سامنے کبھی اس کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ صرف جان کہتے تھے' جان سے آج یہ کہا' جان یہ کہتی تھی وغیرہ وغیرہ' آخری عمر کا عشق بہت برا ہوتا ہے چنانچہ انصاف مرحوم کے ساتھ بھی یہی ہوا اور اپنی جان سے محبت اس انتہا کو پہنچی کہ بال آخر اس دنیا سے رخصت ہو گئے!

استاد مکرم انصاف مرحوم بنیادی طور پر حکیم تھے اور یوں ان کا کام دکھی انسانیت کے دکھ دور کرنا تھا۔ اس سلسلے میں انصاف مرحوم کا اپنا طریق کار تھا' ان کے پاس اگر نزلے زکام کا بھی کوئی مریض آتا' تو پوری توجہ سے اسے دیکھتے' بڑے تحمل سے اس کی بات سنتے اور آخر میں کسی خطرناک بیماری کا اعلان کر کے اسے بتاتے کہ تم بچ نہیں سکتے' موت تمہارا مقدر بن چکی ہے مگر پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں شفا ہو جائے۔ ہم شاگردوں کو بھی جو صرف شاعری میں ان کے شاگرد تھے یہ ہدایت تھی کہ جب یہ مریض آیا کرے' تم بھی اس کی نبض دیکھ کر یہی کہا کرو کہ موت تمہارا مقدر بن چکی' خود ہمارے ذریعے اور مریض کے عزیز و اقربا کے ذریعے یہ بات پورے علاقے میں مشہور ہو جاتی کہ بس چند دنوں کا مہمان ہے' لیکن اچانک ایک دن استاد مرحوم مریض کو یہ خوشخبری سناتے کہ تم موت کے منہ سے نکل آئے ہو' جس پر مریض' اس کے لواحقین اور علاقے کے لوگ خدا کا شکر ادا کرتے اور انصاف مرحوم کی مسیحائی کے قائل ہو جاتے۔ ایک دن میں نے مرحوم سے پوچھا کہ آپ نزلے زکام کے مریضوں کی بھی موت کی وعید سنا دیتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا انہوں نے جو جواب دیا' وہ سن کر میں عش عش کر اٹھا اور میں نے محسوس کیا کہ انصاف مرحوم صرف حکمت نہیں' حکمت عملی کے بھی ماہر ہیں' انہوں نے فرمایا'' آج کے دور میں لوگ حکیموں کو وہ عزت نہیں دیتے جو کبھی ماضی میں معاشرہ انہیں دیتا تھا چنانچہ مریض کی موت دکھا کر آخر میں بخار پر راضی کرنے سے حکیموں کی عزت رفتہ رفتہ واپس آتی ہے' لہٰذا میں یہ کام طب مشرق کو دوبارہ اس کا مقام واپس دلانے کے لئے کرتا ہوں'' اللہ اللہ آج کل اتنے مشنری لوگ کہاں پائے جاتے ہیں جو اپنے پیشے کا عزت و احترام اور اس کا وقار بحال کرنے کے لئے اس درجہ کوشاں رہتے ہیں؟

انصاف مرحوم حکیم کے علاوہ بہت بلند شاعر بھی تھے' ان کی شاعری اور ان کی گفتگو بھی انصاف کے گرد گھومتی تھی' وہ کہا کرتے تھے کہ جس معاشرے سے انصاف اٹھ جائے' وہاں پر کوئی قدر باقی نہیں رہتی نیز وہ معاشرہ اور وہ بستی بال آخر تباہ ہو جاتی ہے' جہاں لوگوں کو انصاف نہ ملتا ہو۔ انصاف کے درجہ پر مبلغ ہونے کے باوجود وہ عدالتوں کا انتہائی احترام کرتے تھے' وہ ہم شاگردوں کو ہمیشہ تلقین کرتے کہ اپنی شاعری میں انصاف کی بات ضرور کرو لیکن کبھی اشارتاً بھی ایسی بات نہ کہو جس سے توہین عدالت کا پہلو نکلتا ہو' مثال کے طور پر وہ ہمیں یہ دو شعر سناتے۔

ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

عدل کی ہم کو توقع نہ دلاؤ کہ یہاں
قتل ہو جاتے ہیں زنجیر ہلانے والے

آج انصاف کی برسی ہے' مرحوم کی باتیں مجھے یاد آتی ہیں تو ان کی عظمت کا نقش دل پر مزید گہرا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سوچ کر میری آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں کہ آج ان کا خلا پر کرنے والا کوئی نہیں۔ یا خدا اس دنیا میں اتنے لوگ بستے ہیں' تم نے انصاف ہی کو ہمارے درمیان میں سے اٹھانا تھا؟ بہر حال اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے درجات بلند کرے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

◆◆◆

پاکستان زندہ باد

وہ ایک سیاسی نوجوان تھا۔لیکن جب وہ صبح سو کر اٹھا تو اخبارات دیکھتے ہی اس پر ڈپریشن سی طاری ہوگئی۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار چاہتا تھا لیکن اس کے لئے شہر کی فضا سازگار نہیں تھی۔ اگر اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع دیا جاتا تو شاید اس کی یہ کیفیت نہ ہوتی!

وہ دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اسے لگا کر اس کی ANXIETY اور ٹینشن (TENSION) میں مزید اضافہ ہو رہا ہے کہ بار بار ایک ہی خیال اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا' وہ اس خیال سے اور اس کیفیت سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا! وہ بستر پر سے اٹھا اور باہر گلی میں آ گیا۔ جہاں سبزی والے کا ریڑھا کھڑا تھا۔اور اس کی ہمسائی اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی اس سے سبزی خرید رہی تھی۔ اور عادتاً اس سے بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ سبزی والا بازار سے ارزاں نرخوں پر سبزی فروخت کرتا ہے۔ وہ کچھ آگے بڑھا تو پان سگریٹ کے کھوکھے کے پاس جا کر رک گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔مگر اس نے ایک سگریٹ خریدا اور سگریٹ سلگانے کے لئے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی سلگتی ہوئی رسی کے ساتھ اس سے سگریٹ کا اگلا سرا چپکا دیا۔ اور پھر لمبا سا کش لیا۔ اس سے سگریٹ تو سلگ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے کھانسی کا دورہ پڑا کہ وہ زندگی میں پہلی دفعہ سگریٹ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ باہر گلی سے نکل کر وہ سڑک پر آیا تو اسے نسیم کھسرا نظر آیا جو مٹک مٹک کر چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔نسیم نے شاید قلعی کرنے والے برش سے چہرے پر ڈھیروں پاؤڈر اور دوسری طرف الا بلا چیزیں تھوپی ہوئی تھیں۔ اس نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے گالوں پر چٹکی بھری اور کہا ''وے باؤ کدی ساڈھے ول وی ویخ لیا کر'' وہ نسیم کھسرے کی اس طرح کی حرکتوں سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔مگر اس روز اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

چوک میں بسم اللہ ریستوران کے دروازے تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور پھر بلا ارادہ اندر داخل ہو گیا۔ اسے بالکل بھوک نہیں لگی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ زبردستی کھانا کھانے کے بعد وہ باہر نکلا اور پھر بغیر کسی متعین منزل کے وہ بائیں طرف مڑ گیا۔ اس کی اینگزائٹی اور ٹینشن میں کمی واقع ہونے کی بجائے اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے لوگوں کے چہرے بھی مدھم مدھم نظر آ رہے تھے۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد ایک فالودہ کی دکان پر رک گیا جہاں ''المشہور فالودہ'' کا بورڈ لگا تھا نہ اسے بھوک تھی اور نہ اس کا جی فالودہ کھانے کو

چاہ رہا تھا۔لیکن اس نے ایک بڑا پیالہ فالودے کا لے لیا۔اور پھر اپنے کرتے سے منہ پونچھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ منہ اٹھائے یونہی چلتا جا رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ایک بڑا سا پتھر آ گیا جس سے وہ گرتے گرتے بچا' اس نے وہ پتھر ہاتھ میں اٹھایا۔اس کے دائیں جانب ایک ٹریول ایجنسی کا دفتر تھا جس کا دورازہ شیشے کا تھا۔اس کا جی چاہا کہ وہ یہ پتھر کھینچ کر دروازے پر مارے۔اس کا جی شیشہ ٹوٹنے کی چھنچھناہٹ سننے اور اس کی کرچیاں بکھرتے دیکھنے کو چاہتا تھا مگر اس نے اپنی خواہش پر قابو پایا اور اسے زمین پر واپس رکھ کر پورے زور سے اسے ٹھوکر ماری جس سے وہ لڑھکتا ہوا ایک کھلے ہول میں جا گرا۔

رستے میں ''اس'' کا گھر پڑتا تھا ''اس'' کی باتوں سے اس کے دل کے سارے بوجھ ہلکے ہو جاتے تھے۔وہ ''اس'' کے گھر میں داخل ہوا۔پہلے اس نے سوچا کہ وہ ''اس'' کے سامنے اپنا دل کا غبار نکالے تا کہ اس کیفیت سے نکل سکے۔مگر پھر اس نے سوچا کہ میرا چہرہ اسے کچھ نہیں بتاتا تو پھر زبان سے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔اس روز اس نے محسوس کیا کہ آج ''اس'' کے پاس اس کا چہرہ پڑھنے کا وقت نہیں کیونکہ ''اسے'' کہیں باہر جانا تھا..... وہ چپ چاپ باہر نکل آیا۔آج ''اس'' نے اسے اس طرح رکنے کو کہا بھی نہیں تھا' جس طرح کہنے سے وہ سب ضروری کام بھول جاتا تھا..... اس کے ذہنی کھچاؤ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اب اس پر وحشت سی طاری ہونے لگی تھی۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے پر پتھر کی ایک بھاری سل رکھ دی ہے۔اور اگر یہ سل نہ ہٹائی گئی تو اس کا سانس بند ہو جائے گا۔اس نے کھینچ کر سانس لینے کی کوشش کی مگر جیسے سانس اٹک اٹک کر آ رہا ہو۔وہ اپنی اس کیفیت سے گھبرا گیا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سے کیسے نکلے۔اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نعرہ لگایا ''پاکستان زندہ باد'' اس کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں نے حیرت سے اس دیوانے سے شخص کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے..... مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور اس ڈپریشن سے نکل آیا جو صبح سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔اس معصوم سے نوجوان کو جیسے تسلی ہو گئی کہ ایک نئی سیاسی صورت حال کے جنم لینے سے پاکستان کو درپیش خطرات کے حوالے سے جو خدشے صبح سے اسے ڈپریشن میں مبتلا کئے ہوئے تھے' وہ اس کے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگانے سے ٹل گئے ہیں۔اور اب اس کا پاکستان اغیار اور اپنوں کی سازش سے پوری طرح محفوظ ہو گیا ہے۔

◆◆◆

خون کا حساب

آج ایک اور پاکستانی' جس نے 1947ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا تھا' ترک وطن کا ارادہ کیا ہے۔ اتفاق سے یہ پاکستانی میرا دوست ہے' اس کے ذمے کوئی قرضہ نہیں ہے' یہ کسی مافیا کا رکن نہیں ہے' اس کا کسی قبضہ گروپ سے کوئی تعلق نہیں' اس نے کوئی فراڈ نہیں' کیا' یہ کسی رشوت والے محکمے میں ملازم نہیں تھا جہاں اس نے کروڑوں روپے بنائے ہوں' اس نے مختلف طریقوں سے لوگوں سے بھاری رقوم حاصل کر کے ہضم نہیں کیں' اس پر کوئی مقدمہ نہیں ہے' غرضیکہ اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے اسے ملک سے فرار ہونا پڑے۔ میرا یہ دوست غریب بھی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت خوشحال ہے' لہٰذا یہ اپنی غربت دور کرنے کے لیے بھی ترک وطن پر مجبور نہیں ہوا اور ترک وطن کرنے والا یہ دوست سیاسی کارکن یا دار نشور بھی نہیں ہے کہ اسے موجودہ ماحول میں دم گھٹتا محسوس ہوتا ہو' اسے شراب کی لت بھی نہیں ہے اور عورت بھی اس کی کمزوری نہیں ہے کہ اس کے ترک وطن کا مقصد مغرب کے آزاد ماحول میں زندگی بسر کرنا ہو' میرا یہ دوست ''ملحد'' یا ''بے دین'' بھی نہیں ہے کہ یہاں کے مذہبی ماحول سے نکل کر سیکولر ماحول میں جانا چاہتا ہو بلکہ پنج وقتہ نمازی اور اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے والا شخص ہے!

اس تفصیلی تعارف کے بعد آپ مجھ سے پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ پھر میرا دوست اس پاکستان سے اپنا اور خصوصاً اپنی آئندہ نسلوں کا ناتہ کیوں توڑ رہا ہے جو پاکستان اس نے اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے محفوظ معاشی اور روحانی تحفظ کے پیش نظر حاصل کیا تھا؟ یہ دونوں چیزیں کم از کم میرے دوست کو تو حاصل ہیں لیکن یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے' جتنا نظر آتا ہے۔ میرے دوست اور ان جیسے لاکھوں دوسرے لوگوں کے اس نوع کے فیصلے کے پیچھے بے شمار عوامل کارفرما ہیں جن پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے!

وطن عزیز میں صورتحال کچھ عجیب طرح کا رخ اختیار کر چکی ہے' امیر ہو یا غریب' ظالم ہو یا مظلوم اور حاکم ہو یا محکوم' ذہنی سکون اور تحفظ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ہم جب صبح اپنے گھروں سے نکلتے ہیں تو گھر والوں سے الوداعی ملاقات کر کے نکلتے ہیں کہ دو گروہوں کے تصادم کے دوران کسی اجنبی گولی کا نشانہ بن سکتے ہیں' کوئی دہشت گرد کلاشنکوف کا برسٹ مار سکتا ہے' کوئی ڈاکو اپنے مقصد کے حصول کے لیے جان لے سکتا ہے تاوان کے لیے بچہ اغوا کیا جا سکتا ہے' دن یا رات کے کسی لمحے میں عزتوں کے لٹیرے گھر میں گھس کر زندگیوں کو تاریک بنا سکتے ہیں' کسی ایجنسی کا کوئی اہلکار کسی کو بھی اٹھا کر لے جا سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ پھر اس کا سراغ

بھی ملے' اگر کسی ظلم کے خلاف شکایت کے لیے تھانے جانا پڑے تو وہاں انتظار میں بیٹھے قانونی ظالموں سے پالا پڑتا ہے' عدالت میں کوئی کام آن پڑے تو باقی زندگی ویران ہو کر رہ جاتی ہے' کسی بھی دفتر میں جائز کام کے لیے فائل کو پہیے لگانا پڑتے ہیں' گورنمنٹ کے خزانے میں پیسے جمع کرانے کے لیے دھوپ اور بارش میں گھنٹوں انتظار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے' ٹیلیفون' گیس اور بجلی وغیرہ کا بل پانچ سو روپے کی بجائے پچاس ہزار بھی آ سکتا ہے اور پھر اسے ٹھیک کرانے کے لئے واقفیت ڈھونڈنا پڑتی ہے''' دہاڑیاں'' توڑنا پڑتی ہیں اور اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں جو قدم قدم پر ہر پاکستانی کو پیش آتے ہیں' تو پھر جہاں انصاف نہ ہو' جہاں جان و مال کا تحفظ نہ ہو' جہاں عزت نفس محفوظ نہ ہو' جہاں بے روزگاری ہو' جہاں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے نہ ہوتے ہوں' جہاں غربت ہو' افلاس ہو' استحصال ہو' معاشی اور سیاسی عدم استحکام ہو' جہاں زندگی دفتروں کے چکر کاٹتے گزرتی ہو' وہاں ہماری حب الوطنی' اسلام دوستی اور ثقافتی قدروں کے واسطے کس کے ترک وطن کو روک سکتے ہیں؟

میں اپنے دوست کے پاکستان چھوڑنے پر اداس ہوں' ایک تو اس لئے کہ وہ مجھے بے حد عزیز ہے اور دوسرے اس لئے کہ میں ان پاکستانیوں میں سے ہوں جنہوں نے اپنا جینا مرنا اس ارض پاک سے وابستہ کر رکھا ہے اور میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو مایوس ہو کر راہ فرار حاصل کرنے کی بجائے یہیں رہتے ہوئے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور اس کے نتیجے میں پاکستان کو دنیا کا سب سے خوبصورت ملک بنانے کے حق میں ہیں۔ اگر ہم مایوس ہو گئے تو اس پاکستان کا کیا بنے گا' جو ہم نے بے شمار قربانیوں سے حاصل کیا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ جن قوتوں نے پاکستانی عوام کو پاکستان کے مستقبل سے مایوس کیا ہے اور مایوس کر رہی ہیں انہیں کھینچ کر عدالتوں میں لایا جائے' مایوسی کا یہ دور پاکستانی تاریخ میں 1971ء میں یعنی مشرقی پاکستان کی جدائی کے عمل سے شروع ہوتا ہے اور آج 2000ء میں اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ قوم کو قوم کے مستقبل سے مایوس کرنے والوں سے' جن میں ہر نوع کی قیادت سے ہر نوع کی صحافت تک کے سبھی مہرے شامل ہیں' قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کے خون کا حساب کون لے گا؟

◆◆◆

خواب مدینہ تعبیر کوفہ

آج دسویں محرم ہے' آٹھویں محرم کو اسلام آباد سے ایک دوست کا فون آیا' میں نے گفتگو کے دوران کہا ''میں جب بھی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں' مجھ پر گہری افسردگی طاری ہو جاتی ہے'' دوست نے جواب دیا۔ ''پہلے یہ تصحیح کر لو کہ یہ اسلامی تاریخ نہیں' مسلمانوں کی تاریخ ہے اور دوسرے یہ کہ دنیا کی کسی بھی قوم کی تاریخ ظلم' سفا کی اور بے حسی سے خالی نہیں اور یہ اس لئے کہ یہ شر' فساد اور خود غرضی انسان کی جبلت میں شامل ہے۔''

میرے دوست کی یہ بات درست تھی لیکن ہم تو بہترین امت ہیں' ہماری تاریخ میں یہ بے حسی کیسے در آئی کہ عبداللہ ابن زبیر کی لاش تین دن تک چوک میں لٹکی رہتی ہے اور لوگ حاکم وقت کے خوف سے' منہ دوسرے طرف پھیر کر' اس کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ وہ کیسے کلمہ گو تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کلام پاک کی تلاوت کے دوران شہید کر دیتے ہیں اور قرآن مجید حضرت عثمان کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو جاتا ہے۔ یزیدی فوج کا سپہ سالار شمر العین اور اس کی فوج بھی خود کو مسلمان کہلاتی تھی' مگر کربلا کے میدان میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ میں تمہارے نبی کا نواسہ ہوں اور تمہارے نبی کے عم زاد کا بیٹا ہوں۔ اگر یہ سچ ہے تو بتلاؤ کہ کیا تمہیں میرا استقبال تلواروں سے کرنا چاہیے؟ مگر اس بات کا کسی کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور تیروں اور تلواروں سے خانوادہ رسول پر حملہ کر دیا جاتا ہے۔ ایک تیر سیدنا حسین کے حلق میں پیوست ہو جاتا ہے' آپ تیر باہر کھینچتے ہیں اور پھر اپنے ہاتھ منہ کی طرف اٹھاتے ہیں اور دونوں چلو خون سے بھر جاتے ہیں۔ آپ یہ خون آسمان کی طرف اچھالتے ہیں اور فرماتے ہیں ''الٰہی' میرا شکوہ تجھی سے ہے' دیکھ تیرے رسول کے نواسے سے کیا برتاؤ ہو رہا ہے؟''

اور نواسہ رسول سے یہ برتاؤ کسی اور شہر میں نہیں' کوفہ میں ہوتا ہے جو اہل بیت کے حامیوں کا گڑھ تھا اور جہاں سے سیدنا حسین کو ڈیڑھ سو خطوط روانہ کئے گئے تھے جن میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ تشریف لائیں' ہم آپ کے ہاتھ بیعت کرنے کے لئے بے چین ہیں..... مگر ان کے دل حسین کے لئے بے چین ہیں..... مگر ان کے دل حسین کے ساتھ اور تلواریں حکمرانوں کے ساتھ تھیں۔ کیا ایسے دل اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں سینوں سے نوچ کر چیلوں اور کوؤں کے آگے ڈال دیا جائے؟

اور ہماری تاریخ میں ایک کوفہ یا ایک کربلا نہیں' جب بھی ہمارا سفر منزل کی جانب شروع ہوتا ہے راستے میں ایک کربلا آ جاتا

ہے۔ سیدنا عمر اور سیدنا علی کا رخ بھی منزل کی جانب تھا مگر انہیں مسجد میں نماز کے دوران شہید کر دیا گیا۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ساتھ حجاج بن یوسف نے کیا کیا..... ظلمت کدہ ہند میں اسلام کی روشنی لانے والے اس مرد غازی کو ایک جانور کی کھال میں سی کر سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ایسے فاتحین اسلام خلیفہ سلیمان کے انتقام کا نشانہ بنے' انہیں قید اور جرمانوں کی سزائیں سنائی گئیں اور ان کو آخری عمر میں نشان عبرت بنا دیا گیا۔

ہاں' ہماری تاریخ یہی ہے۔ ہم مصیبت کے لمحوں میں اپنے محسنوں کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں' ہمارے دل ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہم تلواروں کی صورت حاکموں کے نیام میں رہتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ہمارا خواب مدینہ ہوتا ہے اور اس کی تعبیر کوفے کی صورت میں سامنے آتی ہے!

◆◆◆

طوطیا من موطیا

افسر ایک مخلوق ہے۔لیکن اس کی اعلیٰ قسمیں صرف دو ہیں' نمبر ایک سی ایس ایس اور نمبر دو پی سی ایس میرے دوستوں میں یہ دونوں قسم کے افسر شامل ہیں' ان مین سے جو میرے دوست نہیں ہیں یا جن سے میرا تعارف نہیں ہے' میں انہیں بھی ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ ان میں سے سی ایس پی کون ہے اور پی سی ایس کون؟ پی سی ایس کی نشانی یہ ہے کہ اسے اس کے صوبے میں بھی عموماً کھڈے لائن لگایا جاتا ہے چنانچہ اس کے چہرے پر مظلومیت کے آثار ہوتے ہیں' جب کہ پی سی ایس کے چہرے پر اس طرح کے یا ''استرا'' کے کوئی آثار نہیں ہوتے' پی سی ایس افسر کے دفتر جائیں تو اس نے اپنی کرسی پر تولیہ پھیلایا ہوتا ہے جب کہ سی ایس پی افسر بھی صفائی پسند ہوتے ہیں لیکن ان کے چہرے کے تاثرات کی طرح ان کے تولئے کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا! سی ایس پی افسر چائے پلاتا ہے' وعدہ کرتا ہے' پی سی ایس افسر کام کر دیتا ہے! سی ایس پی اور پی سی ایس افسروں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں کے چند مخصوص دوست ہوتے ہیں اور دونوں مصاحبین بھی پالیتے ہیں' البتہ پی سی ایس افسر مصاحبین کی زیادہ قدر افزائی کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر وہ اپنے ضلع یا تحصیل میں مشاعرہ کرائیں تو ان کا ایک ''گروپ'' عموماً شعراء کی بجائے مصاحبین کو مدعو کرتا ہے اس کے برعکس سی ایس پی افسر (اگر کبھی) مشاعرہ کرائیں تو ان میں سے بعض افسر شعراء کو بھی مصاحبین ہی میں شامل سمجھتے ہیں' سی ایس پی افسر جب ریٹائر ہوتا ہے تو بہت اداس لگتا ہے' پی سی ایس افسر اداس نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنی سروس کے دوران اداس رہنے کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک افسروں کی یہ دونوں قسمیں بہت مظلوم ہیں' اسسٹنٹ کمشنر بظاہر اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن جب ڈپٹی کمشنر دورے پر آتا ہے تو اسسٹنٹ کمشنر کو کورنش بجالانے والے اسے کہنیاں مارتے ہوئے ڈپٹی کمشنر تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمشنر دورے پر آئے تو ڈپٹی کمشنر کو کہنیاں پڑتی ہیں' چیف سیکرٹری کے دورے کے موقع پر کمشنر صاحب کو لوگ کہنیوں سے پرے دھکیلتے ہوئے چیف سیکرٹری تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں وزیر اعلیٰ کی آمد پر چیف سیکرٹری کے نصیب میں کہنیاں لکھی ہوتی ہیں' چیف سیکرٹری اور کمشنر عموماً سی ایس پی ہوتے ہیں' اگر کوئی پی سی ایس ان کے مناصب تک پہنچے تو وہ خوشی کے مارے میانی صاحب پہنچ جاتا ہے چنانچہ پی سی ایس کا کہنیاں کھانے کا تجربہ سی ایس پی افسر سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔

ان کے افسروں کی ''مظلومیت'' کا تعلق حکومت کی تبدیلی سے بھی ہوتا ہے' انتہائی قابل اور دیانت دار افسروں پر بھی سابقہ حکومت کے ''وفادار'' ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا ہے چنانچہ ''بلا امتیاز رنگ و نسل مذہب و ملت'' ان سب کو ''او ایس ڈی'' بنا دیا جاتا ہے اور یہ الف لیلہ کے ابوالحسن بن جاتے ہیں جو سویا تو محل میں تھا لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو جھونپڑی میں پاتا ہے۔

افسروں میں ایک کلاس ایسی بھی ہے جو خود کو کبھی افسر نہیں سمجھتی' ان میں سے زیادہ تر کا تعلق فنون لطیفہ کے کسی شعبے سے ہوتا ہے چنانچہ ان کی نظروں میں اپنی یا کسی اور کی ''شان سکندری'' جچتی ہی نہیں یہ لوگ اپنے منصبی فرائض پوری اہلیت اور قابلیت سے انجام دینے کے باوجود ذاتی زندگی درویشوں کی طرح بسر کرتے ہیں اور ان کی دوستیاں اپنے کلاس کے لوگوں سے زیادہ ادیبوں' شاعروں' مصوروں اور فنون لطیفہ سے وابستہ دوسرے شعبوں کے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہیں' جن کے نتیجے میں ان کی اپنی کلاس کے لوگ انہیں افسر سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں' چنانچہ ان میں سے جو سمجھ دار ہوتے ہیں' وہ اپنی یہ ''کمزوری'' اپنے کولیگز سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں' خصوصاً اپنے باس سے کہ ایسے لوگوں کی اے سی آر میں ''فنون لطیفہ سے وابستگی'' منفی ریمارکس میں شامل ہوتی ہے جس سے پروموشن پر برا اثر پڑتا ہے!

آخر میں صرف یہ کہ ان دنوں' ان دونوں قسم کے افسروں کی ''کلاس'' لی جا رہی ہے اور یہ کام فوج والے کر رہے ہیں۔ ہمارے فوجی بھائیوں کو کوئی بتانے والا نہیں کہ یورپ جانا' پچھم جانا مگر اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ میں اپنے فوجی بھائیوں کی خدمت میں اسی قسم کا ایک پنجابی مقولہ' کہاوت یا شعر پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

''طوطیا' من موطیا' توں ایس گلی نہ جا
ایس گلی دے جٹ برے' ایہ لیندے پھائیاں پا''

(میرے پیارے طوطے' تو اس گلی میں نہ جانا' اس گلی کے جاٹ بہت چالاک ہیں' جو ان کی گلی کا رخ کرتا ہے یہ اسے اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں)

◆◆◆

طوفان خان کا شکریہ!

غالباً بی بی سی سے ایک پروگرام نشر ہوا کرتا تھا' جس کا نام تھا "IT YOU ASKED FOR" کچھ اسی قسم کا کام پاکستان تحریک انصاف کے میڈیا سیکرٹری محمد اکرم چودھری نے کیا ہے انہوں نے کالم نگاروں کو ایک خط لکھا ہے جس میں انہیں "اشکل" دی ہے کہ وہ تحریک انصاف کے حوالے سے کچھ "کالم کلوچ" کریں' پہلے چودھری صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیں' "کالم کلوچ" بعد میں کریں گے:

مکری و محترمی عطاء الحق قاسمی صاحب' السلام علیکم!

شوکت خانم کینسر ہسپتال کے عظیم فلاحی منصوبے کی تکمیل کے بعد عمران خان نے "پاکستان کو سیاسی کینسر سے نجات دلانے کے لئے" آج سے چار سال قبل مورچہ لگایا اور تحریک انصاف کی بنیاد رکھی تھی۔ "انصاف سب کے لیے' کرپشن اور وی آئی پی کلچر کا خاتمہ" تحریک انصاف کا انقلابی نعرہ تھا' آج یہی نعرہ پورے پاکستان کی آواز بن چکا ہے۔ چور' اچکے اور لٹیرے سیاست دان مکافات عمل کا شکار ہیں' بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کو اسلامی' فلاحی اور خوشحال مملکت بنانے کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کے لئے عمران خان کا سفر جاری و ساری ہے' کرپٹ' ظالمانہ اور استحصالی نظام آخری سسکیاں لے کے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب عمران خان "طوفان خان" بن کر اس "آدم خور" نظام کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں گے۔ 25 اپریل 2000ء کو تحریک انصاف کا چوتھا "یوم تاسیس" ہے اس کی مناسبت سے آپ 25 اپریل کو اپنے کالم میں تھوڑی سی "کالم کلوچ" تحریک انصاف پر بھی کیجئے۔ یہ آپ کا فرض بھی ہے اور آپ پر عمران خان کا قرض بھی!

آپ کی صحت اور سلامتی کے لئے دعا گو۔۔۔۔۔۔محمد اکرم چودھری

جہاں تک تحریک انصاف کے انقلابی نعرہ "انصاف سب کے لئے' کرپشن اور وی آئی پی کلچر کا خاتمہ" کا تعلق ہے' یہ "انقلابی نعرہ" تو پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا ہے لیکن جو جماعتیں اقتدار میں رہی ہیں اور جو جماعتیں محروم اقتدار ہیں' ان سب کے اندرونی نظام میں وی آئی پی کلچر موجود ہے۔ کارکن کرسیاں لگاتے ہیں' لیڈر کرسی پر بیٹھتا ہے' کارکن کے پاس سائیکل نہیں ہے' لیڈر پجارو سے

کم پر راضی نہیں ہوتا' کارکن چیونٹی کی موت مارا جاتا ہے' لیڈر کے گرد چار کلاشنکوف بردار اس کی حفاظت کے لئے ہوتے ہیں۔ کارکن کو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی جب کہ لیڈر کا گھر بجلی کے چراغوں سے روشن ہوتا ہے' کارکن کے بچوں کو کارپوریشن کے اسکول میں بھی داخلہ نہیں ملتا' لیڈر کے بچے امریکہ میں پڑھتے ہیں' کارکن گذشتہ دس پندرہ سال سے ڈگریاں کشکول کی طرح لئے پھرتے ہیں اور اس میں کوئی نوکری کی ''خیرات'' نہیں ڈالتا۔ ''لیڈر کے بچے'' بلوغت سے پہلے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں' کارکن کرائے کے مکان میں رہتا ہے' لیڈر مکان کرائے پر دیتا ہے۔ کارکن جوانی میں بوڑھا لگتا ہے' لیڈر بڑھاپے میں جوان ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان ''محمود و ایاز'' میں مساوات اگر کہیں نظر آتی ہے تو وہ مسجد کی صفوں پر نظر آتی ہے لیکن نماز کے فوراً بعد ''ایاز'' اپنے کوارٹر کی طرف پیدل چل پڑتا ہے اور ''محمود'' ہاتھی پر بیٹھ کر اپنے محل کو سدھارتا ہے! اور جہاں تک کرپشن کا تعلق ہے' اگر یہ سب کچھ کرپشن نہیں ہے تو پھر ہم اسے اللہ کی رضا کا نام دے سکتے ہیں۔ جہاں تک تحریک انصاف کا دوسرے انقلابی نعرے یعنی ''انصاف سب کے لئے'' کا تعلق ہے تو یہ نعرہ بالکل غیر ضروری سا ہے' میرے استاد انصاف مرحوم اپنی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے کہ انصاف اتنا ارزاں نہیں ہے کہ جو چاہے اسے پالے' وہ کہا کرتے تھے کہ انصاف صرف اس کا ہے جو انصاف کا ہے اور وہ صحیح فرماتے تھے۔ آج ''اپوزیشن لیڈر'' کی ساری جماعتیں انصاف کی بات کر رہی ہیں اور اس میں سے مسلم لیگ رہنماؤں اور کارکنوں کو منہا کر دیتی ہیں کیونکہ یہ جماعتیں بھی انصاف مرحوم کی طرح یہی سمجھتی ہیں کہ انصاف سب کا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسلم لیگی رہنماؤں کارکنوں اور خصوصاً شریف فیملی کے لئے وہ انصاف کی بات نہیں کرتیں' ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے' یہ جماعتیں اسے ''مکافات عمل'' کا نام دیتی ہیں' جس سے ایک تو موجودہ حکومت کے تمام غیر جمہوری اور غیر منصفانہ اقدامات کی تائید ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جن جماعتوں کے لیڈروں اور کارکنوں پر ابھی وہ وقت نہیں آیا جو خدا کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے' وہ پارسا اور بے داغ ہیں کیونکہ اگر وہ برے ہوتے تو وہ بھی مکافات عمل کی زد میں آتے' میں نے گذشتہ ہفتے اسلامی تاریخ میں حکمرانوں کی طرف سے انسانوں پر ہونے والے مظالم مثالیں پیش کی تھیں' یہ جماعتیں اور ان کے رہنما ممکن ہے' اسے بھی ''مکافات عمل'' ہی کے کھاتے میں ڈالتے ہوں!

باقی جہاں تک اپنے عمران خان کا تعلق ہے' کرکٹ سے واجبی سا تعلق ہونے کے باوجود میں ان کا مداح ہوں' کیونکہ انہوں نے کرکٹ کے حوالے سے بیرون ملک پاکستان کا نام روشن کیا' ان کا شوکت خانم میموریل ہسپتال بھی ان کے نامہ اعمال میں ایک نمایاں نیکی کے طور پر درج ہے لیکن جہاں تک برادرم اکرم چودھری صاحب کے اس بیان کا تعلق ہے کہ ''بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کو اسلامی' فلاحی اور خوشحال مملکت بنانے کا جو خواب دیکھا تھا' اس کی تعبیر کے لئے عمران خان کا سفر جاری و ساری ہے۔

کرپٹ' ظالمانہ اور استحصالی نظام آخری سسکیاں لے کر اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے' انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب عمران خان ''طوفان خان'' بن کر اس آدم خور نظام کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں گے'' تو ظالمانہ نظام کا آخری سسکیاں لینا اور عمران خان کا طوفان خان بننا وغیرہ میرے لئے اطلاع کی حیثیت رکھتا ہے اور میں اس اطلاع کے لئے برادرم طوفان خان اور ان کے سیکرٹری دونوں کا ممنون ہوں!

◆◆◆

صرف ایک غیر ملکی دورہ.....!

ریڈیو اسٹیشن سے اپنے کام سے فراغت کے بعد چار دوست لاہور کے ایک قریبی قصبے میں واپس جا رہے تھے' جس اسٹیشن پر انہوں نے اترنا تھا' وہاں عموماً ٹکٹ چیکر نہیں ہوتا تھا چنانچہ وہ بلا ٹکٹ ٹرین میں سوار ہو گئے' اس روز اتفاق سے وہاں ٹکٹ چیکر ہی نہیں' ریلوے پولیس کا ایک سپاہی بھی موجود تھا' انہوں نے ''محتسبوں'' کو دیکھ کر دوڑ لگا دی ان میں سے تین تو ٹکٹ چیکر اور سپاہی کی رینج سے کافی دور نکل گئے لیکن ان میں سے جو کمزور اور ناتواں سا تھا' اسے سپاہی نے تھوڑی دور جا کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بے بس پایا تو اپنے ساتھیوں کے نام لے کر انہیں با آواز بلند پکارا اور کہا ''واپس آ جاؤ' واپس آ جاؤ' ہم لوگ پکڑے گئے ہیں۔''

آج یوم اقبال کی اس تقریب کے لئے میں مضمون لکھنے بیٹھا تو میرے ساتھ تقریباً یہی ہاتھ ہوا' یوں لگتا تھا جیسے کسی نے میرے دماغ کو جکڑ دیا ہے' چنانچہ تین چار گھنٹے تک میں صفحے لکھ لکھ کر پھاڑتا رہا حتیٰ کہ میں بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ تقریب کے منتظم چودھری مشتاق کو فون کروں اور کہوں کہ تقریب ملتوی کر دو' ہم مضمون نگار پکڑے گئے ہیں۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ اگر میں ''پکڑا'' گیا ہوں تو کیا ضروری ہے کہ دوسرے بھی ''پکڑے'' گئے ہوں' میرے ''پکڑے'' جانے کی وجہ تو میری علمی ناتوانی اور اقبال ایسید یونیکل شاعر اور مفکر کا رعب ہے' جب کہ دوسرے مقرر تو اس طرح کے کتنے ہی مرحلے کامیابی سے طے کر چکے ہیں اس کے باوجود میں اگرچہ چند لفظ لکھنے کے قابل ہو سکا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے میں اقبال کو صرف پڑھا کرتا تھا' ان دنوں ایم اے کلاسز کو اقبال پڑھا رہا تھا' سو اقبال کے بارے میں چند لفظ کہنا میرے لئے قدرے آسان ہو گیا ہے!

اقبال کی شاعری اور فکر میں مجھے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے' وہ فرنگی کی ہر طرح کی غلامی سے آزادی اور خودی کی حفاظت ہے۔ آج لکھتے وقت میرے دماغ کے جکڑے جانے کی ایک وجہ غالباً یہ سوچ بھی تھی کہ جس شاعر نے پاکستان کا تصور دیا' کیا آج کا پاکستان ان کے خوابوں کے مطابق ہے؟ اور مجھے جب نفی میں جواب ملا تو میرے لئے اقبال سے نظریں چار کرنا مشکل ہو گیا۔ میرا اور آپ کا محبوب ملک پاکستان اقبال کے خوابوں کے عین مطابق تو کبھی بھی نہ تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے یوں لگتا ہے جیسے فرنگی' جسمانی طور پر ہمارے ملک میں داخل بھی ہو گیا ہے' پھر سے سارے فیصلے اپنے مرضی کے مطابق بھی کرانا چاہتا ہے اور بیرونی دنیا سے ہمارا

رابطہ بھی کاٹ رہا ہے۔ میں پاکستان کے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا' صرف یہی سننے میں آیا ہے کہ وہ پروفیشنل سولجر ہیں اور ظاہر ہے محب وطن ہیں' شاید اسی لئے میں اس ''ماسٹر مائنڈ'' کی تلاش میں ہوں جس نے موجودہ حکومت کی تشکیل کردہ نیشنل سیکورٹی کونسل میں چن چن کر ان سویلنز کو نامزد کیا جن کی سوچ اور معاشرت فرنگی ہے اور جن کی خودی گہری نیند سو رہی ہے' صرف یہی نہیں بلکہ اس ماسٹر مائنڈ نے مرکز اور صوبوں سے بھی جو لوگ لئے ہیں' ان کی بہت بڑی اکثریت این جی اوز کی پروردہ اور پاکستان سے زیادہ ان ملکوں کی وفادار ہے جن سے وہ بھاری گرانٹ لیتی ہے یا یہ وہ لوگ ہیں جن پاکستانی عوام سے کسی کا ذہنی رابطہ موجود نہیں ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جنرل صاحب کے لئے یہ ابلیس کی مجلس شوریٰ کس نے ترتیب دی ہے؟ صورتحال یہ ہے کہ اس وقت پورا ملک اسی طرح کے لوگوں کے شکنجے میں ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مغربی سامراج کے ان نمک خواروں کے باوجود مغرب ہمیں سزا دینے پر تلا ہوا ہے چنانچہ 12 اکتوبر کے بعد سے ہمیں بھارت کا ایک صوبہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے' بھارت کو سپر پاور کا درجہ دینے کے لئے اسے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کے حوالے سے یقین دہانیاں کرائی جا رہی ہیں۔ ہمارا عزیز ترین دوست ترکی بھی بھارت کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے ہمیں دہشت گرد کہہ رہا ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے ہمارے گردن میں پھندا ڈال کر ہمیں سڑکوں پر گھسیٹنے کی تیاریاں کر رہے ہیں' فوجی حکومت کے باوجود بم دھماکے' دہشت گردی' تخریب کاری' قتل' ڈاکے اور خودکشیاں زوروں پر ہیں' واجپائی پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے اور اس کا انداز بتاتا ہے کہ اس بنئے کے پیچھے کون ہے؟ ملک شدید خطرات میں گھرا ہوا ہے' ہماری فوج اگر اس وقت سرحدوں پر ہوتی اور سیاستدان الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہے ہوتے تو شاید پاکستانی عوام چین کی نیند سو سکتے' لیکن پاکستان کے وجود اور سلامتی کو شدید خطرے میں دیکھ کر پاکستان سے عشق کرنے والے پاکستانیوں کی نیندیں ان دنوں اڑی ہوئی ہیں چنانچہ میں جنرل پرویز مشرف سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک محب وطن پاکستان کے طور پر اپنی انا کو پس پشت ڈالیں اور اقبال کے درویش خدامست کی طرح اقتدار کو ٹھوکر مار کر' بندوق ہاتھ میں پکڑیں اور بارڈر پر پہنچ جائیں کہ اس وقت ان کی وہاں ضرورت ہے۔ جنرل صاحب! جمہوری قوتوں کو ملک میں پنپنے دیں' سیاسی کام سیاستدانوں کے سپرد کریں' موجودہ حالات میں آپ کے غیر ملکی دورے بے فائدہ ہیں' آپ کی فائل میں صرف بیرونی دورے کا ذکر ہونا چاہیے' وہ بیرونی دورہ جو آپ ٹینک میں بیٹھ کر کریں کہ ایک پروفیشنل سولجر کے لئے صرف یہی دورہ قابل افتخار ہوتا ہے!

◆◆◆

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا!

لاہوریوں کو دو چیزوں کا بہت شوق ہے' ایک ٹائم پوچھنے کا اور دوسرا ٹائم کی پابندی نہ کرنے کا' کچھ لوگ بہت شوق سے بتاتے ہیں بلکہ وہ اس کے علاوہ بہت سی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جس گھڑی سے آپ کو ٹائم بتایا جا رہا ہے' وہ گھڑی کس کمپنی کی ہے اور اس کی کیا کیا خصوصیات ہیں' ایک دفعہ ایک صاحب سے میں نے ٹائم پوچھا تو انہوں نے ٹائم بتانے سے پہلے اس کی خصوصیات گنواتے ہوئے کہا کہ اس میں دوسری گھڑیوں کے علاوہ دو خصوصیات ایسی ہیں جو کسی اور گھڑی میں نہیں ملیں گی' ایک یہ کہ میں نے یہ گھڑی فٹ پاتھ سے صرف ڈیڑھ سو روپے میں خریدی تھی اور دوسری خصوصیت یہ کہ ایک سال ہو گیا ہے اور یہ گھڑی آج تک بند نہیں ہوئی۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے گھڑی اتار کر مجھے دکھائی میں نے تجسس کی نظروں سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ٹائم دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ بند پڑی تھی!

آج کل تو گھڑیاں عام ہو گئی ہیں ایک وقت تھا کہ یہ کسی کسی کے پاس ہوتی تھی چنانچہ ان دنوں یار لوگ بازو کو ہوا میں لہراتے تھے' بلاوجہ ٹائم دیکھنے لگتے تھے تاکہ کسی طرح مخاطب ان کی گھڑی کی طرف متوجہ ہو اور ان سے ٹائم پوچھے' اگر سامنے بیٹھا ہوا شخص بہت ہی اذیت پسند ہوتا اور کسی صورت بھی ٹائم پوچھنے پر راغب نظر نہ آتا تو پھر ''صاحب گھڑی'' کو خود بتانا پڑتا کہ کیا ٹائم ہوا ہے۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو پوچھنے پر بھی ٹائم نہیں بتاتے تھے' ان میں میرے ایک دوست بھی شامل ہیں' جن سے آج بھی اگر ٹائم پوچھا جائے تو وہ ٹائم پوچھنے والے کو مخاطب کر کے کہتے ہیں'' کیوں صاحب' میں آپ کو ٹائم کیوں بتاؤں؟ کیا آپ نے میری گھڑی میں حصہ ڈالا ہوا ہے؟'' ایک دفعہ تو میرے اس دوست نے ایک اسی طرح کے ''سائل'' سے کہا ''معاف کیجئے' میری گھڑی ٹائم بتاتی نہیں' ٹائم پوچھتی ہے!''

جہاں تک لاہوریوں کے ٹائم کی پابندی کا تعلق ہے' یہ اسے مشرقی آداب کے منافی سمجھتے ہیں! مجھے اکثر ملاقات کے خواہش مند افراد کے فون آتے ہیں' ان سے اس قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔

''سر! میں آپ کا بہت مداح ہوں' آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور تشریف لائیں' آپ کتنے بجے آ سکیں گے؟''

''جی' میں کل کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔''

اگر فرض کریں میں ان صاحب کے انتظار میں سارا دن گھر پر بیٹھا رہوں کہ ان کا ''کسی وقت'' کسی وقت آ سکتا ہے تو اس کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ اس دن ضرور تشریف لائیں' بلکہ چند دن بعد اگر ان کا دوبارہ فون آتا ہے اور وہ ملاقات کی خواہش ظاہر کرتے ہیں تو اس دن نہ آ سکنے کی معذرت تو کجا' وہ اس کا ذکر تک نہیں کریں گے۔ ویسے آپ لاہوریوں کی پھرتیاں دیکھیں تو لگے گا ان سے زیادہ مصروف اور وقت کا پابند کوئی نہیں' سینما میں قومی ترانا بجنے پر کھڑے رہنے کی بجائے باہر نکلنا شروع کر دیں گے جیسے کسی بہت ضروری کام کے لیے ان کا وہاں وقت پر پہنچنا ضروری ہے' کوئی گاڑی تین چار گاڑیوں کو کٹ مارتی ہوئی ''شوں'' کر کے آپ کے قریب سے گزر جائے گی جیسے آگ بجھانے جا رہی ہو' ٹریفک سگنل سبز ہونے سے پہلے کھسک کھسک کر زیبرا کراسنگ کراس کر کے سڑک کے عین درمیان میں پہنچ جائیں گے جس سے دوسری طرف سے آنے والا ٹریفک خود بخود رک جائے گا اور یوں یہ سرخ بتی کے ہوتے ہوئے بھی سبز بتی کے لطف اٹھائیں گے!

لاہوریوں نے ٹائم کے حوالے سے بہت سے شعر بھی یاد کر رکھے ہیں جو عموماً رکشوں' بسوں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہوتے ہیں

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

اور یہ شعر تو نیو خان کی بسوں پر اکثر لکھا نظر آتا ہے۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

مگر نہ تو کسی کو یہ فکر ہے کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور اگر ہم نے اس کا احساس نہ کیا تو خود ہم بھی ''گزر'' جائیں گے اور نہ ہی یار لوگ ایک پل کی خبر نہ ہونے کے باوجود لمبے لمبے پروگرام بنانے سے باز آتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وقت ہماری خاطر رک جائے گا مگر وقت تو فرعون کے لیے بھی نہیں رکا جس نے اپنی خدائی کا اعلان کر رکھا تھا!

◆◆◆

دوراندیشی

میں نے گذشتہ روز لاہوریوں کی ٹائم پوچھنے اور ٹائم کی پابندی نہ کرنے کی عادت پر کچھ خامہ فرسائی کی تھی۔ مگر یہ ''دریا'' ایک ''کوزے'' میں بند ہونے والا نہیں۔ اس لئے تو بہت سے ''کوزے'' درکار ہیں۔ چنانچہ آج اس سلسلے کا ایک اور ''کوزہ'' پیش خدمت ہے۔

اہل لاہور بلکہ میں سمجھتا ہوں اہل پاکستان کو وقت کی قدر کا جتنا احساس ہے' اس کا اندازہ شادی بیاہ کے مواقع پر خصوصاً لگایا جا سکتا ہے۔ میاں نواز شریف کی حکومت نے شادی کے موقع پر کھانا کھلانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ تاکہ غریب بچوں اور بچیوں کے والدین برادری میں ناک کٹنے کے عذاب سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ پابندی کاغذوں میں آج بھی قائم و دائم ہے۔ لیکن ان دنوں بیشتر صورتوں میں اس قانون کی دھجیاں سرعام بکھیری جا رہی ہیں۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب براتیوں کو کھانا ملنے کی امید ہوتی تھی' بارات تب بھی گھنٹوں لیٹ پہنچتی تھی' ان دنوں کچھ امید اور کچھ ناامیدی کی کیفیت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں لوگ شادی بیاہ کی تقریبات میں کم شرکت کرنے لگے ہیں۔ اور جو شرکت کرتے ہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ تاخیر سے آتے ہیں کہ ایک بوتل ہی تو پینی ہے۔ ملی تو پی لیں گے' نہ ملی تو شادی ہال سے باہر نکل کر کسی دکان سے خرید کر ''ڈیک'' لگا لیں گے۔

جن دنوں کھانے پر پابندی نہیں تھی' ہفت روزہ خدام الدین کے ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر مناظر حسین مرحوم کا مجھے فون آیا کہ جمعہ کے روز ان کی صاحبزادی کی شادی ہے' بارات لازمی طور پر جمعے کی نماز سے پہلے آئے گی تاکہ نکاح اور کھانے سے فراغت کے بعد جمعہ کی نماز ادا کی جا سکے۔ لہٰذا آپ بارہ بجے ضرور پہنچ جائیں' میں نے حامی بھر لی۔ اور گھر سے نکلتے وقت بیٹی کے لئے ایک گفٹ پیک کر کے اپنی گاڑی میں رکھ لیا' مجھے چار بجے کے قریب یاد آیا کہ مجھے تو مولانا صاحب کی صاحبزادی کی شادی میں جانا تھا اور یہ تقریب تو جمعہ کی نماز سے پہلے اختتام پذیر ہو چکی ہوگی۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ شادی میں بروقت شرکت نہ کر سکنے کی معذرت کرنے' مبارک باد کہنے اور گفٹ پہنچانے کے لئے مجھے بہرحال مولانا صاحب کے گھر جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے گاڑی کا رخ ان کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ لیکن وہاں جب پہنچا تو پتہ چلا کہ بارات ابھی پہنچی ہی نہیں۔

اسی طرح گزشتہ روز مجھے پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات منیر احمد خان کا کارڈ اور فون پہنچا کہ ان کی ہمشیرہ کی شادی

ہے۔اور وقت تین بجے سہ پہر ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ساڑھے تین بجے یوم اقبال کی تقریب میں پیپر پڑھنا ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک تین بجے پی سی پہنچ جاؤنگا۔اور وہاں سے تین بجکر پچیس منٹ پر ایوان اقبال کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔تاہم میرے ساتھ شرط لگالیں بارات وقت پر نہیں پہنچے گی۔مگر ہوا یوں کہ اقبال کے حوالے سے پیپر لکھتے ہوئے میرے دماغ میں ایسا ''ڈکا'' لگا کہ میں ساڑھے تین بجے فارغ ہوا اور وہاں سے سیدھا ایوان اقبال پہنچ گیا۔رات کو میرے عارف والا کے دوست رانا غضنفر عباس اور میاں صاحب مجھ سے ملاقات کے لئے میرے گھر آئے تو پتہ چلا کہ وہ منیر احمد خان کی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کر کے آرہے ہیں۔اور یہ بات پیپلز پارٹی کے لئے اچھی نہیں کیونکہ پہلے ان کی پارٹی الیکشن ہار چکی ہے۔اور اب اس کے عہدیدار شرطیں بھی ہارنا شروع ہو گئے ہیں۔

یہ تو ہوئی ٹائم کی پابندی کی بات اور جہاں تک ٹائم پوچھنے کی عادت کا تعلق ہے تو ہمارے ایک دوست سیشن جج کا قصہ سن لیجئے۔ وہ اس زمانے کی بات ہے جب ججوں کے پاس کار نہیں ہوتی تھی۔انہوں نے ٹائم پیس ٹھیک کروانا تھا۔ایمپریس روڈ سے ہاتھ میں ٹائم پیس لٹکا کر فٹ پاتھ پر انارکلی کے لئے روانہ ہوئے۔راستے میں ہر دوسرے قدم پر کوئی نہ کوئی روک کر ٹائم پوچھتا۔''بھائی صاحب ٹائم کیا ہوا ہے؟'' کی گردان سن سن کر ان کے کان پک گئے اور وہ یہ بتا بتا کر تھک گئے کہ گھڑی خراب ہے۔آخر ایک مہربان نے جرات کر کے پوچھا' خراب ہے تو پھر اسے لٹکائے کیوں پھر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ٹھیک کروانے انارکلی جا رہا ہوں۔انہوں نے جواباً مشورہ دیا کہ پھر اسے قمیض کے نیچے چھپا لیجئے۔

آخر میں ایک لطیفہ ہی کافی ہے۔

ایک صاحب ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے جس میں ان کی بیٹی کسی دوسرے شہر سے آرہی تھی۔اتنے میں ایک نوجوان ان کے پاس آیا اس کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے کہا۔''تم ٹائم پوچھنے کے بہانے مجھ سے گفتگو کا آغاز کرو گے' جس سے بے تکلفی کی ایک فضا پیدا ہو گی۔اتنی دیر میں میری بیٹی کی ٹرین پہنچ جائے گی' تمہارا اس سے تعارف ہو گا' پھر تم آپس میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرو گے اور پھر ایک دن تم میرے پاس میری بیٹی کا رشتہ مانگنے چلے آؤ گے.....اور میں اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے شخص سے نہیں کر سکتا' جس کے پاس گھڑی تک نہیں ہے!''

◆◆◆

صائمہ کا طوطا!

وائلڈ لائف والوں نے اداکارہ صائمہ کا چالان کر کے عدالت بھجوا دیا ہے اور مجسٹریٹ نے صائمہ کو عدالت میں طلب کر لیا ہے۔ صائمہ پر الزام ہے کہ اس نے گھر میں ''را'' طوطا پالا ہوا تھا جو کہ وائلڈ لائف والوں نے گھر میں رکھنا ممنوع قرار دے رکھا ہے۔

مجھے یاد ہے بچپن میں مجھے بھی ''را'' طوطے کے حوالے سے ایک جنون سا ہوتا تھا۔ ''را'' طوطا وہ ہوتا ہے جس کی گردن میں قدرتی طور پر لال ''گاہنی'' (مالا) ہوتی ہے۔

اور اس طوطے کو اگر سکھایا جائے تو یہ باتیں بھی کرتا ہے' چنانچہ ہم بچوں کو جب اطلاع ملتی تھی کہ فلاں گھر میں یہ طوطا موجود ہے تو ہم اس کی ''زیارت'' کے لئے دوڑے جاتے تھے۔ خود میں نے بھی ایک دفعہ بازار سے ایک طوطا خریدا تھا جس کی گردن میں لال ''گاہنی'' تھی مگر میری تمام تر کوشش کے باوجود اس نے میرے سکھائے ہوئے لفظ ادا نہیں کئے۔ یا تو یہ جعلی ''را'' طوطا تھا اور یا پھر بہت قوم پرست تھا کہ دوسروں کی زبان بولنے کی بجائے اپنی زبان میں بات کرنا پسند کرتا تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ صائمہ کو ایسا طوطا پالنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جو باتیں بھی کرتا ہو۔ اس طرح کے طوطے تو سارا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں' اب یہ طوطا وائلڈ لائف والوں کی تحویل میں ہوگا اور وہ اسے چوری کھلا کھلا کر خدا جانے اس سے کیا کیا پوچھتے ہوں گے۔ اور وہ جواب میں اللہ جانے کیا کیا بکواس کرتا ہوگا۔ ممکن ہے یہ طوطا انہیں صائمہ کی اصلی عمر بتا دے جو اس کے فلمی اور غیر فلمی کیریئر کے لئے مضر ہو اس طرح کی باتوں سے بچنے ہی کے لئے صائمہ نے معمر رانا کے ساتھ ایک فلم میں بطور ہیروئین کام کیا تھا حالانکہ معمر رانا بالکل ''معمر'' نہیں' وہ تو بچہ ہے مگر کہا تو یہی جائے گا کہ صائمہ کا قد کاٹھ اور دیگر معاملات ایسے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ اپنی عمر سے بڑی لگتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی فلم میں ولن نے اپنے کارندوں کو کہنا ہو کہ اسے اٹھا لو تو اسے کہنا پڑتا ہے کہ ''جتنی اٹھا سکتے ہو اتنی اٹھا لو'' لہٰذا میرے نزدیک صائمہ نے ''را'' طوطا پال کر بڑی حماقت کی ہے۔ طوطے نے اس مقبول اداکارہ کی تاریخ پیدائش تھوڑی دیکھی ہوگی' وہ تو اس کی جسامت یا سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے وائلڈ لائف والوں کو گمراہ کر رہا ہوگا۔ جبکہ میرے نزدیک صائمہ کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں ہے۔ میرے اس اندازے سے صائمہ کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر کسی کو طوطے پالنے کا اتنا ہی شوق ہو تو اس کام کے لئے انسانوں میں زیادہ سمجھدار طوطے موجود ہیں جو ارزاں نرخوں بلکہ بعض صورتوں میں رضا کارانہ طور پر

دستیاب ہیں۔

اگر بعض قارئین یہ سمجھ رہے ہوں کہ میں نے متذکرہ بات یونہی کہہ دی ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس وقت ہمارے درمیان زندگی کے مختلف شعبوں میں بے شمار ''را'' طوطے موجود ہیں۔ جو رٹے رٹائے اور سیکھے سکھائے جملے بولتے ہیں' ان میں سے کئی ایک سیاست دان ہیں' کچھ علماء ہیں' کچھ اخبار نویس ہیں اور یہ سب پالتو جانور ہیں۔ ان کے مالک انہیں چوری کھلاتے ہیں اور پھر ان سے جو کہلوانا ہو کہلوا لیتے ہیں۔ جبکہ بیسیوں انسانوں کو طاطا بنایا گیا ہے' ان میں سے کچھ بولنے پر مامور ہیں۔ کسی کو گول مول بات کرنے کے لئے رکھا گیا ہے۔ اور کچھ کو خاموش رہنے پر چوری کھلائی جاتی ہے۔ تاہم ان سب طوطوں کے بولنے یا خاموش رہنے کے وقت کا فیصلہ مالک کرتا ہے' کسی خاص واقعہ یا سانحہ سے پہلے یہ سارے طوطے بیک وقت بولنے لگتے ہیں ٹائیں ٹائیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور جب خاموشی مطلوب ہو تو مالک کے ایک حکم پر ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ملک کو تباہی کے کنارے تک پہنچانے میں ان سیاسی' مذہبی اور صحافتی طوطوں کا بہت دخل ہے۔

سوان کے حالات میں ایک بے ضرر طوطا پالنے پر وائلڈ لائف والوں کا صائمہ کا چالان کرنا مجسٹریٹ صاحب کا اسے عدالت میں طلب کر لینا عجیب سا لگتا ہے۔ تاہم ممکن ہے وائلڈ لائف والے اور عدالت کے کوئی اہلکار اداکارہ صائمہ کے مداح ہوں اور یوں ان کا مقصد محض ''تقریب بہر ملاقات'' ہو کہ بقول شاعر:

جی چاہتا ہے چھیڑ کے ہوں ان سے ہم کلام
کچھ تو لگے گی دیر سوال و جواب میں

اور اگر ایسی بات ہے تو پھر میرے دل کو کچھ تسلی ہو گئی ہے۔ کہ خود میرا اپنا یہ کالم بھی ہم کلام ہونے کا ایک بہانہ تھا ورنہ صائمہ کے طوطے سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

◆◆◆

شیش ناگ.....!!

اٹک جیل میں سیاسی قیدیوں کے سیل سے شیش ناگ نکلنے کی خبر تو آپ نے پڑھ ہی لی ہوگی' اس سیل میں پنجاب اور سرحد کے معزول وزرائے اعلیٰ شہباز شریف' سردار مہتاب خان' سابق وفاقی وزیر اعظم ہوتی' میاں نواز شریف کے فرزند حسین نواز' ایم کیو ایم کے ڈاکٹر فاروق ستار اور دیگر بہت لوگ قید ہیں' شیش ناگ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ انتہائی زہریلا اور ڈیڑھ میٹر لمبا تھا۔ اور سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود یہ قاسم بلاک میں پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا' جس پر محکمہ جنگلات کے ایک قیدی افسر جاوید عالم خانزادہ نے دہشت اور خوف سے سانپ سانپ کہتے ہوئے چلانا شروع کر دیا' شور سن کر جیل کے حکام نے تالا کھولا اور ایک قیدی کو اندر بھیجا جس نے اپنی جان پر کھیل کر سانپ کو مار دیا' انعام کے طور قیدی کی ایک ماہ کی سزا معاف کر دی گئی۔

مجھے اس خبر میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی' وہ ''سخت حفاظتی اقدامات'' والی ہے۔ کیا شیش ناگ کو قیدیوں سے ''ملاقات'' سے قبل اپنی تلاشی دینا تھی اور ان سارے مراحل سے گزرنا تھا جن سے ایک ملاقاتی کو گزرنا پڑتا ہے؟ یا ملاقاتیوں کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرانے سے بچنے کے لئے اسے پہلے تمام حفاظتی اقدامات کو ناکام بنانا یعنی پہریداری پر متعین افراد کو ڈسنا اور پھر سیاسی قیدیوں کے سیل میں داخل ہونا تھا؟ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ صورت حال جو بھی ہو' یہ شیش ناگ بہر حال کسی بری نیت سے سیل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ جنگل کا یہ زہریلا جانور غالباً ان اخباری خبروں پر یقین نہیں کر رہا تھا کہ عوام کے منتخب نمائندے اور ملک کے دو منتخب وزرائے اعلیٰ جیل میں بند ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے کے لئے جیل کے ''دورے کا پروگرام بنایا مگر بیچارہ اپنے کمزور ایمان کی وجہ سے مارا گیا!

ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ شیش ناگ جیلی حکام کی اجازت سے سیاسی قیدیوں کے سیل میں داخل ہوا ہو کیونکہ جیلوں میں اگر تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود چرس' افیون' گانجا' ہیروئین اور شراب وغیرہ جا سکتی ہے تو ایک شیش ناگ کیوں نہیں جا سکتا' تاہم وہ ناگ زہریلا نہیں ہوگا کیونکہ حکام کا مقصد سیاستدانوں کو ہراساں اور دہشت زدہ کرنا نہیں بلکہ ان کی جیل میں پائی جانے والی بور کن یکسانیت کو ختم کر کے ان کی دعائیں لینا تھا' ماضی میں سیاسی جلسوں میں سانپ چھوڑنے کی روایت موجود ہے اور یہ سانپ زہریلے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا ڈنگ نکال لیا گیا ہوتا تھا اور مقصد محض حاضرین جلسہ کی تفریح طبع ہوتا تھا!

منیر نیازی راوی ہیں کہ ایک دفعہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ اپنے گھر کے لان میں بیٹھے تھے کہ ایک نہایت خوبصورت سیاہ رنگ کا سانپ جھاڑیوں میں نکل آیا' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' اس خوبصورت سانپ نے ان میاں بیوی کے پاس آ کر پھن پھیلایا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مست ہو کر جھومنا شروع کر دیا۔ مگر اس دوران منیر کی بیگم نے پاس دھری ہوئی ہاکی اٹھائی اور اس معصوم سانپ کو مار دیا جو محض کتھک ڈانس کے موڈ میں تھا۔ اس پر منیر نے اپنی بیگم سے کہا "سانپ کو مارنے کے بجائے اس کا زہر نکال کر اسے گنڈویا (کیچوا) بنا دینا چاہیے تھا۔ اور اسے اتنا ضعیف کر دینا چاہیے کہ اسے عینک لگ جائے اور وہ چھڑی کے سہارے کے بغیر چل نہ سکے۔"

اہل مغرب ان دنوں ہمیں بھی سانپ ہی سمجھ رہے ہیں اور ہمارے ضمن میں منیر نیازی والا نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان کی محافظ فوج اور پاکستان بنانے والی جماعت کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے میں بھی اس "پرچہ ترکیب استعمال" سے استفادہ کیا گیا تھا کہ ایک ہی وار میں دونوں کا صفایا کر دیا جائے' جیل کے حکام نے بھی بیچارے سانپ کی جان خواہ مخواہ لی' حالانکہ جب یہ سانپ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تھا' اس کے بعد انہیں واپس اس مداری کو دے دینا چاہیے تھا جس سے یہ سانپ حاصل کیا گیا تھا۔

یہ شیش ناگ والا معاملہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ اس ضمن میں کوئی بات پورے یقین سے کرنا ممکن نہیں' چنانچہ ایک امکان یہ بھی موجود ہے کہ سیاسی رہنماؤں کے سیل میں اس شیش ناگ کی موجودگی ان رہنماؤں کو جیل سے فرار کرنے کے کسی منصوبے کا حصہ نہ ہو اور اس طرح کے سانپ کے نکلنے پر بھگدڑ مچ جائے اور اس افراتفری میں ان اسیر رہنماؤں کو جیل سے بھاگنے کا موقع مل جائے' اس سے پہلے جیل حکام سیف الرحمان کی بچیوں کا جیل توڑنے کا منصوبہ ناکام بنا چکے ہیں' اگر تازہ واردات کے حوالے سے میرا اندازہ درست ہے تو اس دوسری کامیابی پر حکام خصوصی ترقیوں اور انعامات کے مستحق ہیں۔

تاہم اس سارے قضیے میں جو بات مجھے زیادہ قرین از قیاس لگتی ہے وہ یہ ہے کہ شیش ناگ والا واقعہ سرے سے ظہور پذیر نہیں ہوا' نہ کوئی شیش ناگ اسیر رہنماؤں کے سیل میں داخل ہوا اور نہ کسی نے اسے ہلاک کیا بلکہ جنہوں نے دیکھا یا جس نے بظاہر ہلاک کیا' وہ سب نظر کے دھوکے کے شکار ہوئے' اسے نفسیات کی زبان میں "ہیلوسی نیشن" کہتے ہیں۔ ہماری قوم کے اعصاب پر عالمی شیش ناگ سوار ہے جو ہمارے وجود کے درپے ہے اور جس نے ہماری قوم اور اداروں کو تقسیم کر دیا ہے۔ اس کیفیت میں مریض کو وہ چیز باقاعدہ نظر آنے لگتی ہے جو فی الواقع وہاں موجود نہیں ہوتی۔ شیش ناگ وہاں نہیں تھا جہاں ہم نے اسے تلاش کیا اور بزعم ہلاک کر دیا۔!

وہ عالمی شیش ناگ زندہ ہے جو ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ پاک فوج' سیاسی جماعتیں اور عوام خبردار رہیں!!!

◆◆◆

ہڈحرام محنتی!

میرے ایک جاگیردار دوست ہیں جن کی اپنے بارے میں بہت سوچی سمجھی رائے ہے کہ وہ بہت محنتی انسان ہیں' ان کی روزمرہ کی مصروفیات یہ ہوتی ہیں دوپہر کو ایک بجے سو کر اٹھتے ہیں' بستر پر لیٹے لیٹے چار کپ چائے پیتے ہیں' اس کے بعد اخبارات کا پلندہ اور ایک پیکٹ سگریٹ ہاتھ میں تھامے غسل خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ تقریباً ڈھائی بجے غسل خانے سے برآمد ہوتے ہیں' اب بظاہر یہ لنچ کا ٹائم ہوتا ہے لیکن وہ ناشتہ فرماتے ہیں' ناشتے کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھتے ہیں اور اپنے دفتر چلتے جاتے ہیں جہاں ان کا عملہ واپس گھروں کو جانے کی تیاری میں مشغول ہوتا ہے۔ منیجر کو اپنے کمرے میں بلاتے ہیں اور اس سے دن بھر کی کارگزاری کی بریفنگ لیتے ہیں' اس کے بعد منیجر بھی چھٹی کر جاتا ہے اور صاحب ٹیلی فون کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں' اس کے بعد رات گئے تک دفتر میں دوستوں کی محفل سجتی ہے' جہاں لمبے لمبے سیاسی تجزیے ہوتے ہیں' اپنی جاگیر اور دیگر کاروبار کے حوالے سے مستقبل کی پلاننگ بھی ہوتی ہے۔ رات کو تقریباً بارہ بجے ''لنچ'' بھی یہیں کیا جاتا ہے اور موصوف صبح چار بجے گھر پہنچ کر ''ڈنر'' کرتے ہیں!

اگلے روز دوپہر کو ایک لمبی انگڑائی لے کر بیدار ہوتے ہیں تو ان کے جسم کا ایک ایک حصہ دکھ رہا ہوتا ہے جس کی وجہ وہ اپنی غیر معمولی محنت بتاتے ہیں اس محنت کے حوالے سے ایک روز میری ان سے خاصی طویل گفتگو ہوئی' جس کی تلخیص درج ذیل ہے:

''تمہارے نزدیک محنت کی تعریف کیا ہے؟''

''میرے خیال میں محنت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جس کا پھل انسان کو ملے۔''

''اور یہ جو بیچارے مزدور سارا دن کڑکتی دوپہر میں اینٹیں ڈھوتے ہیں' انہیں اس محنت کا پھل جو ملتا ہے' وہ پھل زیادہ سے زیادہ گنڈیریاں یا شہتوت وغیرہ ہوتے ہیں۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ ہڈحرام لوگ ہیں' یہ محنت کرنا ہی نہیں چاہتے' انہیں اس کا پھل کیسے ملے گا؟''

''تم محنت کسے کہتے ہو''

''محنت وہ ہے جو میں کرتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''میں روزانہ نو دس گھنٹے سوتا ہوں' تمہارے خیال میں یہ کوئی آسان کام ہے؟ پسلیاں درد کرنے لگتی ہیں!''

''اس کے علاوہ رات گئے تک دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ملکی مسائل پر غور کرنا اور ان کا حلا تلاش کرنا' اس سے زیادہ محنت کا کوئی کام ہے؟''

''نہیں واقعی نہیں ہے..... اتنی محنت کے بعد تم کوئی مزید محنت کرنے کے قابل رہتے ہی نہیں ہو گے؟''

''ہونا تو یہی چاہیے تھا لیکن چونکہ میں فارغ نہیں بیٹھ سکتا' اس لئے گرمیوں میں یورپ چلا جاتا ہوں اور پھر وہاں سے امریکہ وغیرہ جانا پڑ جاتا' ہے تمہیں تو پتہ ہی ہے' آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے کی مسلسل فلائٹس اور پھر جیٹ لیگنگ' یہ سب کچھ تبھی برداشت ہو سکتا ہے' اگر انسان شروع ہی سے محنت کا عادی ہو!''

''تمہاری بات میں واقعی کوئی شبہ نہیں' میں تو تم ایسے بڑے زمینداروں کی یہ زندگی دیکھتا ہوں تو مجھے تم پر رحم آتا ہے' تم تو حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہو!

''اگر تم اس وقت میری تعریف نہ کر رہے ہوتے تو تم سے تمہارے آخری جملے پر شدید احتجاج کرتا!''

''یہ تمہاری وسیع النظر فی اور حیوان دوستی ہے' ورنہ تمہارے ضمن میں یہی موازنہ اگر میں نے کسی حیوان کے سامنے کیا ہوتا تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔''

''یہ تمہارا حسن نظر ہے' ورنہ میں اس قابل کہاں ہوں اور ہاں' اپنے دانشور دوستوں کو بتاؤ کہ ہم غریب ''کاشت کاروں'' کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ نہ کیا کریں' ہم سے زیادہ محنتی بھلا کون ہو گا' لیکن ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ محنت دوسرے کرتے ہیں اس کا پھل ہم کھاتے ہیں۔ اس سے پوچھو کہ یہ بات اگر صحیح بھی ہے تو اصل چیز تو پھل کھانا ہے نا' اور وہ ہم کھا رہے ہیں اور بغیر محنت کے پھل کھانے کے لئے جتنی محنت کرنا پڑتی ہے' اس کا اندازہ تم جیسے ہڈحراموں کو ہو ہی نہیں سکتا!''

◆◆◆

صائمہ کا طوطا اور قارئین!

آپ یقین کریں مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میرے قارئین کو صائمہ کے طوطے سے اتنی دلچسپی ہے۔ اور یہ دلچسپی بھی مجھے اس نوعیت کی محسوس ہوئی کہ جس نوعیت کی دل چسپی وائلڈ لائف والوں کو صائمہ کے طوطے سے ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھ جو خطوط موصول ہوئے ہیں' ان میں سے سب سے دلچسپ خط جناب ایم بی انجم ایڈیشنل انکم ٹیکس کمشنر لاہور کا ہے' اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ آپ کی تصویر کے ساتھ صائمہ کی تصویر لگانے سے آپ کے کالم کی ریڈرشپ میں اضافہ ہوگیا ہوگا۔ اور اس حوالے سے اس کے علاوہ بھی انہوں نے مجھے خاصے کچوکے دیئے ہیں۔ میں اگرچہ اس ضمن میں انجم صاحب سے متفق ہوں مگر یونہی ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا جو کچھ یوں ہے۔

جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

انجم صاحب نے صائمہ کی تصویر کے حوالے سے ایک اور ''اعتراض'' بھی کیا ہے اور وہ یہ کہ اسے پاسپورٹ سائز نہیں بلکہ پورٹریٹ سائز کا ہونا چاہیے تھا تاکہ صائمہ کا قد کاٹھ وغیرہ وغیرہ دیکھ کر ہر صاحب ذوق یہ پکار اٹھتا۔

کس لئے تیری طرح یہ بھی تنی ہوتی ہے
تیری تصویر تو کاغذ سے بنی ہوتی ہے

خط کے آخر میں ایم بی انجم صاحب نے وائلڈ لائف والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فنکاروں کے گھروں پر چھاپوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھیں تاکہ مستقبل میں کچھ اسی طرح کے مزید کالم پڑھنے کو ملیں۔ مثلاً ریما کا الو' میرا کی لومڑی' میرا کی بلی' اور شفقت چیمہ کا شیش ناگ وغیرہ! انجم صاحب نے یہ آخری بات لکھ کر اپنے بھولپن کا ثبوت دیا ہے' انہیں شاید علم نہیں کہ ان دنوں کسی کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے چھاپے یا کسی ثبوت کی ضرورت نہیں' نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں بلکہ اس پر شاباش بھی ملتی ہے!

صائمہ کے طوطے کے حوالے سے ایک اور خط مولانا قادری عبدالشکور چشتی نظامی (اسلام آباد) کا موصول ہوا ہے مگر حضرت نے نثر کے بجائے نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند قابل اشاعت اشعار درج ذیل ہیں۔

صائمہ کا طوطا

کتنا چھیل چھبیلا
کالم اس پر آیا
حضرت عطا کا
بھید وہ کیونکر کھولے
چوری کھانے والا
وائلڈ لائف والو!
کچھ تو خوف خدا کا
واپس اس کو کر دو
جس کا ہے یہ طوطا
طوطا ہے یہ اس کا
کوئی نہیں جس جیسا

مولانا حافظ قاری عبدالشکور چشتی نظامی مدظلہ العالی کے فرمودات پڑھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی کہ خدا کا شکر ہے ہمارے علماء میں اتنے صاحب ذوق لوگ بھی موجود ہیں چنانچہ میرا ارادہ ان سے درخواست کرنے کا تھا کہ کبھی لاہور تشریف لائیں تو ازراہ بندہ پروری مجھے شرف ملاقات بخشیں لیکن آخری شعر:

طوطا ہے یہ اس کا
کوئی نہیں جس جیسا

پڑھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اگر حضرت کبھی لاہور تشریف لائے بھی تو اگرچہ میرا گھر شاہ نور اسٹوڈیو لاہور کے قریب ہے' مگر وہ پھر بھی شاید میرے لئے وقت نہ نکال سکیں' ویسے اس طرح کے معاملات میں' میں خود بھی زیادہ وسیع القلب نہیں ہوں!

◆◆◆

''فاقہ زدہ قوم'' اور ''ہم محب وطن لوگ''

تھر اور بلوچستان پر قحط زدہ انسانوں اور مویشیوں پر جو گزر رہی ہے' اس پر ہم پاکستانیوں کو جتنا دکھ ہے' اس کا اندازہ پی ٹی وی ورلڈ کے اس پروگرام سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو گزشتہ ہفتے صبح کے تین بجے تک جاری رہا۔ خواجہ نجم الحسن نے اس زندہ ناچ گانے والے شو میں آرٹسٹوں کو خوب نچوایا جنہیں خواجہ صاحب نجی گفتگوؤں میں ''رنڈیاں'' کہتے ہیں۔ اس پروگرام سے خواجہ صاحب کا مقصد پاکستانی عوام اور اس کے غم اور صدمے کو نارمل سطح پر لانا تھا جو انہیں سندھ اور بلوچستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے اپنے پاکستانی بھائیوں کی حالت زار کی وجہ سے نڈھال کئے ہوئے ہیں۔ سات سمندر پار کا کوئی بادشاہ مرجاتا ہے تو اس کے سوگ میں ہمارا قومی پرچم سرنگوں کر دیا جاتا ہے اور اس بادشاہ نے اگر ہمیں چار پیسے دیئے ہوں تو دو تین دن کے لئے پی ٹی وی اور ریڈیو پر تفریحی پروگرام بھی بند کر دیئے جاتے ہیں' مگر یہاں چونکہ صدمہ بڑا ہے یعنی مرنے والا کوئی غیر نہیں' بلکہ سینکڑوں اپنے پاکستانی بھائی اور ان کے لاکھوں مال مویشی ہیں' لہٰذا قوم کو اس عظیم صدمے سے نکالنے کے لئے یہ رنڈی رونا ضروری ہو گیا تھا' جزاک اللہ خواجہ نجم الحسن صاحب' جزاک اللہ!

میں قدرے خوش فہم واقع ہوا ہوں' میرا خیال تھا کہ اپنے پاکستانی بھائیوں اور ان کی زندگی کا انحصار جن مال مویشیوں پر ہے' ان کے بھوک پیاس اور فاقوں سے مرنے کی اطلاعات ہمارے حکمرانوں کی بھوک اور راتوں کی نیند اڑا دے گی۔ اور وہ سارے کام چھوڑ کر تھر اور بلوچستان کے فاقہ زدہ علاقوں میں اپنے ہیڈ کوارٹر قائم کر لیں گے۔ بھل صفائی کرنے والی ٹیم ان علاقوں میں جا کر دلوں کی میل نکالے گی اور اس کڑے وقت میں دستگیری کی بدولت ان دلوں میں اتر کر پاکستان کے لئے لازوال محبت پیدا کرے گی۔ مگر ابھی تک جو کچھ ہوا ہے' وہ اونٹ کے منہ میں زیرے اور تسلی کے دو ارب اور دو اخباری بولوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

میری خوش فہمیوں کا یہ عالم ہے کہ میں پاکستان کے تمام سینئر سیاسی جماعتوں کے امدادی کیمپ ان فاقہ زدہ علاقوں میں لگے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تمام سیاسی جماعتیں' جو ان دنوں بالکل فارغ ہیں اور کچھ نہیں تو ٹائم پاس کرنے کے لئے ان علاقوں کا دورہ کریں گی۔ سیر بھی ہو جائے گی ٹائم بھی پاس ہو جائے گا اور لوگوں میں نمبر بھی بنیں گے' مگر افسوس ان جماعتوں کی کج فہمی میری خوش فہمی سے زیادہ نکلی..... مجھے اس ضمن میں پاکستان مسلم لیگ سے کچھ زیادہ توقعات تھیں کیونکہ اسیر رہنما میاں نواز شریف ایسے

مواقع پر اپنی حکومت اور جماعت کے علاوہ اپنے ذاتی وسائل بھی بھرپور طور پر استعمال میں لایا کرتے تھے اور یوں دل جیت لیتے تھے۔ میں مورکھ تو ان کی جماعت کی ان کی غیر حاضری میں سرپرست اعلیٰ محترمہ کلثوم بیگم سے بھی بہت امیدیں باندھ بیٹھا تھا کہ بڑی باہمت خاتون ہیں مگر وہ اور ان کی جماعت وقت کی بھول بھلیوں سے نہیں نکل سکی۔ حالانکہ ان بھول بھلیوں سے نکلنے کا وقت یہی تھا ..... پاکستان مسلم لیگ کے بعد میری نظریں جماعت اسلامی کی طرف ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہیں کہ اس ضمن میں جماعت کا ریکارڈ اچھا ہے وہ صومالیہ کے قحط زدگان کے لئے چندہ جمع کرتی ہے' تھر اور بلوچستان ہمارے اپنے پاکستان کے اندر واقع ہے مگر 12 اکتوبر کے بعد سے جماعت غالب کے اس شعر کی تصویر نظر آتی ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے' کلیسا میرے آگے

لیکن میں خوش قسمت ہوں کہ اس نے تھر بلوچستان فنڈ کھول دیا ہے۔ اللہ سب کو توفیق دے اس میں حصہ لینے کی۔ مگر معلوم نہیں کیوں اس موقعہ پر مجھے ان کے کھالیں جمع کرنے والے سیاسی کمنٹیٹر کیوں یاد آ رہے ہیں وہ خواب خرگوش سے کب جاگیں گے۔

بلوچستان اور تھر میں جس طرح بھوک اور پیاس سے رحمت اللعالمین کے امتی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں' میرا خیال تھا کہ ہماری جہادی تنظیمیں اس بھوک پیاس کے خلاف جہاد کا اعلان کریں گی اور سر پر کفن باندھے ہوئے میدان عمل میں اتریں گی مگر کم از کم میری نظروں سے ان کا کوئی خالی خولی بیان بھی نہیں گزرا اور کچھ نہیں تو اپنے بھائیوں سے اظہار ہمدردی ہی کیا ہوا!

جب کسی گھر میں مرگ ہوتی ہے تو کوئی خاندانی دشمن بھی اگر اس موقع پر خلوص نیت سے شریک غم ہو یا کسی مصیبت کے وقت کسی کے کام آئے تو دشمنیاں اور نفرتیں دوستی اور محبت میں بدل جایا کرتی ہیں۔ ہم لوگوں نے تھر اور بلوچستان کے فاقہ زدگان ہی کو نہیں' پاکستان سے محبت کے دعوے دار ہم ''محب الوطنوں'' نے اپنے ان کروڑوں پاکستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑا ہوا ہے جن کی زندگیوں میں دکھوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پاکستان کے دل لاہور شہر کے عین مرکز میں' میں نے کئی دفعہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کوڑے کے ڈھیر سے کتوں اور بلیوں کے ساتھ اپنی خوراک تلاش کرتے دیکھا ہے۔ کیا غربت' افلاس اور فاقوں کی کوکھ سے جنم لینے والی اس نسل کو کشمیر' پاکستان' اسلام' حب الوطنی' آئی ایم ایف' جمہوریت' آئین اور فوجی بیوروکریسی وغیرہ کے موضوعات سمجھ میں آ سکتے ہیں؟ ان حالات میں' مزید پچاس سال سمجھا کر دیکھ لیں' انہیں سمجھ نہیں آئیں گے!

◆◆◆

ماں کے آنسو

میاں شہباز شریف کی ضعیف والدہ جیل میں اپنے بیٹے شہباز سے ملنے کے لئے گئی اور جیل والوں نے ملاقات کرانے سے انکار کر دیا۔ جس پر یہ دکھی ماں روتی ہوئی واپس چلی گئی!

میرے خیال میں جس کسی نے ایک ماں کو اس کے سلاخوں کے پیچھے قید بیٹے سے ملنے نہیں دیا وہ کوئی بہت ہی بدنصیب شخص ہے' یا تو اس شخص کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی ماں کی وفات واقع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ ماں کی محبت' شفقت اور عظمت سے واقف ہی نہیں ہو سکا' یا وہ سنگدل شخص ہے کہ ساری عمر خود اس کی اپنی ماں اس کے ہاتھوں روتی رہی ہے۔ لہٰذا کسی دوسرے کی ماں کے آنسو اس کے دل پر کیا اثر کر سکتے ہیں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ماں بیٹے کے ملنے میں کیا قباحت تھی' اس ماں کے ہاتھوں میں بم یا کلاشنکوف تو نہیں تھا' زیادہ سے زیادہ اپنے بچے کے لئے کھانے کی کوئی چیز' لب پر دعائیں اور دل میں آہیں ہوں گی اور ان چیزوں سے کسی حکومت کو بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔

اور یہ ماں بھی شہباز شریف کی ہے۔ جس کے بیٹے کی بہترین انتظامی صلاحیتوں' پنجاب کے لئے ترقیاتی کاموں اور سب سے پرانے سماجی' معاشی اور سیاسی ناسوروں سے عوام کو نجات دلانے کے حوالے سے پنجاب کے عوام حتیٰ کہ خود ہمارے فوجی بھائی بھی دل سے معترف ہیں۔ پھر اسے عدالت سے بری بھی کر دیا گیا ہے۔ ابھی تک اس پر کوئی الزام بھی ثابت نہیں ہوا' اس کے باوجود یہ پابندیاں جو عام قیدیوں پر بھی لاگو نہیں ہوتیں۔ ایک قابل احترام شخص پہ کیوں عائد کی جا رہی ہیں؟

ایسے مواقع پر عموماً سارا بوجھ مشیروں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ آخری ذمہ داری بہرحال مشورہ ماننے والے ہی پر عائد ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت کو ابتداء میں کچھ لوگوں نے نواز شریف دشمنی کی بنا پر خوش آمدید کہا تھا' اب ان ''بعض معاویہ'' والوں کی حمایت سے بھی آہستہ آہستہ محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دوکاندار پریشان ہیں' کاروباری لوگ پریشان ہیں' غریب آدمی پریشان' بیوروکریسی پریشان' ہے سیاسی کارکن پریشان ہیں اور جنھیں پاکستان کا وجود حرم کعبہ کی طرح مقدس لگتا ہے' وہ اس کی سلامتی کے حوالے سے پریشان ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ جنگ چھڑ جاتی ہے تو پاکستان کے تمام روایتی دوست اس دفعہ عملی طور پر بلکہ شاید اخلاقی طور پر بھی ہماری مدد سے کترائیں اور جہاں تک پاکستانی عوام کا

تعلق ہے تمام تر کوششوں کے باوجود ان کی اکثریت ابھی تک پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے جن کی قیادت شدید ابتلا کے دور سے گزر رہی ہے۔ خصوصاً میاں نواز شریف ایسے نیک دل انسان اور ان کے دینی گھرانے کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا۔ اس سے لوگوں کے دل زخمی ہیں اگر لوگ سڑکوں پر نہیں آئے تو ان کا انجام دیکھ کر نہیں آئے جو سڑکوں پر آئے تھے' لوگوں کے جذبات سے اندازہ صرف منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال ان حالات میں جب ملک کی سلامتی خطرے میں ہو قومی قیادت اور ان کے پیروکاروں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے' فوجی حکومت کو باہر سے کوئی مدد نہیں مل سکی' کم از کم اپنے لوگوں کو تو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مثبت اقدامات کریں!

میں معذرت چاہتا ہوں' مجھے لگتا ہے میرا لہجہ کچھ سخت ہو گیا ہے مگر جب مسئلہ پاکستان کا ہو' میں لفظوں کا مناسب استعمال بھول جاتا ہوں۔ میں موجودہ فوجی حکومت سے دست بستہ گذارش کروں گا کہ وہ مخبروں کی غلط ملط رپورٹوں' خوشامدوں' اقتدار میں موجود سویلین افراد کی ہوس اقتدار اور اقتدار سے باہر عوامی حمایت سے محروم سیاسی جماعتوں کے بیانات کو اپنی موجودگی کا جواز نہ بنائیں' ملکی حالات انتہائی خطرناک نہج پر پہنچ چکے ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ دیکھ چکے ہیں۔ اب قوم حوصلہ افزا اور بہلاوا دینے والے بیانات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں' لہٰذا جتنی جلدی ممکن ہو' براہ کرم واپس اپنی بیرکوں میں جائیں اور حکومت سیاستدانوں کے حوالے کریں جن کی ساری تربیت اسی حوالے سے ہے! اور ہاں کسی ماں کی آنکھوں سے آنسو نہ بہنے دیں۔ میں نے سنا ہے کہ جب کسی ماں کی آنکھ سے آنسو بہتا ہے تو اس سے عرش عظیم ہل جاتا ہے۔

◆◆◆

ایک مگر مچھ اور دوست کی کہانی

یہ نہ لطیفہ ہے' نہ کوئی حکایت ہے' خدا جانے کیا ہے۔ میں آپ کو سنانے لگا ہوں۔ ایک شخص ایک بہت بڑے دریا میں تیر رہا تھا اور ساتھ ساتھ سگریٹ بھی پی رہا تھا۔ پیچھے سے ایک مگر مچھ نے اس کے پاؤں سے کھانا شروع کر دیا مگر وہ شخص سگریٹ پیتا رہا۔ اس دوران مگر مچھ نے اپنا کام جاری رکھا اور اس شخص کا آدھا جسم چبا گیا' لیکن اس کی سگریٹ جاری رہی۔ حتیٰ کہ مگر مچھ نے اس کے بقیہ جسم کو بھی چبانا شروع کر دیا۔ اور وہ اس طرح سگریٹ پیتا رہا۔ اس دوران اس کا ایک دیرینہ دوست تیرتا ہوا اس کے قریب سے گزرا اس نے ہاتھ میں سگریٹ پکڑا ہوا تھا' دوست نے مگر مچھ کی زد میں آئے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کیا اور کہا'' یار ذرا میرا سگریٹ تو سلگا دو۔''

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ یہ نہ لطیفہ ہے اور نہ حکایت ہے۔ کیونکہ اگر یہ لطیفہ ہے تو جب میں نے سنا' مجھے ہنسی نہیں آئی۔ اگر یہ حکایت ہے تو بہت مختلف قسم کی حکایت ہے کیونکہ ایسی حکایت میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ چنانچہ مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے آج کے پاکستانی معاشرے کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ ایک تصویر ہے جس کا مصور بہت سنگدل شخص ہے' اس نے تصویر بناتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ میرے جیسے کمزور دل بھی اس معاشرے میں رہتے ہیں۔ جن کی آنکھیں اس تصویر کی تاب نہیں لا سکتیں!

کیا صورتحال ہو بہو یہی نہیں ہے کہ ''مگر مچھ'' ہمارے وجود کو چباتا رہا اور ہم اس سے بے نیاز اپنے گردوپیش کے سب خطرات اور خدشات کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑاتے رہے حتیٰ کہ ہمارا وجود آدھا رہ گیا۔ اس کے بعد بھی ہمیں ہوش نہیں آیا ''مگر مچھ'' نے اپنا کام جاری رکھا اور ہم اپنے کاموں میں مگن رہے۔ تعیشات کے حصول کے کام' سرکاری ریٹ پر قیمتی پلاٹوں کے حصول کا کام' اپنی پروموشن کا کام' بنک بیلنس میں اضافے کا کام' ظالم کے آگے سر جھکانے کا کام' مظلوم سے منہ چھپانے کا کام' جھوٹ اور سچ میں فرق مٹانے کا کام اور مصلحتوں کے پیش نظر ہتھیار ڈالنے کا کام.... اور ہم بھول گئے کہ اگر ہمارا وجود ہی باقی نہ رہا تو یہ سب کچھ کس کے کام آئے گا؟ ''مگر مچھ'' اپنا کام کر رہا ہے' وہ ہماری شہ رگ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ جو ہمیں اس حال میں دیکھ رہا ہے' وہ بھی ہمیں اس خطرے سے آگاہ تک نہیں کرتا بلکہ جو تھوڑا بہت فائدہ اس حالت میں بھی وہ حاصل کر سکتا

ہے۔ وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس شخص کی حفاظت بطور دوست اس کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ اس کی بجائے وہ اس نادان کی آخری ہچکی سے پہلے اپنا سگریٹ سلگوانے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ جو کچھ اس کے پاس بچ گیا ہے اس سے بھی فائدہ اٹھالیا جائے۔ کیا یہ سنگدلانہ صورت حال نہیں ہے' کیا مصور کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ پاکستان اور پاکستان میں بسنے والوں کے لئے اس تصویر میں ان کے وہ خدوخال واضح کرے جو آئینے میں نظر آئیں تو آئینہ چیخ کر رہ جائے؟

شاید یہ بہت ضروری تھا' وقت گزرتا جا رہا ہے اور ہم وقت سے کوئی سبق نہیں سیکھ رہے اگر کوئی سبق سیکھ رہے ہیں تو وہ صرف یہ کہ جو اچھا وقت گزر جائے' وہی ٹھیک ہے۔ ہم اس اچھے وقت کی قیمت ہر وقت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں' اپنے وجود سے زیادہ بھاری قیمت اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہم پہلے آدھے رہ گئے تھے' اب ہم اس سلسلے کا باقی سفر طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے دوست ہمارا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارا جو دیرینہ دوست ہمارے ساتھ اس دریا میں ہے اس کی دوستی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہمارے پاس آتا ہے اور کہتا ہے ''یار ذرا سگریٹ تو سلگا دینا۔''

کہیں یہ دوست اور یہ مگرمچھ ایک ہی چیز تو نہیں ہیں؟

◆◆◆

عدلیہ کی حیرت انگیز آزادی!

سپریم کورٹ کے فل بنچ نے نواز شریف کی منتخب حکومت کی برطرفی کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اور اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ فوجی اقدام ماورائے آئین ہے۔ مگر 12 اکتوبر کی صورت حال کے وقت آئین میں اس کا کوئی حل موجود نہیں تھا' فوج نے بہ امر مجبوری یہ قدم اٹھایا ہے۔ سپریم کورٹ نے جنرل پرویز مشرف کی حکومت کو تین سال میں ایجنڈا مکمل کر کے نوے دن میں الیکشن کرانے کی ہدایت کی ہے۔ یہ تین سال کی مدت 12 اکتوبر 99ء سے شروع ہوگی نیز جنرل پرویز مشرف کی حکومت کو آئین اور قانون میں ترمیم کا حق حاصل ہوگا۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ 12 اکتوبر سے قبل ملک میں حقیقی جمہوریت نہیں تھی اور شخصی اقتدار رائج تھا۔ سابق حکومت نے عدلیہ کے اختیارات کم اور فوج میں اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حکومت کا آئینی اور اخلاقی جواز مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا!

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو بعض قانونی' سیاسی اور عوامی حلقوں کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ راجہ ظفر الحق نے کہا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے اور جنرل مشرف کے ایجنڈے میں حیرت انگیز مماثلت ہے' منور حسین نے حکومت کو آئین میں ترمیم کا حق دینے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ حاجی عدیل نے فیصلے کو جس کی لاٹھی اس کی بھینس قرار دیا ہے۔ بیگم کلثوم نواز نے کہا ہے کہ ہمیں سپریم کورٹ سے یہی امید تھی۔ سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس خلیل الرحمان نے جنہوں نے پی سی او کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور ججی سے ہٹا دیئے گئے تھے' کہا ہے کہ فوجی حکومت کو آئین میں ترمیم کا حق دینا بدقسمتی ہے نیز فیصلے میں حکومت کو جو تین سال کا وقت دیا گیا ہے وہ بن مانگے ہی دے دیا گیا ہے۔

تاہم میں ذاتی طور پر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے بارے میں سوائے قصیدے کے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سپریم کورٹ کے بارہ معزز ججوں نے فیصلہ سنایا ہے۔ یہ سو فیصد ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ اور انہوں نے فیصلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ ان کے نزدیک آئین اور قانون کے عین مطابق ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے دباؤ اور ترغیب یا تحریص کا کوئی دخل نہیں۔ میری اس رائے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری عدلیہ کی تاریخ پہلے دن سے شاندار رہی ہے۔ وہ تو کبھی وزیر اعظم کے دباؤ میں نہیں آئی۔ انہیں آئینی تحفظ فراہم کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک وزیر اعظم کو پھانسی بھی دینا پڑی تو انہوں نے آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے اسے پھانسی کے تختے

پر بھی چڑھا دیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری عدلیہ خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتی۔

عدلیہ کے بارے میں میری متذکرہ رائے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں پاکستانی مسلمانوں کو جانتا ہوں۔ پاکستانی مسلمان اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود عالم اسلام کے بہترین مسلمان میں سے ہے۔ یہ نماز روزے کا پابند ہے۔ عموماً جھوٹی قسم نہیں کھاتا اور روز قیامت پر اپنے دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتا ہے۔ یہ میں ایک عام مسلمان کی بات کر رہا ہوں جب کہ ہماری عدلیہ کے ارکان تو خدا خوفی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں سے بیشتر احکام اسلامی کے پابند ہیں۔ اور قیامت کے روز حضور کی شفاعت کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جس انصاف کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے انہوں نے حلف اٹھایا تھا' کوئی فیصلہ سناتے وقت وہ بھول جائیں کہ اس عدالت کے علاوہ ایک عدالت اور بھی ہے۔ نیز انہیں یاد نہ رہے کہ قیامت کے روز انہوں نے خدا کے علاوہ نبی اکرم کو بھی منہ دکھانا ہے۔ میں اس قسم کے کسی مفروضے کو نہیں مانتا اور یوں میرے نزدیک سپریم کورٹ' ہائی کورٹ یا کسی بھی عدالت کے فیصلے پر تنقید کرنا' اعلیٰ عدالتوں کی توہین ہی نہیں بلکہ بدگمانی کی بدترین شکل بھی ہے۔ جس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے!

''سپریم کورٹ کے متذکرہ فیصلے کے بعد موجودہ فوجی حکومت پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔ اب انہیں مقررہ وقت پر اپنا ایجنڈا مکمل کرنا ہوگا' سابقہ حکومت نے جمہوریت کو تباہ کر دیا تھا' انہیں جمہوریت کو بحال کرنا ہوگا' سابقہ حکومت نے آئین مسخ کر دیا تھا' انہیں اصلی شکل میں واپس لانا ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی سابقہ حکومت نے جتنے برے کام کئے تھے۔ موجودہ حکومت کو انہیں اچھے کاموں میں تبدیل کرنا ہوگا۔ تاکہ سپریم کورٹ نے سابقہ حکومت کو جن جرائم کا مرتکب قرار دیا ہے موجودہ حکومت ان کا ازالہ کر سکے۔ سپریم کورٹ نے یہ بھی تو کہا ہے کہ حالیہ فوجی اقدام اگرچہ ماورائے آئین ہے۔ لیکن چونکہ آئین متذکرہ صورت حال کی اصلاح کے لئے کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے فوج کو مجبوراً کاروائی کرنی پڑی اور یوں اگر دیکھا جائے تو موجودہ صورت حال کی تمام تر ذمہ داری آئین پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے آئین کو بھی ''ٹھیک'' کرنا چاہیے۔

میں آخر میں سپریم کورٹ کے اس دلیرانہ فیصلے پر اسے تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں' فوج کو حکم دینا کہ وہ پاکستان پر تین سال سے زیادہ حکومت نہ کرے اور نوے دنوں میں الیکشن کرائے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے اور ہماری عدلیہ کی تاریخ میں ایک اور روشن باب ہے۔ وزیر اطلاعات جاوید جبار نے صحیح کہا ہے کہ ایسے حالات میں عدلیہ کی اتنی آزادی کی مثال کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ میں خود عدلیہ کی اتنی آزادی پر حیران ہوں۔ خدا کرے اسے کسی دشمن کی نظر نہ لگے جائے۔

◆◆◆

ایک اور ایف آئی آر!

ڈسٹرکٹ جیل اٹک کے قاسم بلاک میں شیش ناگ کے بعد ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب کو میاں نواز شریف کے صاحبزادے حسین نواز کے سیل میں ڈیڑھ انچ والا خطرناک جنگلی نسل کا سیاہ رنگ کا بچھو نکل آیا۔ حسین نواز کے مطلع کرنے پر ڈیوٹی پر متعین گارڈ نے کہا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے پاس سیل کی چابی نہیں ہے۔ اور یوں وہ اس سلسلے میں کوئی مدد کرنے سے معذور ہے۔ اس نے بتایا کہ بڑے صاحب آرام کر رہے ہیں اور انہیں ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال حسین نواز نے اپنی جوتی سے بچھو مار ڈالا۔ اتوار کی صبح کو جب مردہ بچھو سپرنٹنڈنٹ جیل فرخ زاد کو پیش کیا گیا تو موصوف نے کہا ''پرانی کچی جیل سے بچھو نکلنا معمولی بات ہے' اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟''

بات تو سپرنٹنڈنٹ جیل کی ٹھیک ہے اس ضمن میں ہر اس شخص کی بات ٹھیک ہے جو اس سیل سے باہر ہے جہاں شیش ناگ اور بچھو وغیرہ پائے جاتے ہوں۔ چنانچہ آج جب میں نے اپنے عزیز دوست جو بہت خوبصورت شاعر بھی ہیں' کے کالم میں پڑھا کہ اٹک جیل کے قیدیوں کے کھانے کا جو مینو ہے اس کے بارے میں جان کر کالم نگار کے ایک ٹیکسی ڈرائیور دوست نے کہا یہ سب کچھ اسے کھانے کو مل جائے تو وہ اپنی بقیہ ساری عمر اٹک جیل کے اس سیل میں گزارنے کو تیار ہے' تو مجھے اس میں کسی قسم کی سنگدلی نظر نہیں آئی۔ تاہم اس ٹیکسی ڈرائیور کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اگر قیدیوں کے لئے انڈا مکھن وغیرہ کا مینو موجود ہے تو شیش ناگ اور بچھو کا مینو بھی کچھ اتنا برا نہیں' اس مینو میں عوام کے منتخب نمائندے اور ان کے خاندان کے بچے شامل ہیں۔ اور وہ یہ ممکن ہے حشرات الارض کا دماغ اب اتنا اونچا ہو گیا ہو کہ وہ عوام کے منتخب نمائندوں کے علاوہ عام لوگوں کو لفٹ کرانا اپنے اسٹیٹس کے خلاف سمجھتے ہوں' تاہم یہ ایک مفروضہ ہے اور مفروضہ پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کرنا چاہیے۔

میاں نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جب شرمیلا فاروقی کے لاکر سے لاکھوں ہیرے جواہرات برآمد ہوئے اور اس کے علاوہ اس خاندان کی کروڑوں کی بدعنوانیاں سامنے آئیں تو اخباروں میں شرمیلا فاروقی کی تھانے میں بیٹھی ہوئی تصویر چھپی دیکھ کر کالم نگاروں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اور انہوں نے بہت واویلا کیا تھا' خود میاں نواز شریف بھی یہ تصویر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور شرمیلا فاروقی کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی طرح جب آصف زرداری جیل میں زخمی ہو گئے تو اس پر بھی خاصا احتجاج ہوا تھا۔ مگر

یہ سب اس دور کی باتیں ہیں ''جب ملک میں حقیقی جمہوریت رائج نہ تھی۔ ادارے تباہ کر دیے گئے تھے۔ دہشت گردی عروج پر تھی' کسی کی جان مال محفوظ نہ تھی۔ تاجر علماء اور سیاستدان حکومت سے نالاں تھے۔ عوام مہنگائی سے تنگ تھی۔'' اب چونکہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ملک میں حقیقی جمہوریت نافذ ہوگئی ہے۔ انسانی حقوق بحال ہو گئے ہیں۔ قانون اور آئین کی بالادستی قائم ہے۔ کسی کو قانونی تقاضے پورے کئے بغیر گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ دہشت گردی کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ غربت اور مہنگائی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ مان وامان کا یہ عالم ہے کہ لوگ بازاروں میں سونا اچھالتے ہوئے گزرتے ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ اس پر للچائی ہوئی نظر ڈال سکے' خودکشیاں' قتل' ڈاکے' سب ماضی کی یادگار بن گئے ہیں۔ سرکاری تحویل میں تاجر یا صنعتکار کے علاوہ کسی کی مجال نہیں کہ وہ دم توڑ سکے۔ علماء اور مشائخ خوش ہیں کہ سودی نظام کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور سپریم کورٹ کی طرف سے ملے اختیار کو استعمال میں لاتے ہوئے آئین میں ترمیم کے ذریعے اسلامی نظام نافذ کر دیا گیا ہے۔ ٹی وی بھی صالح ہو گیا ہے۔ اس طرح ادارے بھی مستحکم ہو گئے ہیں کہ مارشل لاء کے ہتھوڑے سے بھی نہیں توڑے جا سکتے۔ چنانچہ اتنے اچھے حالات میں عوامی نمائندوں یا ان کے بال بچوں کے سیل سے شیش ناگ یا جنگلی بچھو کا نکلنا کوئی اتنا غیر معمولی واقعہ نہیں جس سے انسانی حقوق کی تنظیم کو یا کسی انسان دوست دانشور کو یا پھولوں کی سیج پر آرام کرنے والے ''صحت مند اپوزیشن'' کے کسی رکن کو احتجاج کی ضرورت محسوس ہو کیونکہ جب اتنا کچھ ٹھیک ہو گیا تو اس طرح کی چیزیں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ حسین نواز نے بچھو مار کر کوئی اچھی بات نہیں کی' ممکن ہے یہ سرکاری بچھو ہو' اور ڈیوٹی پر ہو' یوں اس نوجوان پر سرکاری کاموں میں مداخلت اور سرکاری اہلکار پر قاتلانہ حملے کا مقدمہ بن سکتا ہے۔ کیونکہ فی الحال اسے بغیر کسی مقدمے کے جیل میں رکھا گیا ہے۔

◆◆◆

حادثے

شنید یہ ہے کہ شہر میں چلنے والی بسوں پہ جو کلر فل اشتہارات پینٹ کئے گئے ہیں' انتظامیہ انہیں صاف کرنے اور بس کے اور یجنل کلر کی واپسی کے لئے ہدایات جاری کرنے والی ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی گئی ہے کہ ان اشتہاروں کی وجہ سے لوگوں کی توجہ ٹریفک سے ہٹ جاتی ہے۔ اور یوں ان سے حادثات کا امکان ہے!

یہ بڑی عجیب وغریب اطلاع ہے کیونکہ ان اشتہاروں کی وجہ سے بسیں اتنی خوبصورت لگتی ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں ابھی تک میں نے ان بسوں پر کوئی ایسا اشتہار نہیں دیکھا' جس میں کوئی ایسا چہرہ دکھایا گیا ہو جس کے لئے جان خطرے میں ڈالنے کا جواز موجود ہو' میں نے دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں جن میں لندن' پیرس اور نیویارک بھی شامل ہیں سفر کیا ہے۔ ان ملکوں میں انسانی جان کو بے حد قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ مگر وہاں اس قسم کی کوئی احتیاط مجھے نظر نہیں آئی۔ حالانکہ ان ملکوں میں چلنے والی بسوں پر واقعی کچھ اشتہارات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حوالے سے جان کی بازی لگانے کا امکان موجود رہتا ہے۔ مگر وہاں کی ''بے درد'' حکومتوں نے ایسی پابندی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا کیونکہ ان اشتہارات کی وجہ سے کبھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں!

ہمارے ہاں اگر کہیں اس نوع کے حادثے کا امکان ہے تو وہ لاہور میں میکلوڈ روڈ ہے۔ جہاں نیم عریاں لباس میں ملبوس ہیروئنوں کے جہازی سائز کے ہورڈنگز آویزاں نظر آتے ہیں۔ اور ان کا ہر انگ کچھ اتنا تنگ دکھایا جاتا ہے کہ ''سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'' والا مصرعہ یاد آجاتا ہے! سو ٹریفک کے حادثات کا خدشہ اگر کہیں ہے تو وہ ان علاقوں میں ان ہورڈنگز کی وجہ سے ہے بلکہ کمزور دل حضرات کو تو ایسے ہوشربا مناظر سے ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے!

ٹریفک کے حادثات کا امکان صرف ان تصویروں سے نہیں بلکہ چلتی پھرتی تصویروں سے بھی ہے جن کے متعلق میر نے کہا ہے۔

دلی کے نہ تھے کوچے' اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی' تصویر نظر آئی

اور یہ دلی کے کوچے اور ان میں نظر آنے والی تصویریں ان دنوں پاکستان کے ہر شہر میں ہیں اور ''مووا وور'' کے طور پر

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا' عام دیدار یار ہوگا

والی صورتحال بھی پیدا ہو چکی ہے۔ جس کی وجہ سے حادثات کی بھرمار کے خدشے بہرحال موجود ہیں۔ بلکہ ایک دل جلے شاعر نے تو اس ضمن میں حفظ ماتقدم کے طور پر یا اپنے دفاع میں یہ شعر بھی کہا تھا۔

سبھی مجھ سے ہی کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا' نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

خیر یہ ساری بات تو آپ ''ازراہ تفنن'' والے کھاتے میں ڈالیں کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ٹریفک کے حادثات بسوں پر پینٹ کئے گئے اشتہاروں' ہیروئنوں کی ہورڈنگز یا چلتی پھرتی تصویروں کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ ٹریفک کے اصولوں کی دانستہ خلاف ورزی کے علاوہ اس کی ایک بنیادی وجہ لوگوں کی معاشی پریشانیاں ہیں وہ سڑک پار کر رہے ہوتے ہیں یا سائیکل پر جا رہے ہوتے ہیں۔ مگر بجلی' سوئی گیس اور پانی کے بل' مکان کا کرایہ' بچوں کی فیس' جوان بیٹی یا بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر' ہمسائے کی خوشحالی اور قریب سے گذرنے والی ڈانگوں سے ماپے جانے والی کاروں کی گردان کے دماغ میں گھسی جا رہی ہوتی ہیں۔ ان بیچاروں کی نظریں کسی بس پر لگے سگریٹ کے اشتہار پہ کیا اٹھنی ہیں' انہیں اگر حادثات سے بچانا ہے تو بسوں کو اس طرح خوبصورت رنگین اشتہاروں سے مزین رہنے دیں۔ اور اس کی بجائے ان کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دیں۔ تاہم دوسرا کام ذرا حکومتوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سارا زور پہلے والے آسان کام پر صرف کر دیتی ہیں۔ تاکہ عام آدمی کو یہ تاثر ملے کہ حکومت کو اس کی جان کی کتنی فکر ہے؟ لہٰذا موجودہ حکومت بھی پہلے والا آسان کام بڑے شوق سے انجام دے' ہم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

◆◆◆

کلچرل ونگ

بہت عرصے کے بعد مذہبی حلقوں سے کوئی اچھی خبر سننے کو ملی ہے بلکہ میں اس خبر کو تازہ ہوا کا ایک جھونکا سمجھتا ہوں۔ عوامی تحریک کے سربراہ پروفیسر طاہر القادری نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں عوامی تحریک کا کلچرل ونگ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے اور معروف ٹی وی اداکار فردوس جمال کو اس ونگ کا مرکزی سیکرٹری جنرل نامزد کیا گیا ہے۔ صدر اور باقی سارے سیٹ اپ کا اعلان بدھ کو ہوگا' اس موقع پر پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری نے اپنی گفتگو میں کہا کہ کلچرل ونگ کے قیام کا مقصد فلم اور ڈرامہ کو اکیسویں صدی اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کلچر کو صحت مند بنیادوں پر فروغ دینا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ پاکستان عوامی تحریک مذہبی جماعت نہیں ہے' مذہبی جماعت منہاج القرآن ہے۔ عوامی تحریک مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی جیسی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کے درمیان پل تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس موقع پر فردوس جمال نے بھی بہت معقول گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انہوں نے افلاطون کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ اس نے ہزاروں سال پہلے کہا تھا کہ معاشرے کو برباد کرنے والے آرٹ کو آرٹ نہیں کہا جا سکتا۔ فردوس جمال نے کہا کہ اسلام ایک لبرل مذہب ہے اور اگر کوئی اسے محدود کرتا ہے تو اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں۔

میں دل کی گہرائیوں سے عوامی تحریک کے کلچرل ونگ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور اس کے لئے اپنا عملی تعاون پیش کرتا ہوں۔ فردوس جمال ایک منجھے ہوئے اور پڑھے لکھے فنکار ہیں۔ فنکار برادری میں انہیں عزت اور احترام کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے کام بخوبی سمجھتے ہیں۔ تاہم چونکہ ٹی وی ڈرامے کے حوالے سے میرا تعلق بھی فنکار برادری سے ہے۔ اور یوں میں بھی کچھ نہ کچھ مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ کلچرل ونگ پر مردوں کی اجارہ داری نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اگر اس کے سیکرٹری جنرل فردوس جمال ہیں تو محض لفظ ''فردوس'' سے خواتین فنکاروں کو مطمئن نہیں کیا جا سکے گا۔ بلکہ بدھ کے روز ہونے والی نامزدگیوں میں صدارت کے لئے کسی مرد کی بجائے خاتون فنکارہ کو چنا جائے۔ فلمی ہیروئنوں میں سے اگر انتخاب کرنا ہو تو صائمہ' ریشم' میرا' ریما' نیلی' نور اور بہت سی نئی ہیروئنیں موجود ہیں۔ اگر پی ٹی وی کی اداکاراؤں میں سے کسی کو لینا ہے تو جیا علی' ارم حسن' ماریہ واسطی' سعدیہ امام اور نرما وغیرہ سے انتخاب کیا جا سکتا ہے' اسی طرح گلوکاراؤں میں شازیہ منظور' شبنم مجید' حمیرا ارشد' زرقا' عارفہ صدیقی'

حمیرا چنا' حدیقہ کیانی' کومل رضوی اور فریحہ پرویز وغیرہ صدارت کے لئے موزوں ہیں تاہم جس طرح فردوس جمال کا انتخاب تحریک کے قائد پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری نے بذات خود کیا ہے اسی طرح کلچرل ونگ کی صدارت کے لیے کسی خاتون فنکارہ کی نامزدگی بھی خود پروفیسر صاحب کو کرنا چاہیے۔ ایک تو اس لئے کہ خواتین فنکاراؤں کے ذہن میں یہ غلط فہمی جنم نہ لے کہ تحریک کے قائد نے اس کام کو کم تر سمجھ کر کسی دوسرے کے سپرد کر دیا اور یوں اسلامی تعلیمات کے برعکس خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا اور دوسرے اس لئے کہ پروفیسر صاحب اکثر اچھے کاموں کی ابتدا سے پہلے استخارہ کرتے ہیں چنانچہ استخارے کے نتیجے مین جو فنکارہ نامزد کی جائے گی اس کے فیوض و برکات کچھ اور ہی ہوں گے۔ استخارہ میں اگر مسرت شاہین کا نظارہ ہو جائے تو اس تجربہ کار فنکارہ کے سیاسی تجربہ سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ نہ مانیں اور ضد کریں تو الائنس کی بنیاد بھی رکھی جا سکتی ہے۔

امریکہ اور روس کے درمیان جب سرد جنگ جاری تھی' امریکہ نے ایک محاذ روس اور کمیونزم کے حوالے سے لطیفوں اور جگتوں کا بھی کھول رکھا تھا چنانچہ روس کی شکست میں ان امریکی جگتوں اور لطیفوں کا بھی بہت دخل تھا۔ پروفیسر طاہر القادری اور کلچرل ونگ میں ان کے رفیق کار فردوس جمال چونکہ فن کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ لہٰذا پاکستان اور اسلام دشمن طاقتوں کو شکست دینے کے لئے انہیں چاہیے کہ وہ جگت بازوں کی بھی ایک کمیٹی بنائیں جس کے ارکان اس محاذ پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ ہمارے پاس بہت اعلیٰ درجے کے جگت باز موجود ہیں۔ ان میں امان اللہ' عابد خان' سہیل احمد' منیر نیازی' مستانہ اور جواد وسیم وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے منیر نیازی الحمرا میں ہونے والے ڈراموں یا شادی بیاہ کی تقریبات میں بوجہ مخصوص مسائل شرکت نہیں کرتے' بلکہ اخباری انٹرویوز میں اگر ''گرائپ واٹر'' کے تعاون سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ امید ہے فردوس جمال اس کا انتظام کر لیں گے۔

ابھی کلچرل ونگ کا تفصیلی منشور سامنے نہیں آیا لہٰذا یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ ونگ کیا کچھ کرے گا۔ رقص' موسیقی' مصوری' خطاطی اداکاری' گلوکاری وغیرہ کے پروگراموں کے لئے کوئی ہال کرائے پر لیا جائے گا یا منہاج القرآن کی وسیع عریض عمارت ایک ونگ فنون لطیفہ کی ترویج کے لئے وقف ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ مذہبی حلقے اس پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر یہ کام غیر اسلامی ہوتے تو پروفیسر طاہر القادری ایسے اسلامی سکالر کلچرل ونگ کا قیام ہی عمل میں نہ لاتے' ویسے بھی ہمارے علماء جب تقریر کرتے ہیں' اس میں گلوکاری' اداکاری' لفظوں کی مصوری ایسی فنکارانہ ادائیں شامل ہوتی ہیں اور مذہبی جماعتوں کے جلسوں' جلوسوں میں پرجوش نغمے کیسٹ پر بجائے جاتے ہیں جن میں آلات موسیقی بھرپور استعمال ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک رقص کا تعلق ہے اپنے مذہبی رہنماؤں کی موجودگی میں کرتے ہیں۔ لہٰذا متذکرہ فنون میں سے کسی بھی فن لطیف کی حرمت کے

حوالے سے مذہبی سیاسی جماعتوں میں عملی طور پر اختلاف نہیں پایا جاتا۔ مسئلہ صرف عورت کے رقص کا رہ جاتا ہے۔ اگر خلوص اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کیا گیا تو امید ہے اس کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی کیونکہ فردوس جمال نے اسلام کو ایک لبرل مذہب یونہی قرار نہیں دیا ہوگا۔

◆◆◆

ہنسنا منع ہے!

خبر رساں ایجنسی این این آئی کے مطابق اٹک قلعہ میں قائم جیل میں معزول وزیراعظم میاں نواز شریف' معزول وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف اور ڈاکٹر فاروق ستار کی صدیوں پرانی بیرک ''جسے سب جیل کا درجہ دیا گیا ہے'' میں شیش ناگ نسل کے کوبرا سانپوں کا جوڑا نکل آیا۔ نرکوبرا کو ڈاکٹر فاروق ستار کے مشقتی نے ہلاک کر دیا جبکہ مادہ کوبرا ڈیڑھ صدی قبل تعمیر ہونے والی اس خستہ حال بیرک کے کسی بل میں روپوش ہونے میں کامیاب ہوگئی۔

جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تینوں اسیر جیل میں موجود تھے۔ ڈاکٹر فاروق ستار کو کوبرا سانپوں کی موجودگی کا علم ان کی پھنکار سے ہوا' مشقتی نے نرکوبرا ہلاک کرنے کے بعد سب جیل کے سپرنٹنڈنٹ محمد نواز کھوکھر اور اٹک قلعہ کے ایس ایچ او شیخ رضا حسین کو اس واقعہ کی اطلاع دی جنہوں نے اعلیٰ حکام کو آگاہ کر دیا۔ این این آئی کے مطابق سب جیل کا عملہ مادہ کوبرا کے زندہ بچ جانے سے بہت خوفزدہ ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل اس کوٹھڑی سے شیش ناگ اور میاں نواز شریف کے فرزند بیرسٹر حسین نواز کی کوٹھڑی سے سیاہ رنگ کا خطرناک پہاڑی بچھو نکل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ خطرناک نسل کے سانپوں اور بچھوؤں کا مخصوص افراد کے سیلوں میں سے نکلنا حکومت کی سوچی سمجھی سازش ہے۔

مگر دوسرے ہی دن حکومتی ترجمان نے کوبرا سانپ والی خبر کی تردید کر دی۔ بلکہ اس نوع نے سابق واقعات کو بھی حالیہ تردید کے ساتھ نتھی کر کے غلط قرار دیا۔ ترجمان نے کہا کہ اٹک قلعہ میں گزشتہ 45 سال سے پاکستان کی مسلح افواج کے جوان اقامت پذیر ہیں۔ ایسی جگہ جو کمانڈوز کا مسکن ہو اور دریا کے کنارے واقع ہو اگر کوبرا سانپ نکل آیا ہے تو پھر سوچنا پڑے گا کہ سانپوں کی فطرت بھی بدل گئی ہے'' اس کے بعد ترجمان نے بہت عمدہ جملہ چست کیا ہے مگر اسے خیال نہیں رہا کہ توپ کا رخ کسی اور طرف بھی ہے'' اجاڑ بیابانوں میں رہنے والے یہ سانپ اب شاید اپنی پسند کے انسانوں کے قریب رہنے لگے ہیں۔ ترجمان کے مطابق ''حیرت ہے کہ شہباز شریف اور فاروق ستار کے آتے ہی کوبرا نکلنا شروع ہو گئے ہیں جبکہ ان کی بیرک باسکٹ بال کے دیدہ زیب گراؤنڈ سے متصل ہے۔''

خبر اور اس کی تردید دونوں سامنے ہیں' قارئین کو خبر یا تردید جس میں بھی صداقت نظر آئے اسے تسلیم کر لیں' ویسے جہاں تک

ہماری فوج کے جوانوں اور کمانڈوز کا تعلق ہے ان کی تو ساری عمر خطروں کا مقابلہ کرتے گذرتی ہے۔ ان کی تربیتی مشقیں ہوتی بڑے خطرناک علاقوں میں ہیں۔

چنانچہ سانپ' بچھو وغیرہ ان کے لئے چیونٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح ایک نارچر سیل اگر لاہور کے خوبصورت ترین باغ جناح کے متصل بنا دیا جائے تو اس سے کسی کی اذیت میں کمی نہیں' اضافہ ہی ہوتا ہے تاہم حکومتی ترجمان کی تردید مجھے اچھی لگی ہے' اس سے کم از کم یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ حکومت ایسے واقعات یا ان کی تشہیر کو پسند نہیں کرتی۔

اب اگر حکومتی ترجمان نے تردید کر کے اس نوع کے واقعات کے حوالے سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر ہی دیا ہے تو یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک اور ''حکومتی ترجمان'' فاروق آدم نے جو یہ اعتراف کیا ہے کہ صدیق الفاروق ایسے نیک نفس اور ایماندار شخص کو ایک تاریک کوٹھڑی میں پھینک کر بھول گئے تھے اور انہیں سات ماہ بعد یاد آیا کہ ایک انسان کو انہوں نے قید کیا ہوا ہے تو ایک تردید اس اعتراف کے حوالے سے بھی آنا چاہیے جس میں کہا گیا ہو کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا بلکہ فاروق آدم نے اپنے کمزور حافظے کی بنا پر یہ بیان دیا ہے۔ انہیں یاد نہیں رہا کہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

گزشتہ دنوں فیصل آباد کے ایک تاجر کو سرکاری حراست کے دوران قتل کر دیا گیا' چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف مقتول کے گھر گئے اور انہوں نے لواحقین سے تعزیت کرتے ہوئے واقعہ کی منصفانہ تحقیقات کا یقین دلایا۔ تو کیا حرج ہے اگر سرے سے اس واقعے ہی کی تردید کر دی جائے سب نے ایک دن مرنا ہے۔

فیصل آباد کے تاجر ندیم اختر نے کوئی آب حیات تو نہیں پیا ہوا تھا کہ موت اس کے قریب نہیں پھٹک سکتی تھی۔ تردیدی بیان میں یہ وضاحت ہونا چاہیے کہ ندیم اختر سرکاری عملے کے ساتھ نہایت خوشگوار موڈ میں گپ شپ میں مشغول تھا اس دوران ایک سرکاری اہلکار نے اسے ایک نہایت مزیدار لطیفہ سنایا جس پر ندیم اختر ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا اور اس دہرے ہونے کے عمل کے دوران اس کی موت واقع ہو گئی' تردید میں بتایا جائے کہ حکومت نے اس واقعہ کا سخت نوٹس لیا ہے اور سرکاری اہلکاروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ پوچھ گچھ کے دوران کسی ملزم کو لطیفہ نہ سنائیں اور ملزموں کو خبردار کیا ہے کہ اگر کوئی سرکاری اہلکار اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں لطیفہ سنائے تو وہ ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کریں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اس پر ہنستے ہنستے دہرے ہونے سے ضرور بچیں کیونکہ ندیم اختر کی موت اس بے احتیاطی کی وجہ سے ہوئی تھی اور الزام خواہ مخواہ حکومت پر آ گیا!

◆◆◆

فوجی کرکٹ ٹیم

کرکٹ سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن بطور ایک سچے پاکستانی کے جب کوئی معزز شخص قانون کے شکنجے میں آتا ہے اور یوں اس کی بنی بنائی عزت خاک میں ملتی ہے تو مجھے روحانی قسم کی خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے گزشتہ دو تین روز سے کرکٹ سے خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ لاہور کورٹ کے مسٹر جسٹس عبدالقیوم کی انکوائری رپورٹ کے نتیجے میں ہماری کرکٹ ٹیم گیارہ کھلاڑیوں میں سے سلیم ملک' عطاء الرحمن' وسیم اکرم' انضمام الحق' سعید انور' اکرم رضا' وقار یونس اور مشتاق احمد کو میچ فکسنگ کے حوالے سے مجرم یا مشکوک ٹھہرایا گیا ہے چنانچہ انہیں سزائیں بھی اس کے مطابق دی گئی ہیں۔ اعجاز اور ثقلین مشتاق کے بارے مین کوئی شہادت سامنے نہ آسکی' لہٰذا وہ بچ گئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ مجھے کرکٹ یا سچی پوچھیں تو کسی بھی ٹیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہ دلچسپی صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہماری ٹیم کے مدمقابل انڈیا ہو' ان لمحوں میں اگر کوئی مجھے دیکھے تو وہ سمجھے کہ شاید اس کھیل سے زیادہ اسے اور کسی کھیل میں دلچسپی ہی نہیں' ابھی میچ فکسنگ کے حوالے سے سزا یافتہ یا مشکوک قسم کے جن کھلاڑیوں کے نام میں نے اوپر درج کئے ہیں مختلف مواقع پر ان کی کامیابی کے لئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتا رہا ہوں۔ ان کی اعلیٰ درجے کی بیٹنگ یا بالنگ پر اچھل اچھل کر داد دیتا رہا ہوں لیکن جب میں ان کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں سنتا تھا تو مجھے شدید دکھ ہوتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا دیتا ہے اور اسے باعزت اور خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کر دیتا ہے تو پھر اسے ''کھے'' کھانے کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔ مگر کیا کریں ایسی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ اللہ نے سب کچھ دیا ہوا ہے بس بے عزتی اور ذلت کی کمی ہے اور یار لوگ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کھلاڑیوں میں سے کون جوئے میں ملوث ہونے کی وجہ سے اپنے ضمیر اور اپنے وطن سے غداری کا مرتکب ہوا ہے لیکن جسٹس قیوم نے اگر فیصلہ سنایا تو یقیناً پوری تحقیق کے بعد ہی سنایا ہوگا۔ ان کے متعلق شنید ہے کہ وہ بڑے ''محقق'' قسم کے جج ہیں۔

تاہم اس وقت میرا یہ مسئلہ نہیں ہے جو بظاہر آپ کو نظر آرہا ہے میں جسٹس قیوم کی انکوائری کے حوالے سے کچھ اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ تقریباً ساری ٹیم کسی نہ کسی حوالے سے کرپٹ ہے۔ ہمارے جنرل کرپشن برداشت نہیں کر

سکتے چنانچہ انہوں نے چند ماہ پیشتر ایک منتخب جمہوری حکومت پر کرپشن کے الزامات لگائے اور ان کا جرم ثابت ہونے سے پہلے حکومت کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا' ظاہر ہے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ ہمارے جرنیلوں کی تاریخ اور ان کا دامن کرپشن کے حوالے سے بالکل پاک صاف ہے اب وہ حکومت چلا رہے ہیں اور ابھی سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق تین سال تک چلائیں گے۔

اب چونکہ ہماری تقریباً پوری کرکٹ ٹیم' انفرادی طور پر ہی سہی کرپٹ ثابت ہوگئی ہے اور ایک نامور جج نے اپنی انکوائری رپورٹ میں ان کا کچا چٹھا کھولا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فوج کرکٹ ٹیم کو بھی ٹیک اوور کرے اور فوجیوں پر مشتمل نئی کرکٹ ٹیم تشکیل دے۔ اگر سیاست دانوں کا کام جو بہت پیچیدہ اور نازک ہوتا ہے فوج بطریق احسن کر سکتی ہے تو کسی کیپٹن' میجر' کرنل یا بریگیڈیر کے لئے بیٹنگ یا باؤلنگ کون سا مشکل کام ہے۔ سیاست دانوں اور کرکٹ ٹیم پر الزامات ایک ہی نوعیت یعنی کرپشن کے ہیں۔ سیاست دانوں کو ابھی کرپٹ ثابت ہونا تھا مگر ان کی جگہ فوج نے لے لی ہے۔ کرکٹ کے کھلاڑی کرپٹ ثابت ہو چکے ہیں۔ اب ان کی جگہ فوجی ٹیم فوری طور پر تشکیل دینا چاہیے اگر خارجہ معاملات معاشی مسائل' سماجی پرابلمز' اور اس نوع کے نہایت پیچیدہ امور ہماری فوج کسی تجربے کے اور تربیت کے بغیر انجام دے سکتی ہے تو اس کے لئے سری لنکا' بنگلہ دیش' اور ویسٹ انڈیز' وغیرہ کے ساتھ میچ کھیلنا چوکے چھکے لگانا اور میچ جیت کر دکھانا کون سا مشکل کام ہے۔ پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کے چیئرمین کو اب یہ کارنامہ بھی سرانجام دینے میں کوئی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کرپٹ اگرچہ تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی کہا جا رہا ہے مگر وہ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ فوج ان کی دکانیں خالی کرا کے ہاتھ میں گز پکڑ کے کپڑے کی دکانوں پر نہیں بیٹھ سکتی' ویسے بھی یہ قدرے مشکل کام ہے۔ کپڑا ماپ کر پھر ایک چرچراہٹ کے ساتھ پھاڑنا اور شاپر میں ڈال کے گاہک کے سپرد کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے خاصی تربیت کی ضرروت ہے جب کہ ملک چلانا' سائیکل یا رکشہ چلانے کے برابر ہے اور اس کے لئے کسی قسم کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے پیشتر جنرل ایوب خان' جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق وغیرہ خاصی کامیابی سے 1970ء تک پورا ملک اور اس کے بعد آدھا ملک چلا کر دکھا چکے ہیں۔

اب آدھا ملک جنرل پرویز مشرف چلا رہے ہیں اور واشنگٹن میں منعقد ہونے والی عالمی سندھ کانفرنس میں کچھ بدبخت پاکستانی بھارتی ترنگا اوڑھ کر شرکت کرنے لگے ہیں۔ علیحدگی کی تحریک ایوب خان' یحییٰ خان اور ضیاء الحق کے زمانے میں بھی چلتی رہی ہے۔ یہ علیحدگی پسند اور وطن دشمن چوہے اس وقت اپنے بلوں سے نکلتے ہیں جب فوجی اپنی بیرکوں سے باہر آتے ہیں مگر اس دفعہ خطرے کی کوئی بات نہیں کیونکہ این جی اوز والے فوجی حکومت کے ساتھ ہیں اور یہ جب کسی کے دوست ہو جائیں تو پھر کسی کو دشمن بنانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

◆◆◆

شہنشاہ، صدر اور وزیر اعظم!

میں جب 1978ء میں ادیبوں کے وفد کے ہمراہ عوامی جمہوریہ چین کے دورے پر گیا تو پہلے ہی دن کھانے کی میز پر چینی دوستوں نے ابلتے ہوئے پانی کا جگ انواع واقسام کے کھانوں کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ یہ پانی اتنا گرم تھا کہ لگتا تھا جہنم کے کسی چشمے سے خصوصی طور پر منگوایا گیا ہے۔ پتہ چلا کہ جس طرح ہم لوگ کھانے کے ساتھ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اسی طرح چینی کھانے کے ساتھ گرم پانی صدیوں سے پیتے چلے آ رہے ہیں اور ان کی عمدہ صحت کی ایک وجہ یہ بھی ہے لیکن چونکہ ہم میں سے صحت کسی کو بھی عزیز نہ تھی، لہٰذا ہم نے گائیڈ سے کہا کہ وہ ویٹر کو ٹھنڈے پانی کے لئے کہے، تعمیل ارشاد میں ویٹر یہ جگ اٹھا کر لے گیا اور اس میں برف کی کچھ ڈلیاں ڈال کر وہ جگ پھر ہماری میز پر رکھ دیا۔ جس سے یہ پانی اگرچہ پینے کے قابل تو نہ ہوا البتہ شدید سردی کے موسم میں اس نیم گرم پانی سے نہایا ضرور جا سکتا تھا۔

جس طرح ہم لوگ جانوروں کے پاؤں، ان کی زبانیں، ان کے تالو، دل، کلیجی، گردے، کپورے اور اوجڑی تک کھا جاتے ہیں، اسی طرح چینی دوست بھی زمین پر رینگنے یا چلنے والی ہر چیز سوائے انسان کے ہوا میں اڑنے والی ہر چیز سوائے ہوائی جہاز کے اور سمندر میں تیرنے والی ہر چیز سوائے آبدوز کے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ شنگھائی میں ہمارا تعارف ایک ''سرمایہ دار'' قسم کے ادیب سے کرایا گیا۔ اس کے ''سرمایہ دار'' ہونے کی دو نشانیاں تھیں، ایک تو یہ کہ اس کے پاس موٹر سائیکل تھا اور دوسرے یہ کہ اس نے کتا پالا ہوا تھا۔ دوسری نشانی سے اس کی امارت کا زیادہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ کسی روز کتا پکا کر کھاتا الٹا برس ہا برس سے کتے کو اپنے پلے سے کھلا رہا تھا!

چین کے مختلف شہروں میں قیام اور سیر و سیاحت کے دوران ایک روز ہمارے وفد کو شرارت سوجھی، ہمارا گائیڈ سیاؤ خود بڑا زندہ دل آدمی تھا اور اس سے ہماری پکی دوستی ہو گئی تھی، بعد میں وہ پاکستان بھی آیا۔ ایک دن ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تو ہم نے سیاؤ سے کہا کہ آج کھانے کا مینو تبدیل ہونا چاہیے۔ اس نے کہا آپ بلا تکلف حکم دیں کیا کھائیں گے؟ میں نے کہا ہمارے وفد کے سربراہ پروفیسر پریشان خٹک آج کوئی اچھی نسل کا کچھوا کھانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح میرے لئے آپ شیش ناگ تل کر لائیں۔ مہتاب راشدی (جو کبھی مہتاب چنا ہوتی تھیں) مینڈک کھانا پسند کریں گی اور پروین شاکر زندہ بندر کا کچا مغز کھانا چاہتی ہیں سیاؤ نے کہا باقی

چیزیں تو ابھی تیار ہو جائیں گی البتہ بندر کے مغز والی فرمائش کی تعمیل مشکل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اسٹاک میں اس وقت کوئی بندر نہیں ہے۔ دوسرے بندر کی کھوپڑی کی چپنی تلوار سے اتارتے وقت دو تین آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو بندر کو پکڑ کر رکھیں کیونکہ سر کی چپنی اتارنے کے بعد جب اس کے مغز پر ابلتا ہوا پانی ڈالا جاتا ہے اور مہمان نمک مرچ ڈال کر چمچے سے جب یہ مغز کھانے کی کوشش کرتا ہے تو بندر کو قدرے ناگوار گذرتا ہے اور وہ اپنی ناگواری کے اظہار کے لئے خود کو ان لوگوں سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے جنہوں نے اسے مضبوطی سے قابو کیا ہوتا ہے اور اس وقت ہمارے پاس اس کام کے لئے فالتو لیبر نہیں ہے۔ تب ہم نے سیاؤ کو بتایا کہ یہ تو ہم یونہی مذاق کر رہے تھے کیونکہ ہم ان میں سے کوئی چیز نہیں کھا سکتے۔ یہ سن کر سیاؤ نے حیرت سے قریباً چیختے ہوئے کہا ''یعنی تم لوگ ان میں سے کوئی نعمت حتیٰ کہ مینڈک تک نہیں کھاتے؟''

مجھے یہ سب باتیں اپنے برادر عزیز سید ارشاد عارف کی کتاب ''دیوار چین کے اس پار'' کے حوالے سے یاد آئی ہیں بلکہ یوں کہہ لیں کہ زندگی میں دو دفعہ چین جانے کا اور تیسری دفعہ جانے کی خواہش دنیا کے اس خوبصورت ترین ملک کے خوبصورت ترین عوام کی باتیں کر کے پوری کر رہا ہوں۔ کہ پرانی یادیں سیاحت کے برابر تو نہیں ہوتیں لیکن ان سیاحت کے کچھ علاقے ضرور دکھاتی ہیں۔ ارشاد عارف چونکہ عالم آدمی ہیں لہٰذا انہوں نے میری طرح اپنا وقت اس فضول قسم کی گپ شپ میں ضائع نہیں کیا بلکہ اس کتاب کو چین کی سابقہ اور موجودہ تاریخ کے حوالے سے ایک حوالے کی کتاب بنا دیا ہے۔ اس میں چین کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات ہیں کہ شاید بے شمار چینیوں کے پاس بھی معلومات کا اتنا ذخیرہ نہ ہو' تاہم جو شگفتگی ان کے اپنے مزاج میں ہے وہی شگفتگی انہوں نے کتاب میں بھی برقرار رکھی ہے۔ ارشاد عارف جب میرے پاس ناروے تشریف لائے ان کی شگفتہ محققانہ اور متجسسانہ طبیعت کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا تھا وہ کوئی عمارت دیکھتے نہیں تھے' اس عمارت سے اس کے ماضی اور حال کے بارے میں اتنے سوال کرتے تھے کہ وہ عمارت ان کے جاتے ہی نڈھال ہو کر زمین بوس ہو جاتی تھی۔ اور جب وہ وہاں سے واپس پاکستان ہاؤس آتے تو میرے ساتھ چائے کے کپ پر معلومات کے خزانے کے علاوہ اس سلسلے کے کئی لطیفے بھی ڈھیر کر دیتے تھے۔ یہی کام شاہ جی نے ''دیوار کے چین کے اس پار'' میں کیا ہے اور بڑی مہارت سے کیا ہے!

دوسرے سیاحوں کی طرح بیجنگ کا ''شہر ممنوع'' میں نے بھی دیکھا ہے لیکن دیکھنے دیکھنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میں نے اپنے بادشاہوں کے محلات کے طور پر دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ مجھے ساری عمر میرے گھر والے میرے ''نک نیم'' ''شہزادہ'' کہہ کر پکارتے رہے مگر اس ''شہزادے'' کو انہوں نے پانچ مرلے کے مکان میں رکھا اور یہ مکان بھی ان کا اپنا نہیں تھا۔ مگر ارشاد عارف نے جب یہ

شہر ممنوع دیکھا تو بتایا کہ ان کا صدر دروازہ شہنشاہ' دائیں طرف کا پہلا دروازہ شہزادے اور کتے' دوسرا دروازہ ملکہ تیسرا دروازہ وزیر اعظم اور سول حکام جب کہ چوتھا اور آخری دروازہ فوجی حکام کے لئے تھا۔ اس سے اس دور کے پروٹوکول کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی پہلے نمبر پر بادشاہ' دوسرے نمبر پر شہزادے اور کتے (لاحول ولاقوۃ) تیسرے نمبر پر ملکہ' چوتھے نمبر پر وزیر اعظم اور سول حکام اور پانچویں نمبر پر فوجی حکام آتے تھے۔ مگر یہ پروٹوکول شہنشاہیت کے زمانے کا تھا' اب الحمد للہ چین اور اس کے برادر ملک پاکستان میں جمہوریت ہے لیکن معمولی سے فرق کے ساتھ' چین میں صدر اور وزیر اعظم پروٹوکول میں آگے آتے ہیں جب کہ پاکستان میں وزیر اعظم عموماً سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے یا تختہ دار پر یا جلسہ عام میں کسی جان لیوا گولی کی زد میں اور صدر کے متعلق عموماً لطیفے ہی مشہور ہوتے ہیں جن صدروں کے بارے میں لطیفے مشہور نہ ہوں مثلاً فاروق لغاری جو اتفاق سے میرے آپ کے سامنے سٹیج پر تشریف فرما ہیں اور غلام اسحاق خان وغیرہ' وہ بعد میں ساری عمر اپنی اس محرومی پر کف افسوس ملتے رہتے ہیں۔

◆◆◆

یوم احیائے علوم

وہ دن کبھی نہیں بھولوں گا جب بھارت کے ایٹمی دھماکوں پر ناروے میں مقیم پاکستانیوں کے نمائندے میرے پاس آئے' ان کے چہرے بجھے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران تھیں۔ انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''ہم اوسلو کی گلیوں میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتے' بھارتی ہندو لڈو بانٹ رہے ہیں اور پاکستان کے خلاف اب وہی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جو ایٹمی دھماکوں کے بعد بھارتی قیادت پاکستان کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔ آپ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف تک ہمارے جذبات پہنچائیں اور انہیں کہیں کہ اگر پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت واقعی موجود ہے تو پھر وہ جوابی دھماکے کرنے میں بالکل دیر نہ کریں۔ ورنہ پاکستانی قوم مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے گی اور عالم اسلام میں بھی نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے حوالے سے پاکستان کا جو امیج ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔''

اس سے اگلے روز ناروے کی نائب وزیر خارجہ نے مجھے اپنے دفتر میں یاد کیا اور کہا کہ ناروے کی حکومت بھارت کی ایٹمی دھماکوں کو امن عالم کے لئے خطرہ سمجھتی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ پاکستان اس کے جواب میں ایٹمی دھماکہ نہ کرے۔ چنانچہ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے جذبات اپنی حکومت تک پہنچائیں۔''

میں جانتا ہوں میں نے اس کے جواب میں جو کہا وہ شاید ڈپلومیسی میں قدرے Rude Expression (کھردرا اظہار) کے زمرے میں آتا ہے اور ممکن ہے کوئی کیریئر ڈپلومیٹ اس کے جواب میں فقط اتنا کہے کہ آپ کے جذبات اپنی حکومت تک پہنچانا میرے فرائض منصبی میں شامل ہے اور میں ضرور ایسا کروں گا۔ اور اس کے بعد چائے کے کپ پر ہلکی پھلکی گپ کر کے وہ کاغذ جیب میں ڈال کر واپس سفارت خانے آ جائے۔ مگر میں نے رسمی جواب کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اپنے دوست ملک ناروے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اگر پاکستان ایٹمی دھماکہ نہیں کرتا تو بھارتی حملے کی صورت میں ناروے ہماری مدد کو آئے گا۔ اپنے اس سوال کا جواب نہ پا کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا سوال کچھ اتنا زیادہ قابل ستائش نہ تھا اور یہ بھی کہ بھارتی جارحیت کی صورت میں کسی دوسرے پر انحصار کرنے کی بجائے ہمیں صرف اپنی قوت بازو پر انحصار کرنا ہو گا۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب پاکستان نے قومی غیرت اور استحکام پاکستان کی خاطر تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے انڈیا کو

ایٹمی دھماکوں کا جواب ایٹمی دھماکوں سے دیا۔ اس روز پاکستانیوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔ اوسلو کے گرون لینڈ (جہاں پاکستانی رہتے ہیں) کے علاقے میں مٹھائیاں تقسیم کی جارہی تھیں۔ مسلم لیگ والے میاں نواز شریف کی تصویر والے پوسٹر مبارکبادی پیغام کے ساتھ ایک دوسرے کو فیکس کررہے تھے۔ سفارت خانے میں ٹیلیفونوں اور مبارکباد کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں پاکستان کے سبھی مکاتب فکر لوگ شامل تھے۔ میں اس روز ایک سفارت خانے کے استقبالیے میں شرکت کے لئے گیا تو انڈیا کے ایٹمی دھماکوں کے بعد یہ پہلا استقبالیہ تھا۔ جب میرے لہجے میں مکمل خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ اور یہ سوچ کر میرا سر فخر سے تنا ہوا تھا کہ میں ایک ایسے ملک کی نمائندگی کررہا ہوں جس نے سپر پاور امریکہ کے صدر کلنٹن کے پانچ ٹیلیفونوں اور ان کے حواری مغربی ممالک کے بے پناہ دباؤ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہی کچھ کیا جو اس کے اپنے مفاد میں تھا۔ مجھے اس روز اپنے وزیراعظم اپنی فوج اور اپنے عوام پر بہت پیار آیا اور میرے اندازے کے عین مطابق آج یہ تینوں ان ایٹمی دھماکوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ پہلے فوج کو اس حکومت سے لڑا دیا گیا جس حکومت نے ''حکم عدولی'' کرتے ہوئے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنایا اور اس کے بعد فوج اور عوام کے درمیان نفرت کی ایک گہری خلیج حائل کی جارہی ہے تاکہ فوج کمزور ہو اور کمزور فوج اور نحیف عوام آئندہ کسی ''ایٹمی پروگرام'' کی حفاظت نہ کرسکیں۔ مغرب کو اپنے آئندہ کے عزائم کے لئے ''مرغ دست آموز'' قسم کے حکومت کی ضرورت ہے۔

متذکرہ استقبالئے میں شرکت کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ پاکستان دوسرے اقوام کی نظر میں آج پہلے سے زیادہ معزز ہوگیا ہے خواہ زبان پر کچھ اور ہو پاکستان نے بہت مضبوط بنیادوں پر اور انتہائی خوبصورت سیاسی اور مدبرانہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے ٹھیک وقت پر ایٹمی دھماکے کئے تھے۔ انڈیا کے دھماکوں کے بعد دنیا کے ردعمل کا انتظار کیا گیا۔ ہمارے فارن آفس نے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو پاکستان کو ایٹمی دھماکوں کا اخلاقی جواز مل گیا چنانچہ اس استقبالئے میں سفیر صاحبان سے گفتگو کے دوران مجھے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ (اس روز میں نے دل کی گہرائیوں سے واجپائی کا بھی شکریہ ادا کیا تھا) اس دن میں نے مسلم سفیروں کو بہت خوش پایا۔ ان میں سے بعض مجھے کھلم کھلا مبارکباد دینے سے کتراتے تھے کہ ان کے اپنے ملک، مغرب کے پاس گروی پڑے ہیں۔ لیکن وہ ایک ایک کرکے میرے پاس آتے اور پرجوش معانقہ کرکے بہت خوبصورت لفظوں میں اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے۔

اگلے روز ناروے کے فارن آفس میں مجھے طلب کرکے ایک خط میرے سپرد کیا گیا جس میں پاکستان کے ایٹمی دھماکوں پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا۔ اور پاکستان کی امداد کے حوالے سے کچھ پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ تاہم اس کے باوجود انداز بہت مہذب اور

لہجے بڑے خوشگوار تھے کہ ناروے بہر حال پاکستان کا ایک عزیز دوست ہے' صرف اتنا ہے کہ اس روز چائے نہیں پوچھی گئی۔

دفتر خارجہ کا احتجاجی نوٹ وصول کرنے کے اگلے روز میں نے کچھ سفیر دوستوں کو ایک ریستوران میں مدعو کیا ہوا تھا' جب ہم کھانا کھا کر باہر نکلے تو ایک دراز قد نارویجن (نارویجن ہوتے ہی دراز قد اور خوبصورت ہیں) میرے پیچھے پیچھے آیا' اس نے مجھ سے اپنا تعارف کرایا ''میں سابق فوجی افسر ہوں مجھے ریستوران میں کسی نے بتایا کہ آپ پاکستان کے سفیر ہیں اور میں صرف یہ کہنے کے لئے آپ کے پیچھے چلا آیا کہ آپ کی حکومت نے ایٹمی دھماکہ کر کے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہم نارویجن لوگ سمجھتے ہیں کہ انڈیا کے دھماکوں کے بعد پاکستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کے رستے میں مشکلات آئیں گی۔ مگر آپ پوری بہادری سے ان مشکلات کا مقابلہ کریں اور یاد رکھیں کمزور کے دفاع کے لئے کوئی آگے نہیں آتا' قوموں کو اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت زور بازو ہی سے کرنا پڑتی ہے'' یہ صرف ایک نارویجن کا تاثر نہیں تھا' پاکستان کے دھماکوں کی ٹائمنگ اتنی اچھی تھی کہ عام آدمی پاکستان کو اس کے اس اقدام کے حوالے سے حق بجانب سمجھتا تھا' میں نے اس خوبرو سابق فوجی افسر کا شکریہ ادا کیا اور اسے سفارتخانے آنے کی دعوت دے کر ریستوران سے باہر چلا آیا۔

میں عموماً ہفتے اور اتوار چھٹی کے روز بھی سفارت خانے کا ایک چکر ضرور لگایا کرتا تھا تاکہ ہمارے فارن آفس سے کوئی ضروری پیغام ہو یا کوئی کام پینڈنگ پڑا ہو تو وہ نمٹا دیا جائے۔ یہ اتوار کا روز تھا اور میں حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا' دفتر میں چھٹی کی وجہ سے میرے اور میرے گارڈ خورشید کے علاوہ کوئی نہ تھا' اچانک خورشید دروازہ ناک کر کے اندر آیا' وہ قدرے گھبرایا ہوا تھا' اس نے کہا ''سر! باہر بہت سے نارویجن مرد اور عورتیں ہاتھوں میں بینر اٹھائے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ٹی وی والے بھی ہیں جو اس مظاہرے کی کوریج میں مشغول ہیں۔''

میرے لئے یہ بات حیران کن تھی کیونکہ جس تنظیم کو جس ادارے کے خلاف مظاہرہ کرنا ہو' وہ پہلے پولیس سے اس کی اجازت لیتی ہے اور پھر پولیس کئی روز پیشتر اس ادارے کو اس مظاہرے کے مقام اور وقت کے متعلق مطلع کرتی ہے تاکہ ادارے کا کوئی نمائندہ وہاں موجود ہو جب کہ ہمارے سفارت خانے کو نہ صرف یہ کہ اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی بلکہ یہ مظاہرہ اتوار کے روز کیا جا رہا تھا۔ یہ تو اتفاق سے میں اپنے دفتر میں موجود تھا' بہر حال میں نے خورشید سے کہا ''گرمی کا موسم ہے' مظاہرین سے پانی وانی کا پوچھو اور انہیں بتاؤ' میں ان سے ملنے باہر آ رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد میں مظاہرین کے درمیان موجود تھا۔ ان مظاہرین کا تعلق ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف قائم اس تنظیم سے تھا۔ جو بلا

استثناء ان ملکوں کے خلاف مظاہرے کرتی ہے۔ جس کے اقدامات اس تنظیم کے اغراض مقاصد سے متصادم ہوں' انہوں نے انڈیا کے سفارت خانے کے سامنے بھی بھرپور مظاہرہ کیا تھا مگر عزت مآب سفیر ہند ان کی یادداشت وصول کرنے خود باہر نہیں تھے' مظاہرین نے جب مجھے اپنے درمیان دیکھا تو میں نے ان کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر سی محسوس کی۔ یہ اچھے لوگ تھے اور پورے خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہونا چاہیے' میں نے ان میں سے جتنوں کے ساتھ مصافحہ کرنا ممکن تھا' مصافحہ کیا۔ ان کا موقف پورے اطمینان اور تحمل سے سنا اور پھر ایک لمبی تقریر کی۔ میں نے کہا ''میں آپ لوگوں کو اپنی ایمبیسی میں خوش آمدید کہتا ہوں میرے' میری حکومت اور آپ کے نقطہ نظر میں کوئی فرق نہیں ہے خصوصاً میں اپنے جذبات کے لحاظ سے آپ کے ساتھیوں میں سے ہوں۔ کیونکہ میں صرف پاکستان کا سفیر نہیں۔ بلکہ ایک ادیب اور ادبیات کے ایک پروفیسر کے طور پر امن اور محبت کی سفارت بھی میرے ذمے ہے۔ چنانچہ میں اور آپ سب ایک ہی مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بھارت نے خطے کے امن کو تہہ و بالا کرنے اور طاقت کا توازن بگاڑنے کے لیے ایٹمی دھماکے کئے' ہم نے کئی ہفتے انتظار کیا کہ اقوام عالم اس ضمن میں اپنے ردعمل کا اظہار بھارت کی بھرپور مذمت اور اس کے بائیکاٹ کی صورت میں کرے۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس ضمن میں صرف لفظوں کے ساتھ کھیلا گیا جس سے بھارت کو اس درجہ شہ ملی کہ اس نے پاکستان پر حملے اور اسے نیست و نابود کرنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اپنے وجود کی بقاء اور سلامتی کے لیے ان دھماکوں کا جواب دھماکوں سے دیں۔ پاکستان ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کے خلاف ہے لیکن بھارت نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم اپنی قومی سلامتی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں' وہ کریں''۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مظاہرین کو میری بات پوری طرح سمجھ آ رہی تھی کیونکہ ان کے کھنچے ہوئے چہروں پر ملائمت آ گئی تھی۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا'' آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے ہمسائے میں کوئی انڈیا نہیں ہے اس کے علاوہ غیر ملکی جارحیت کی صورت میں آپ کی حفاظت نیٹو کے رکن کی حیثیت سے نیٹو کے ذمے ہے۔ چنانچہ آپ چین کی نیند سوتے ہیں' مگر ہم اپنے اس ہمسائے کی وجہ سے چین کی نیند نہیں سو سکتے۔ جو پہلے ہی شب خون مار کر' باقاعدہ فوجی جارحیت کے ذریعے ہم سے ہمارا آدھا ملک علیحدہ کر چکا ہے' اس برہنہ جارحیت کے خلاف ہمارا کوئی دوست ہماری مدد کو نہ پہنچا اور آئندہ بھی ہمیں اپنے مغربی دوستوں کی طرف سے اس طرح کی کوئی یقین دہانی حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنی حفاظت آپ کرنا ہے' ہم متعدد مرتبہ بھارت کو جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیشکش کر چکے ہیں مگر وہ اس پر راضی نہیں چنانچہ خطے کے امن کو پاکستان سے نہیں' بھارت کے ایٹمی

ہتھیاروں سے خطرہ ہے۔ آپ امن پسند لوگ ہیں' قیام امن کے لیے آپ کی کوششوں کا میں نہ صرف تہہ دل سے قائل ہوں بلکہ اس وجہ سے آپ سے دلی محبت بھی رکھتا ہوں لہٰذا آپ بھارت پر زور دیں کہ وہ جارحانہ عزائم ترک کرے اور پاکستان کی طرف دوستی کا پر خلوص ہاتھ بڑھائے۔ آپ نیک دل لوگ ہیں' ظالم اور مظلوم کو براہ کرم' ایک پیمانے سے نہ ماپیں'' اس کے بعد میں نے انہیں امن کے موضوع پر اپنی ایک نظم سنائی جس کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب مجھے اپنی تنظیم کا رکن سمجھ رہے ہیں۔

مغربی لوگ نہ صرف یہ کہ بہت بذلہ سنج ہوتے ہیں بلکہ بذلہ سنجی کو پسند بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے آخر میں انہیں اپنے اور اپنے پاکستان کے قریب لانے کے لئے ہلکی پھلکی گفتگو کی۔ میں نے کہا بھارت نے کھلی جارحیت سے ہمارا ملک آدھا کر دیا' اس آدھے ملک سے تیس ہزار پاکستانی آپ کے اور میرے محبوب ناروے میں مقیم ہیں۔ آپ کی بعض تنظیمیں غیر ملکی تارکین وطن کو پسند نہیں کرتیں۔ اگر خدانخواستہ بھارت' پاکستان کے خلاف جارحانہ عزائم میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بچے کھچے ملک پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یاد رکھیں پاکستان کی آبادی چودہ کروڑ ہے! اور میں جانتا ہوں ناروے آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا ملک ہے۔ لہٰذا آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ اتنے لوگوں کی میزبانی آپ کے ملک کے لئے قدرے مشکل ہوگی۔''

اس پر مجمع میں سے ایک قہقہہ بلند ہوا اور ہوسٹائل مظاہرین کا رویہ مکمل دوستی میں بدل گیا ان میں سے بیشتر میرے پاس آئے اور کہا'' آپ کی باتوں میں وزن ہے' ہم آئندہ بھی آپ کے ساتھ ملنا چاہیں گے'' اور پرتپاک مصافحوں کے ساتھ انہوں نے مجھے وزیٹنگ کارڈ دیئے اور عرضداشت بھی کہ یہ عرضداشت آپ بہرحال اپنی حکومت تک پہنچا دیں۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسی صورت حال میں چھپنے کی بجائے سامنے آ کر بغیر کسی تحفظات کے ڈائیلاگ کرنا چاہیے۔ اس وقت پوری دنیا کو باہمی ڈائیلاگ کی ضرورت ہے۔ ہم عام آدمی سے جو ڈائلاگ کریں گے وہ ڈائلاگ رائیگاں نہیں جائے گا۔ بلکہ حکومتوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوگا۔ دنیا میں قیام امن کے لئے قائم کرنے والی تنظیموں کے ساتھ ہمیں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر رابطوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ انڈیا کے عزائم ان پر واضح کر سکیں۔ پاکستان فی الواقع جنگ نہیں چاہتا اور یوں ہمارا کیس مضبوط ہے' مگر سوال یہ ہے کہ اتنے مضبوط کیس کے لئے ہم کسے وکیل کریں؟ کس سے منصفی چاہیں؟

ایٹمی دھماکوں کی دوسری سالگرہ کے حوالے سے میرے شائع شدہ کالموں کا عنوان'' یوم تکبیر نہیں' یوم احیائے علوم'' تھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس دن کے لئے موزوں ترین نام'' یوم احیائے علوم'' ہے اور اس دن جلسے جلوسوں سے زیادہ سائنسی علوم پر مذاکرات اور سیمیناروں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

میں پہلے دن سے اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں اہل مغرب کی طرح اپنے مقاصد کو خوبصورت نام دینا چاہئیں' مثلاً لفظ ''سیکولر'' دیکھیں' کس قدر خوبصورت لفظ ہے' اس میں نہ کہیں تعصب جھلکتا ہے اور نہ کسی مذہب کے حوالے سے جانبداری کی بو آتی ہے' تمام مغربی حکومتیں خود کو سیکولر کہلاتی ہیں اور سیکولرازم کا پرچار کرتی ہیں' انڈیا بھی خود کو سیکولر کہلاتا ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لئے اسلامی ممالک میں عموماً کسی مسلمان کو سفیر بنا کر بھیجتا ہے یا کسی ایسے ہندو کو جو ماشاء اللہ الحمد اللہ اور بسم اللہ کا صحیح استعمال جانتا ہو' لیکن کیا یہ ممالک اور ان کی پالیسیاں سیکولر ہیں؟ مغربی ملکوں کے عوام سیکولر ہو سکتے ہیں مگر ان کی حکومتیں کرسچین حکومتیں ہیں اور بسا اوقات پاکستان کے اندرونی معاملات میں وہ بطور کرسچین جس طرح کی مداخلت کرتی ہیں' اس سے ان کے سیکولرازم کا پردہ چاک ہو جاتا ہے' اسی طرح عالم اسلام کے خلاف ان کی حکومتیں اور ان کا میڈیا اپنے جذبات کو روکے نہیں روک پاتا۔ کیا ''یورپین یونین'' کرسچین یونین نہیں ہے؟ اسی طرح انڈیا مسلمانوں کے بعد سکھوں اور عیسائیوں کو بھی اپنی مذہبی جنونیت کا نشانہ بنا رہا ہے اور اس عمل میں حکومت اور عوام دونوں شامل ہیں لیکن اس کے باوجود پوری دنیا میں ان سیکولرازم کی دھوم ہے' ہم خواہ چڑ کر ہی سہی خود کو بڑے فخر سے ''بنیاد پرست مسلمان'' کہلاتے ہیں' ہمارا ملک ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے اور ہمارے بعض حلقوں کی طرف سے آئے روز ایسے مطالبات اور ایسے اعمال سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن کی بیرون ملک تشہیر بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی ہے اور پھر اسے بنیاد بنا کر دنیا بھر کے اسلام دشمنوں کو ہمارے خلاف ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' حالانکہ ہمارا مذہب رواداری' تحمل اور سلامتی کے معاملے میں دنیا کے کسی بھی مذہب سے زیادہ زور دیتا ہے' مغرب میں کچھ ملکوں کے وزیر اعظم باقاعدہ پادری ہیں' انڈیا میں ''بنیاد پرست'' ہندوؤں کی حکومت ہے جب کہ پاکستان میں آج تک کوئی مذہبی جماعت برسر اقتدار نہیں آ سکی' اس کے باوجود اہل مغرب اور انڈیا ''سیکولر'' اور ہم ''جنونی مذہبی'' ہیں' کیا اسلام میں حکمت عملی کی کوئی گنجائش ہے؟ یقیناً ہے! کیا بھینسے کو سرخ رومال دکھانا بہت ضروری ہو گیا ہے؟ اگر ضروری نہیں تو پھر ہمیں ایسی حکمت عملی اپنانا چاہیے کہ ہم اسلام کے ساتھ چمٹے بھی رہیں اور اس کی آفاقی سچائیاں اپنے ہاں نافذ کریں اور فروعات میں الجھنے کی بجائے پاکستان اور عالم اسلام کے لئے ٹھوس بنیادوں پر کچھ اس طرح کے کام کریں کہ دشمنوں کو ہمارے خلاف ''مذہبی جنونی'' کا ''سکہ رائج الوقت'' استعمال کرنے کی جرات نہ ہو اور اگر وہ یہ سکہ رائج بھی کرے تو ''بین الاقوامی منڈی'' میں اس سکے کو قبول یا تسلیم کرنے والا کوئی نہ ہو!

ہم نے اپنے دفاع کے لئے انڈیا کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں ایٹمی دھماکے کئے' ہم اگر ہر سال اس کی یاد ''یوم احیائے علوم'' کے بینر تلے منوائیں تو ہم بیرونی دنیا کو یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہاں سائنس سمیت تمام علوم کے احیاء کے لئے کوشاں

ہیں' چنانچہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول سے جارحیت نہیں' بلکہ علم کے ایک شعبے کی طرف پیش قدمی مطلوب ہے۔ ''یوم تکبیر'' میں یہ مفہوم واضح نہیں ہوتا بلکہ اس کا تاثر کچھ اور طرح کا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ہم بیرونی دنیا کو ''یوم احیائے علوم'' کے حوالے سے ایک مثبت تاثر دیں بلکہ ہمیں فی الواقع اس دن کو بنیاد بنا کر سارا سال احیائے علوم کے لئے کوشاں رہنا چاہیے کہ علم مومن کی میراث ہے اور اس کا حصول اس کا فرض ہے اس وقت مغرب دنیا بھر پر حکمرانی اپنے علوم وفنون کی وجہ سے کر رہا ہے اور ہم ابھی تک سنگدل محبوب کو اپنے قدموں میں گرانے کے لئے کالے علم پر انحصار کر رہے ہیں۔ ہم کب تک ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ لگاتے رہیں گے' ہم کب تک عظمت رفتہ کے حصول کی بجائے عظمت رفتہ کا رونا روئیں گے' عظمت رفتہ صرف اور صرف علوم وفنون سے وہ تعلق پیدا کرنے سے حاصل ہوگی جو تعلق علوم وفنون سے ہمارے قابل فخر آباؤ اجداد کا تھا' میں اپنی بات اقبال کے درج ذیل شعروں پر ختم کرتا ہوں' ہم اقبال کے شعروں پر سر دھنتے ہیں اور انہیں پیر ومرشد قرار دیتے ہیں' خدا کے لئے اپنے پیر ومرشد کی کسی بات پہ عمل بھی کریں۔

حکومت کا تو کیا غم ہے کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی' کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ رش روشن کند چشم زلیخا را

◆◆◆

موت کا ایک دن متعین ہے!

جب چند ماہ پیشتر ملتان کے ایس ایس پی ٹریفک ایوب قریشی صاحب نے مجھے لاہور سے ٹریفک سیمینار میں اظہار خیال کے لئے مدعو کیا تو مجھے شک گزرا کہ وہ مجھے ٹریفک اسپیشلسٹ سمجھتے ہیں اور اب جب کہ مجھے موٹروے اور ہائی وے پولیس نے اپنے سیمینار میں اسلام آباد میں مجھے مدعو کیا ہے تو خود مجھے بھی یقین ہو گیا ہے کہ میں ٹریفک کا اسپیشلسٹ ہوں' نسیم اور شمیم نام کے دو بھائی دونوں ٹیکسی چلاتے تھے اور دونوں ٹریفک کے قوانین کی پرواہ کئے بغیر اندھا دھند چلاتے تھے' ایک صاحب نسیم کی ٹیکسی میں بیٹھے تھے اور دم سادھے بیٹھے تھے کیونکہ موصوف ٹریفک کی سب سرخ بتیاں ایک سو بیس کلومیٹر کی رفتار سے کراس کرتے چلے جاتے تھے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ سبز دیکھ کر بریک لگا دیتے تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے مسافر نے نسیم کو مخاطب کیا اور پوچھا ''تم سبز بتی پر بریک لگا دیتے ہو اور سرخ بتی پر گاڑی روکتے نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ نسیم نے کہا ''میں سرخ بتی پر اس لئے گاڑی نہیں روکتا کہ میں ٹریفک کے قوانین کو مانتا ہی نہیں اور سبز بتی پر اس لئے بریک لگاتا ہوں کہ ممکن ہے کہ دوسری طرف سے بھاء شمیم آ رہا ہو'' ٹریفک کی سوجھ بوجھ اسے کہتے ہیں اور خود میں بھی کچھ اسی قسم کی سوجھ بوجھ کا مالک ہوں! یہ ٹریفک پولیس والوں کی ذرہ نوازی ہے کہ وہ میری اس سوجھ بوجھ کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ ورنہ ان دنوں کسی کے فن کی کون قدر کرتا ہے؟

ان دنوں تو دوست احباب مجھے کار چلاتے دیکھتے ہیں تو میرے فن کی داد صرف کانوں کو ہاتھ لگا کر دیتے ہیں' یہ اگر کبھی مجھے میرے موٹر سائیکل والے دور میں دیکھتے تو میرے لئے کسی بڑے ایوارڈ کی سفارش کرتے یا اصرار کرتے کہ میں فارغ اوقات میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلایا کروں۔ میں جانتا ہوں میرے دوست احباب میری ڈرائیونگ کی تعریف دوست نوازی کی وجہ سے کرتے ہیں ورنہ من آنم من آنم کی من دانم..... جن دنوں میرے پاس موٹر سائیکل ہوتا تھا میں اس سے کار کا کام لیا کرتا تھا' دو بچے ٹینکی پہ بیٹھے تھے' ان کے پیچھے میں اور میرے پیچھے بچی کھچی گدی پر میرے بیوی اور میرا تیسرا بیٹا براجمان ہوتے تھے' گویا جو سواری دو افراد کے لئے بنائی جاتی ہے' اس پر پانچ افراد سوار ہوتے تھے۔ کئی دفعہ ہماری وجہ سے دوسروں کی اور دوسروں کی وجہ سے ہماری جان خطرے میں پڑی مگر ٹریفک کے قوانین اور وعظ و نصیحت کسی مجبوی کا بدل نہیں ہو سکتے' میں اب اس ''ڈیتھ اسکواڈ'' کا ممبر نہیں رہا کیونکہ میرے پاس کار آ گئی ہے' مگر ہزاروں لاکھوں افراد آج بھی اپنی اور اپنے بچوں' نیز دوسروں کی جان خطرے میں ڈال کر اس

طرح سفر کرتے ہیں کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں' ٹریفک پولیس والوں کی فطری رحم دلی اور حقیقت پسندی ہے کہ وہ قریب سے گذرنے والے ان سفید پوشوں کو کچھ نہیں کہتے بلکہ اگر پچھلی نشست پر تھوڑی بہت جگہ خالی ہو تو وہ ہاتھ دے کر اس شہسوار کو روکتے ہیں اور اچک کر بچی کھچی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہتے ہیں" یار ذرا مجھے اگلے چوک میں اتار دینا!"

ان دنوں میرے پاس کار ہے اور میرا کار چلانے کا اپنا اسٹائل ہے۔ میرے ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں موبائل ہوتا ہے اور یوں میں اپنی کہنیوں کے زور پر کار چلاتا ہوں۔ اس طرح کار چلانے میں اگرچہ کچھ پرابلمز ہیں مثلاً انڈیکیٹر نہیں دبایا جاتا' وقت پر گیئر تبدیل نہیں ہوتا' موبائل فون پر گفتگو میں انہماک کی وجہ سے دائیں بائیں اور سامنے آنے والی ٹریفک کے ہارن سننا پڑتے ہیں۔ کسی سے میں جا ٹکراتا ہوں اور کوئی مجھ سے آ ٹکراتا ہے لیکن یہ سب کھیل کا حصہ ہے' یا آپ ٹریفک کے قوانین کی پابندی کر لیں اور یا پھر کار چلانے کے اس دوران خوش گفتار کی خوش گفتاری سے محروم رہیں۔ جس کے بعد انسان محروم نہیں' مرحوم سا ہو جاتا ہے اور اگر ایک مرحوم شخص گاڑی اچھی چلا بھی لے تو اسے کتنے نفلوں کا ثواب ہے۔

مسئلہ صرف ڈرائیونگ کے دوران مختلف مصروفیات یا اور لوڈنگ کا نہیں بلکہ خوش قسمتی سے گاڑی چلاتے وقت یا سڑک پار کرتے وقت ہمارے عوام بہت اہم مسائل پر غور و فکر بھی کر رہے ہیں' سڑک پار کرنے والا حساب لگا رہا ہوتا ہے کہ تین ہزار روپے ماہوار تنخواہ میں ماہانہ دس ہزار روپے اخراجات پورے کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ بچی کی شادی اور بچوں کی تعلیم کے لایعنی مسائل بھی اس کے اعصاب پر سوار ہوتے ہیں' دوسری طرف ویگن چلانے والا بھی اللہ رسول کو یاد کرنے کی بجائے اسی طرح کے دنیاوی حساب کتاب میں پڑا ہوتا ہے۔ تیسری طرف ٹریفک پولیس اہلکار بھی سوچ رہا ہوتا ہے کہ گھر میں اس کے بیوی بچے اپنی ضرورتوں کی پٹاری کھولے بیٹھے ہوں گے اور یوں ان تینوں فریقوں کی دنیاداری سے حادثات ہوتے ہیں..... اگر یہ سب لوگ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں' ایک طبقے کو کروڑوں میں کھیلتے دیکھیں اور اپنے بچوں کو کوڑے کے ڈھیروں میں لت پت ہونے کا نظارہ کرتے دیکھ کر موجودہ نظام کو نظام چلانے والوں کی خباثت قرار دینے کی بجائے اسے تقدیر کا کرشمہ سمجھیں اور اسے اللہ کی رضا قرار دیں تو ٹریفک کے حادثات کبھی نہ ہوں' یہ سارا فساد ادیبوں اور دانشوروں نے ان کے ذہنوں میں پیدا کیا ہوا ہے کہ تمہیں اور تمہارے معصوم بچوں کو اس حال میں رکھنے والا اللہ کے علاوہ وہ ظالم بندے ہیں جن کا روز حساب آج نہیں تو کل ضرور آئے گا۔

ٹریفک کے مسئلے پر اظہار خیال کے لیے میرے پاس ابھی بہت سی باتیں کہنے کی ہیں کیونکہ آپ سب جانتے ہیں۔ میرا شمار ملک کے ماہرین ٹریفک میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ہائی ویز کی تعمیراتی اتھارٹی سے مجھے ایک بات یہ عرض کرنا ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کے

حوالے سے آپ کے دلوں میں جو تشویش پائی جاتی ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے آپ سڑک کے عین درمیان میں جو عظیم الشان گڑھے کھود کر رکھتے ہیں اچانک سڑک کہیں ختم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف سے آنے والا ٹریفک ون وے ٹریفک کو ٹو وے ٹریفک میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں بسوں اور ویگنوں کو ایک دوسرے سے معانقے کا موقع ملتا ہے۔ آپ کی یہ سب کوششیں آبادی کم کرنے کے ضمن میں قابل صد ستائش ہیں مگر اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان حادثوں کے نتیجے میں مرنے کی بجائے لنگڑے' لولے' اندھے اور معذور بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا اہتمام کریں کہ ان حادثوں میں کوئی زندہ نہ بچ سکے۔ کیونکہ اندھے' لولے لنگڑے اور معذور افراد ہمارے دانشوروں' صحافیوں' علمائے کرام' سیاست دانوں اور صاحبان اقتدار میں پہلے ہی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ چنانچہ مزید کی کھپت ممکن نہیں ہے لہٰذا اس سلسلے کے مزید آرڈر موصول ہونے تک وہ اپنی سپلائی روک لیں اور آبادی کی ڈاؤن سائزنگ اللہ پر چھوڑ دیں۔ ویسے بھی خدائی کام خدا ہی کو زیب دیتے ہیں!

ٹریفک کے حادثات ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں کی وجہ سے بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں ہمارا سارا معاشرہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی لعنت میں مبتلا ہے۔ ڈرائیور حضرات بھی اس سلسلے میں ہر طرح کے خطرات مول لے کر اوور ٹیک کرتے ہیں اور زندگی موت کا حساب رکھنے والے فرشتے کو پریشان کرتے ہیں۔ وہ رجسٹر کھول کر ان حادثوں میں مرنے والوں کے نام تلاش کرتا ہے۔ مگر وہ نام اس رجسٹر میں ہوتے ہی نہیں کیونکہ ایسی ان کی موت لکھی ہی نہیں ہوتی۔ ہمارے ڈرائیور محض ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے شوق میں بیچارے مسافروں کو وقت سے پہلے اوپر بھیجتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک بات یہ بھی نوٹ کی ہے کہ زیادہ تر حادثات رات کو ہوتے ہیں یا گاڑیوں کی بتیاں آن نہیں ہوتیں اور یا پھر ڈرائیوروں نے فل لائٹس آن کی ہوتی ہیں' ریڑھے' تانگے' ٹریکٹر' اور سائیکل وغیرہ پر ویسے ہی ٹریفک کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے ہاں سڑکوں پر اندھیرا ہوتے ہی ایک اندھیر سا مچ جاتا ہے۔ میرے ذاتی خیال میں اس کی ایک وجہ غلط فہمی بھی ہے جو غالب نے ہمارے ڈرائیوروں کے ذہن میں ڈال رکھی ہے کہ موت رات کو ہی آ ہی نہیں سکتی۔ اس کے لئے دن کا وقت معین ہے۔ ثبوت کے لئے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

موت کا ایک "دن" معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ ہمارے ڈرائیور جو پشاور سے کراچی تک ٹرک لے کر جاتے ہیں یقین کر بیٹھتے ہیں کہ موت تو دن کو آنی ہے لہٰذا موت کے

خوف سے اپنی رات کی نیند کیوں خراب کی جائے۔ چنانچہ وہ رات ہوتے ہی ٹرک کو آخری گیئر میں ڈالتے ہیں اور سو جاتے ہیں اور پھر اپنے ساتھ کئی دوسروں کو بھی سلا دیتے ہیں۔ آخر میں اصلاح احوال کے لئے میری صرف ایک تجویز ہے اور وہ یہ کہ غالب کے متذکرہ شعر پر پابندی عائد کر دی جائے کہ ویسے بھی ہمارے ہاں تمام مسائل کا حل پابندی عائد کرنے ہی میں سمجھا جاتا ہے۔

◆◆◆

گن مین محمد رمضان!

یو بی ایل کا منیجر ابرار میرا دوست ہے' مجھے جب کبھی وقت ملتا ہے میں اسے ملنے چلا جاتا ہوں یا وہ میرے گھر آ جاتا ہے۔ اس بنک کا گن مین بڑی بارعب شخصیت کا مالک ہے' بڑی بڑی مونچھیں ہیں' گندمی رنگ ہے' صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے' جب وہ کرسی پر بیٹھتا ہے تو اس کی گن کا رخ اکثر اس کی اپنی جانب ہوتا ہے۔ شروع شروع میں یہ شخص اپنے اور اردگرد کے علاقے میں بہت مقبول تھا۔ مگر اب معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔

میرے دوست جانتے ہیں کہ میں کس قسم کے لوگوں میں دلچسپی لیتا ہوں' روٹین کے عین مطابق زندگی گزارنے اور رسم و رواج کی مکمل پابندی کرنے والوں میں میری دلچسپی کم ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگ ہر ملک میں کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اس کے برعکس جو ذرا مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں بہت زیادہ ذہین یا بہت زیادہ احمق ہوتے ہیں۔ بہت اچھے یا بہت برے ہوتے ہیں' بہت زیادہ چالاک یا بہت زیادہ سادہ لوح ہوتے ہیں' وہ میری دلچسپی کا زیادہ مرکز بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میرے ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی آپ کو نارمل کرداروں کی بجائے کاکا منا' آفٹر آل میں داماد ہوں' جواد جی' پروفیسر اللہ دتا اداس' انکل کیوں' شیدا ٹلی اور باجوہ جیسے کردار زیادہ ملیں گے۔

جس گن مین کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بے حد اچھا انسان تھا جب وہ پہلے دن اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں اس وقت ابرار کے پاس بیٹھا تھا' اس نے آ کر ابرار کو فوجی طریقے سے سلیوٹ کیا اور کہا:

''سر! میں آپ کا نیا گن مین ہوں' ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں..... میرا نام محمد رمضان ہے'' ابرار بہت منکسر المزاج انسان ہے' اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنے نئے گن مین سے ہاتھ ملایا اور کہا'' کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا' تم مجھے اپنا دوست پاؤ گے' بس ایک بات یاد رکھنا' تمہاری ڈیوٹی صرف بنک کی حفاظت کرنا ہے' کوئی کلرک یا کوئی افسر تمہیں چائے بنانے کے لئے کہے یا کوئی اور کام لینا چاہے تو صاف انکار کر دینا' بنک کے اندر تمہارا کوئی کام نہیں' تم نے صرف دروازے پر چوکس کھڑے رہنا ہے!'' گن مین محمد رمضان اس دوران ''یس سر! یس سر'' کہتا رہا اور ابرار کی بات ختم ہونے پر اس نے ایک دفعہ پھر سلیوٹ کیا اور اپنی گن تھامے باہر بنک کے گیٹ پر کھڑا ہو گیا' جہاں حکومت کی طرف سے متعین ایک پولیس والا پہلے ہی ایک بنچ پر بیٹھا تھا اس نے اپنی بندوق دیوار کے

ساتھ کھڑی کی ہوئی تھی۔ اپنی ٹوپی اتار اپنی گود میں رکھی تھی اور کھیرے کھا رہا تھا! رمضان نے اسے غصے سے دیکھا اور پھر اپنی ڈیوٹی پر چوکس کھڑا ہو گیا!

یہ نیا گن مین بہت پروفیشنل قسم کا شخص تھا' صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا' اسے بنک میں ہونے والے لڑائی جھگڑوں اور ایک دوسرے کے خلاف ہونے والی دفتری سازشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا' بنک میں داخل ہونے والوں کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیتا' اسے کوئی ڈبل سواری والا موٹر سائیکل یا کار بنک کی طرف آتی دکھائی دیتی تو الرٹ ہو جاتا' اسے کوئی شخص مشکوک لگتا وہ اس سے معذرت کر کے اس کی تلاشی لیتا اور پھر اسے بنک کے اندر جانے دیتا۔ اس کی اس مرض شناسی کی وجہ سے صرف بنک کا عملہ ہی نہیں بلکہ دائیں بائیں واقع دکانوں کے مالک بھی خود کو پہلے سے زیادہ محفوظ تصور کرنے لگے تھے!

مگر پھر رفتہ رفتہ اس کی عادتوں میں تبدیلی آنا شروع ہوئی پہلی دفعہ میرا ماتھا اس وقت ٹھنکا جب میں نے ایک روز اسے سپاہی کے ساتھ بنچ پر بیٹھے کھیرے کھاتے دیکھا' پھر ایک دن وہ بنک کے باہر پھل کی ریڑھی کے پاس کھڑا پھل فروش سے گپ شپ کر رہا تھا۔ ایک دفعہ اس نے بل جمع کرنے والوں کی لمبی قطار میں سے ایک شخص کا بل اور رقم اس سے وصول کی اور اندر جا کر بل جمع کر آیا' اس کے ہاتھ میں کچھ بقیہ تھا جو وہ بل والے کو کچھ اس طرح واپس کر رہا تھا جیسے واپس نہ کرنا چاہتا ہو' بل والے نے اس سے وہ رقم واپس لینے کی بجائے صرف بل کی رسید واپس لی اور لمبی قطار سے باہر نکل گیا!

پہلے یہ گن مین مجھے وردی میں نظر آیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے دھوتی اور کرتا پہننا شروع کر دیا۔ بندوق اس نے اپنی صندوق میں بند کر دی تھی اب وہ دفتری سازشوں کا بھی حصہ تھا اور اندر اور باہر کے ہر قسم کے ہیر پھیر میں بھی پوری طرح ملوث تھا اس نے بارعب شخصیت کا غلط استعمال شروع کر دیا تھا چنانچہ پہلے لوگ اس کا احترام کرتے تھے! اب سے ڈرنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک دن میں حیران رہ گیا جب میں نے دیکھا کہ یہ گن مین ابرار کے دفتر میں داخل ہوا سلیوٹ تو درکنار اس نے ابرار کو سلام تک نہیں کیا اور بڑی بے نیازی سے ابرار کو مخاطب کر کے کہا ''میں ایک ہفتے کی چھٹی پر جا رہا ہوں'' میری طرح ابرار کو بھی اس کا انداز عجیب لگا مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''محمد رمضان! تم چھٹی پر ضرور جاؤ مگر کم از کم میرے نام ایک درخواست تو لکھ دو' آخر میں بنک منیجر ہوں'' اس پر رمضان نے لاپرواہی سے کہا ''صاحب جی اس سے کیا فرق پڑتا ہے درخواست تم خود ہی لکھ لینا'' اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ ابرار کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں تھے' بولا ''یار! یہ یونین بازوں نے سارا ڈسپلن تباہ کر رکھا ہے۔ ان لوگوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں'' اور پھر ابرار نے دو چار صلواتیں بھٹو مرحوم کو سنائیں اور کہا کہ یہ سارا کچھ اس شخص

کا کیا دھرا ہے!

تقریباً ایک ماہ بعد میرا بنک کے سامنے گزر ہوا تو میں نے دیکھا' وہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور سب کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار تھے' ان کے درمیان گن مین رمضان دھوتی اور کرتے میں ملبوس کھڑا تھا۔ مگر وہ بہت مطمئن دکھائی دیتا تھا میں نے اس سے پوچھا ''کیا ہوا؟'' مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا ''ہونا کیا تھا جی' ایک کار سے چار ڈاکو اترے ہیں' انہوں نے سب سے پہلے مجھے اور اس پولیس کو قابو کیا اور پھر بنک لوٹ کر چلے گئے ہیں' ہم سے ہتھیار رکھوا کر ہمارا منہ انہوں نے دیوار کی طرف کر دیا تھا' مگر اللہ کو جان دینی ہے انہوں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی' پیسوں کا کیا ہے جی' وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں' شکر ہے اللہ کا عزت بچالی!''

میرا خیال تھا کہ اس سانحے کے بعد اس کو ہوش آجائے گا اور وہ اپنا رویہ درست کر لے گا' مگر اگلے روز وہ پھر لائن میں لگے لوگوں سے ان کے بل وصول کر رہا تھا۔

◆◆◆

طوطا باتیں کرتا ہے

اداکارہ صائمہ کے طوطے کا ''پواڑا'' ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوا کہ گلوکارہ حمیرا ارشد کے طوطے کا مسئلہ سامنے آ گیا ہے۔ ایک اخباری خبر کے مطابق حمیرا ارشد کے اس بیان کا کہ ''میرا طوطا باتیں کرتا ہے'' آنریری گیم وارڈن لاہور ڈویژن میاں محمد سعید نے سخت نوٹس لیا ہے' انہوں نے حمیرا کا ایڈریس ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے تاکہ اس کا طوطا قبضے میں لے کر چالان کر سکیں۔ واضح رہے کہ محکمہ وائلڈ لائف کے ایکٹ مجریہ 1974ء کے تحت راطوطا رکھنا ''ناجائز'' ہے' اس جرم پر ایک سال قید' دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا ہو سکتی ہے۔

اس نوع کی خبروں میں میری دلچسپی کی وجوہ یوں تو بہت سی ہیں لیکن بنیادی وجہ یہ مسرت ہے کہ ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی کس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ ایک راطوطا رکھنے پر حکومتی مشینری فوراً حرکت میں آ جاتی ہے اور اس ضمن میں کسی کے ساتھ کوئی رعائت نہیں برتی جاتی' ایکسٹرنل پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ملک صاحب کو چاہیے کہ وہ بیرون ملک اس طرح کی خبروں کی نمایاں اشاعت کا اہتمام کریں کیونکہ باہر یہ تاثر عام ہے کہ پاکستان میں جنگل کا قانون نافذ ہے' طوطوں کی خبروں کی اشاعت سے باہر عوام کو پتہ چلے گا کہ پاکستان میں جنگل کا قانون نہیں بلکہ جنگل میں قانون نافذ ہے اور جنگل میں جس طرح کے قوانین ہوتے ہیں' ہم نے ان سے بالکل روگردانی نہیں کی۔

ویسے مجھے گیم وارڈن کی پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی کیونکہ حمیرا نے تو صرف اتنا کہا کہ ''میرا طوطا بہت باتیں کرتا ہے'' اب خدا جانے حمیرا نے کس چیز کو طوطے کا نام دیا ہوا ہے' ممکن ہے اس کا کوئی چھوٹا بھائی ہو' جسے وہ پیار سے طوطا کہتی ہو اور وہ باتیں بہت کرتا ہو' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حمیرا کے کسی کولیگ کا ناک طوطے جیسا ہو اور اسے گلوکار برادری میں طوطا کہا جاتا ہو' یہ بھی ممکن ہے کہ حمیرا کے گھر کے آنگن میں کسی درخت پر کوئی طوطا طوطی رہتے ہوں اور یہ طوطا اپنی طوطی سے بہت باتیں کرتا ہو۔ طوطے کی بے وفائی بہت مشہور ہے چنانچہ اس امر کا امکان ہے کہ حمیرا کے پیش نظر کوئی اس قسم کا ''طوطا'' ہو جو اپنی صفائی میں بہت کچھ کہتا ہو' غرض کہ کوئی ایک وجہ نہیں گنوائی جائے' گیم وارڈن صاحب خواہ مخواہ ایک مبہم سے بیان کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں۔

حمیرا ارشد کا تعلق چونکہ فنون لطیفہ کے شعبے سے ہے' وہ ٹی وی پر بھی آتی جاتی ہیں چنانچہ ایک خیال اور میرے ذہن میں آیا ہے

اور وہ یہ کہ ممکن ہے ان دنوں ٹی وی انتظامیہ سے ان کا جھگڑا ہوا ہو اور انہوں نے پی ٹی وی کو ''طوطا'' قرار دیا ہو جو ہمیشہ کی طرح ان دنوں بھی حکومت کا میاں مٹھو بنا ہوا ہو لیکن یہ بات ذرا مشکل لگتی ہے کیونکہ دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا' حمیرا کا تعلق سیاست یا صحافت سے نہیں ہے ورنہ ''طوطے'' کو کئی مزید معنی پہنائے جا سکتے تھے کیونکہ ان دنوں اس نوع کے بہت سے طوطوں کے گلے میں ''سنہری گانیاں'' نظر آ رہی ہیں اور وہ باتیں بھی پہلے سے زیادہ کرنے لگے ہیں۔

خبر میں یہ بتایا گیا ہے کہ گیم وارڈن صاحب اخبار میں خبر پڑھنے کے بعد سے حمیرا ارشد کے گھر کا پتہ تلاش کرنے لگے ہوئے ہیں' ظاہر ہے اس ان کا مقصد حمیرا ارشد سے کوئی شرف ملاقات حاصل کرنا نہیں بلکہ راطوطا رکھنے کے ''جرم'' میں چالان کاٹ کر اسے بھیجنا ہے۔ میاں سعد گیم وارڈن کے متعلق میرا گمان ہے کہ وہ مہذب انسان ہیں لہٰذا ممکن ہے وہ یہ چالان اپنے کسی اہلکار کے ہاتھ بھیجنے کی بجائے خود دینے چلے جائیں کہ فنون لطیفہ سے وابستہ لوگوں کو کم از کم اتنا پروٹوکول تو دینا ہی چاہیے' باقی رہا حمیرا کا ایڈریس ڈھونڈنے کا مسئلہ' تو گیم وارڈن صاحب پھجے کے پائے کھانے تو کبھی کبھار اس ''بازار'' سے گزرتے ہی ہوں گے' وہاں کسی سے پوچھ لیں کہ ان دنوں حمیرا کہاں رہتی ہے' ویسے میرے عزیز دوست اور ممتاز نغمہ نگار حسن رضوی کے مطابق حمیرا کی رہائش سمن آباد میں ہے' باقی تفصیلات (یعنی گھر کا نمبر اور محل وقوع) بھی انہی سے دریافت کی جا سکتی ہیں۔

حمیرا سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں' تاہم اس گلوکارہ کے ایک مداح کے طور پر' میں آخر میں گیم وارڈن صاحب سے ان کی سفارش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر حمیرا ارشد سے واقعی طوطا برآمد ہو جائے تو وہ اس کا چالان نہ کریں' صرف حمیرا کو سمجھا دیں کہ وہ طوطے کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کرے کیونکہ زیادہ باتیں کرنے سے انسان ہی نہیں' طوطے بھی ایکسپوز ہو جاتے ہیں اور 12 اکتوبر کے بعد سے اب تک ایسے کتنے ہی ''طوطے'' ایکسپوز ہو گئے ہیں جنہیں لوگ بہت معتبر سمجھتے تھے۔

◆◆◆

انجام بخیر!

میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو خوشی ملنے پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی میں کوئی غم آتا ہے تو اس کو بھی اتنی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ نڈھال ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں' مجھے زندگی میں جب کوئی خوشی ملتی ہے تو پہلے میں اس پر اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں اور پھر دعا مانگتا ہوں کہ یا اللہ اس خوشی کا انجام بخیر کرنا' اسی طرح زندگی میں کوئی غم پیش آتا ہے تو اسے اللہ کی رضا سمجھتا ہوں اور پھر دعا کرتا ہوں کہ خداوندا اس غم کو میرے لئے کسی خوشی کا پیش خیمہ بنانا!

امام رضا کا ایک عزیز بچہ سخت علیل تھا اور کبھی بے چینی سے کمرے میں جاتے جہاں بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور کبھی بے چینی سے اس کمرے میں واپس آتے جہاں عقیدت مند بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ حضرت واپس عقیدت مندوں کے کمرے میں آئے تو حضرت کے چہرے پر سکون تھا ایک عقیدت مند نے پوچھا "یا امام کیا بچہ صحت یاب ہو گیا ہے؟" امام نے فرمایا "نہیں فوت ہو گیا ہے" عقیدت مند نے عرض کی "جب وہ بیمار تھا تو آپ پریشان تھے اور جب وہ فوت ہو گیا تو آپ پرسکون نظر آنے لگے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟" حضرت نے فرمایا "جب تک وہ بیمار تھا' اللہ کی رضا مجھ پر واضح نہ تھی۔ اور جب وہ فوت ہو گیا تو اللہ کی رضا مجھ پر واضح ہو گئی' اس کے بعد میری پریشانی رفع ہو گئی" ظاہر ہے یہ مقام تو صرف پیغمبروں' اماموں اور اللہ کے ولیوں ہی کا ہے لیکن اگر غم کو اللہ کی رضا سمجھ لیا جائے تو انسان کا دکھ بہت کم ہو کر ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ انسان کو ہر حالت میں انجام بخیر کی دعا مانگنا چاہیے کہ اس سے بہتر دعا ممکن ہی نہیں' صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بڑی نعمت پانے کے بعد مغرور یا متکبر نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر ایک طرح کی عاجزی آ جاتی ہے۔ اسی طرح کسی غم کا سامنا کرنے کی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کی دوسری دی ہوئی نعمتوں سے منکر ہونے کا گنہگار نہیں ہوتا بلکہ اس کا رحم طلب کرتا ہے اور یہ چیز بھی اسے بہتری کی طرف لے جاتی ہے!

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دو کاروباری لوگوں کو ایک مقررہ تاریخ پر لندن پہنچنا ہے اگر وہ اس تاریخ کو لندن میں ہوتے ہیں تو انہیں بے پناہ مالی فائدہ پہنچ سکتا ہے مگر دونوں کے جہاز کے ٹکٹ چانس پر ہیں آخری وقت پر ان میں سے ایک کی سیٹ کنفرم ہو جاتی ہے اور وہ خوشی خوشی جہاز پر سوار ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا سخت مایوسی اور آزردگی کے عالم میں

واپس گھر کو لوٹ جاتا ہے۔ جہاز کریش ہو جاتا ہے' آپ بتائیں ان دونوں میں سے خوش قسمت وہ تھا جو خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا یا وہ تھا جو خود کو دنیا کا سب سے بدنصیب شخص قرار دے رہا تھا؟ خوشی یا غم خود کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے ان کا انجام' خوشی یا غم کی اصل نوعیت متعین کرتا ہے!

صدر مملکت محمد رفیق تارڑ جب صدر پاکستان منتخب ہوئے تو ناروے جانے سے پہلے میری ان سے روایتی ملاقات ہوئی ساری عمر دیانتداری سے ججی کے فرائض انجام دینے والے پرہیز گار اور متقی محمد رفیق تارڑ اتنے بڑے اعزاز پر بجا طور پر خوش تھے' جس کے متعلق انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ وہ آج بھی ایوان صدر میں ہیں اور بطور صدر اپنے ''فرائض'' انجام دے رہے ہیں ان دنوں ان سے ملاقات کچھ زیادہ آسان نہیں ہے ورنہ میں ملاقات کے دوران اندازہ لگاتا کہ جس دن کو وہ اپنی زندگی کا بہترین دن تصور کرتے تھے' کیا اس دن کے بارے میں ان کا آج بھی یہی خیال ہے؟ میاں نواز شریف جب دوسری مرتبہ بھاری اکثریت کے ساتھ ملک کے وزیر اعظم بنے تو کس قدر خوش ہوئے ہوں گے آج وہ اور ان کا پورا خاندان' ان کے رفقاء اپنی زندگی کے بدترین دن گذار رہے ہیں۔

اسی طرح چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کو طیارے میں جب یہ اطلاع ملی ہوگی کہ انہیں وزیر اعظم نے برطرف کر دیا ہے اور ان کے طیارے کو کراچی کی بجائے نواب شاہ میں اترنے کا حکم ملا ہے تو انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک کمانڈو جنرل پرویز مشرف کو فطری طور پر پریشانی لاحق ہوئی ہوگی..... لیکن جب طیارے ہی میں انہیں خبر ملی کہ آرمی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے اور پھر جب ان کا جہاز کراچی ائیر پورٹ ہی پر اترا اور وہ ملک کے چیف ایگزیکٹو بنے تو اس کامیابی پر وہ یقیناً بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ گویا اصل چیز انجام ہے اور میں آج کے کالم میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی میں اگر کبھی کوئی خوشی یا غمی آئے تو ہر دو صورتوں میں انجام بخیر کی دعا کرنا چاہیے!

◆◆◆

دین دار طوطے!

میں اپنے قارئین (اور ایڈیٹر سے بھی) سے معذرت خواہ ہوں کہ میرا آج کا کالم بھی ایک راطوطے پر ہے مگر یہ طوطا کسی گلوکارہ یا اداکارہ کا نہیں ہے بلکہ پاکستان کے غالباً سب سے بڑی دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے رشید احمد شاہ صاحب کی ملکیت ہے۔ شاہ صاحب کی عمر اس وقت نوے برس کے لگ بھگ ہے شاہ صاحب جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے اور یہ طوطا اس وقت سے شاہ صاحب کے پاس ہے۔ یہ طوطا خود بھی خاصا بزرگ ہو چکا ہے۔ صرف عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے بعض اطوار کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ بہت سی بابرکت اور مقدس ہستیاں اس طوطے کی زیارت کو خود چل کر اس کے پاس آ چکی ہیں۔

اس متقی اور پرہیز گار طوطے (زید مجدکم) کے بارے میں کچھ تفصیلات سے تو میں آپ کو بعد میں آگاہ کروں گا پہلے میں اس راز سے پردہ اٹھا دوں کہ اس بزرگ و محترم طوطے کی ''مخبری'' جامعہ اشرفیہ کے دورہ حدیث کے استاد گرامی مولانا حافظ محمد اکرم کاشمیری نے کی ہے مگر انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اگر اس مقدس طوطے پر کالم لکھنا چاہتا ہوں تو جامعہ کا نام درمیان میں نہ لاؤں کہ کہیں گیم وارڈن والے جامعہ اشرفیہ کا ''ایڈریس'' ہی نہ پوچھتے پھریں مگر میں حکم کی عدم تعمیل کرتے ہوئے جامعہ کا نام دے رہا ہوں کیونکہ راطوطا رکھنے کے الزام میں اگر کسی اداکارہ یا گلوکارہ کا چالان ہو تو درشن کے امکانات بھی ہوتے ہیں موجودہ صورت حال میں نوے سالہ رشید احمد شاہ صاحب کے درشنوں کا رسک ہے۔ لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں! ویسے بھی آج مولانا فضل الرحمان کا بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ جس کسی نے دینی مدارس میں بدنیتی سے قدم رکھا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اور ان دنوں تو بیساکھیاں نہ صرف مہنگی ہیں بلکہ ان پر بھی ٹیکس لگنے والا ہے۔

رشید احمد شاہ صاحب کا یہ طوطا کلمہ پڑھتا ہے اور صرف کلمہ نہیں پڑھتا بلکہ پورے آداب کے ساتھ پڑھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ راطوطوں کو تو کوئی جملہ رٹایا جاتا ہے اور وہ جملہ وقت بے وقت دہراتے رہتے ہیں اس کے برعکس اس طوطے سے جب فرمائش کی جائے یعنی کہا جائے کہ کلمہ سناؤ تو وہ کلمہ سنانے سے پہلے مؤدب انداز میں کہتا ہے ''اجازت ہے؟'' آپ ہاں کہتے ہیں تو پھر وہ کلمہ طیبہ سناتا ہے مفتی اعظم فلسطین جناب امین الحسینی جامعہ اشرفیہ کے دورے پر آئے تو انہوں نے طوطے کی ''زیارت'' کی اور اس سے کلمہ سنا

مفتی اعظم کی رائے یہ تھی کہ انہوں نے اس سے پہلے کسی طوطے سے اتنے واضح انداز میں کلمہ نہیں سنا۔ اسی طرح قاری عبدالباسط بھی اس عالی مقام طوطے سے کلمہ سن چکے ہیں اور اس کے شین قاف کی تعریف کر چکے ہیں امام کعبہ عبداللہ بن سبیل اور مسجد نبوی کے سابق امام عبدالعزیز آل شیخ نے بھی جامعہ اشرفیہ کے دورے کے دوران اس طوطے (مدظلہ العالی) سے کلمہ سنا اور بھی حیران ہوئے!

یہ سب حضرات تو پوری نیک نیتی سے اس عالی مقام طوطے سے کلمہ سنتے رہے مگر میرے دل میں ایک خدشے نے جنم لیا ہے اور وہ یہ کہ یہ طوطا کہیں کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے اس کے دل میں کہیں یہ بات نہ آئے کہ ہمارے علماء دوسروں کے ایمان کے بارے میں خواہ مخواہ شک کیوں کرتے ہو چنانچہ جس نے ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا اس سے بار بار کلمہ کیوں سنا جاتا ہے یہ وہم میرے ذہن میں اس لئے آیا ہے کہ کسی زمانے میں تبلیغی جماعت والے جب دورے پر نکلتے تھے تو لوگوں سے کلمہ سنتے تھے ایک دفعہ میں اور عارف مرحوم بھی ایک ایسی ہی جماعت کا حصہ تھے عارف اس روز متکلم کے فرائض انجام دے رہا تھا' ہمارا پڑاؤ لاہور کے ایک قریبی گاؤں کی مسجد میں تھا عارف نے غلطی سے گاؤں کے میراثی سے تبلیغی جماعت والوں کی روایتی عاجزی اور ملائمت سے کہہ دیا ''بھائی! کلمہ سناؤ'' یہ سن کر اس ستم ظریف نے چونک کر کہا ''کیوں' بدل گیا ہے؟'' مجھے ڈر ہے کسی روز یہ طوطا بھی کلمہ سنانے کی فرمائش کو اپنے ایمان پر شک سمجھ کر پوچھ نہ بیٹھے ''کیا بات ہے کلمہ بدل گیا ہے؟''

مولانا حافظ محمد اکرم صاحب سے مجھے یہ بات پوچھنا یاد نہیں رہی کہ کیا یہ طوطا صرف کلمہ پڑھتا ہے یا اسلامی تعلیمات پر عمل بھی کرتا ہے؟ اسلامی تعلیمات سے میری مراد وہ نہیں جو عام طور پر سمجھی جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ کیا یہ طوطا حرام حلال کا خیال رکھتا ہے کسی پر بغیر ثبوت الزام تو نہیں لگاتا اور اس الزام کو آگے تو نہیں پھیلاتا؟ ہمسایوں کا خیال رکھتا ہے' جھوٹ نہیں بولتا' کلمہ حق بغیر کسی مصلحت کے کہتا ہے۔ استحصالی نظام کے خلاف ہے' امارات اور غربت میں اتنے زیادہ فاصلے کو ناپسند کرتا ہے وغیرہ وغیرہ' مگر شکر ہے میں نے نہیں پوچھا کیونکہ مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ یہ بچارہ تو پنجرے میں بند ہے اور چاہے کوئی غلام فرد ہو اور یا کوئی غلام قوم ہو' اس کی اخلاقیات اور مذہب کی تشریح آزاد افراد اور آزاد اقوام سے مختلف ہوتی ہے۔ اس وقت صرف یہ طوطا ہی نہیں! امت مسلمہ اہل مغرب اور اپنے حاکموں کی غلام ہے چنانچہ ہمارے مذہب کی تشریح نماز روزے سے شروع ہو کر نماز روزے پر ختم ہو جاتی ہے! یہ دور ملوکیت کی تشریح ہے جس میں نماز روزے کے پابند ظالم و جابر حکمرانوں کو دیندار قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے پابند صوم وصلوٰۃ کو حقوق العباد پر ترجیح نہیں دی جاتی' ہمارے ان آئمہ نے کی جنہوں نے اس کی پاداش میں حاکموں سے کوڑے کھائے اور جو پھانسیوں پر لٹکائے گئے ..... لہٰذا طوطے کے حوالے سے اس طرح کے سوالات کرنا زیادتی کی بات ہے ہم بھی کلمہ پڑھتے ہیں' یہ طوطا بھی کلمہ پڑھتا ہے' اس

کے بعد ہم گھناؤنے جرائم کا ارتکاب بھی کریں' دوزخ کے دروازے ہم پر بند رہیں گے اور یوں کالم کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ہم سب دین دار طوطے ہیں' جو نہیں ہیں! میں ان سے معذرت خواہ ہوں؟

◆◆◆

حلف کی خلاف ورزی؟

ہمارے ہاں یہ ایک اچھا رجحان ہے کہ جب کوئی حکومت بدلتی ہے سابقہ حکومت کے ''سیاہ کارناموں'' پر مشتمل کتابیں فوراً مارکیٹ میں آجاتی ہیں' بعض دفعہ تو مصنفین کی پھرتی پر حیرت ہوتی ہے کہ آج حکومت بدلی ہے' کل کتاب بک سٹالوں پر نظر آتی ہے جس سے ایک گمان یہ بھی گزرتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے عمل میں مصنف بقلم خود شریک تھا' میں نے اس رجحان کو اچھا اس لئے کہا ہے کہ ان دنوں ''سب اچھا ہے'' کہنے کا رواج عام ہے اور انسان کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے ورنہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے!

اس سال 12 اکتوبر کو جنرل پرویز مشرف نے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کو برطرف کیا اور اس وقت سے ''نواز شریف حکومت کے سیاہ کارناموں'' پر مشتمل کتابیں دھڑا دھڑ مارکیٹ میں آرہی ہیں' سپریم کورٹ نے جنرل پرویز مشرف کے حق میں جو تاریخ ساز فیصلہ سنایا' اس کے بھی کچھ حصے اسی ذیل میں آتے ہیں' بہرحال 12 اکتوبر کے بعد جو کتابیں سامنے آئی ہیں' ان کی اکثریت ''قینچی ورک'' پر مشتمل ہے اور کچھ ایسی ہیں جو حالات وواقعات کی تصویر واضح ہونے کا انتظار کئے بغیر لکھی گئی ہیں' ان میں بیان کیا گیا پس منظر مصنف کی خواہشات کا آئینہ دار ہے اور پیش منظر نام کی کوئی چیز نہیں ہے!

حال ہی میں اس سلسلے کی ایک قابل ذکر اور اہم کتاب شائع ہوئی ہے' جس کا نام ''کوڑھ کی کاشت'' ہے اور اس کے مصنف ڈاکٹر حقی حق ہیں جو امریکہ میں مقیم ہیں اور شکاگو بورڈ آف ایجوکیشن سے منسلک ہیں' اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے فوجی افسروں' سیاستدانوں' جاگیرداروں' بیوروکریٹس اور علماء سب کو بہت بری طرح رگیدا ہے اور کہا ہے کہ ان سب طبقوں کی نس نس اور ہر رگ وریشے میں کوڑھ رچ گیا ہے' اس کتاب کی تدوین میں خاصی محنت کی گئی ہے اور اس میں ملک اور قوم کا درد بھی نظر آتا ہے چنانچہ اس میں کسی ایک شخصیت کو نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جو فرد یا طبقہ بھی پاکستان کی تباہی کا باعث بن رہا ہے' اسے انہوں نے معاف نہیں کیا۔

تاہم اس کتاب میں ایک جگہ پر مجھے تحقیق کا وہ معیار نظر نہیں آیا' جو ڈاکٹر صاحب ایسے اسکالر شخص سے متوقع ہے اور یہ فروگذاشت اخباری خبروں' تراشوں اور کالموں پر اندھا دھند اعتماد کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ''اردو ڈائجسٹ'' نے کتاب کا وہی باب اپنے تازہ شمارہ میں ری پروڈیوس کیا اور یوں اس باب میں حقیقت کو جس طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے' اسے

مزید قارئین کے ذہنوں کو آلودہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

اس باب میں ایک اخباری کالم درج کیا گیا ہے جس کے مطابق 1992ء میں جب کراچی میں پہلا آپریشن شروع ہوا تو تمام بڑے دہشت گرد فرار ہو کر لاہور اور ملتان آ گئے' ایجنسیوں کو اس کی خبر ہو گئی' انہوں نے فوراً مجرموں کے پروفائل تیار کئے اور جا کر آئی جی پنجاب چودھری سردار کو پیش کر دیئے' چودھری سردار نے وقت ضائع کئے بغیر وزیراعظم نواز شریف سے رابطہ قائم کیا اور زبردست آپریشن کے ذریعے تمام دہشت گرد گرفتار کر لیے' ان میں سے جو دہشت گرد سب سے زیادہ معصوم تھا' اس نے 22 قتل کیے تھے۔ جب وزیراعظم کو اس کامیاب آپریشن کی اطلاع دی گئی تو وزیراعظم نے خود فون پر آ کر چودھری سردار محمد کو مبارکباد دی۔ مگر اگلی ہی صبح راولپنڈی سے ایک ''مرحوم'' کا فون چودھری سردار کو آیا کہ ان دہشت گردوں کو فوری طور پر رہا کر دو۔ چودھری سردار یہ سن کر پسینے میں نہا گئے' انہوں نے ''مرحوم'' سے الفاظ دہرانے کی درخوست کی یہ سن کر ''مرحوم'' کو غصہ آ گیا انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ''میں کہہ رہا ہوں' آپ ان 16 افراد کو فوراً چھوڑ دیں' چودھری سردار محمد نے بال وزیراعظم نواز شریف کے کورٹ میں پھینک کر معذرت کر لی' ''مرحوم'' انکار سن کر چراغ پا ہو گئے اور چودھری صاحب کو شدید دھمکیاں دیں بقول چودھری سردار محمد ''مسلسل پندرہ منٹ انگریزی میں گالیاں دینے کے بعد بھی جب ''مرحوم'' کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے دوبارہ فون کیا لیکن میرا ایک ہی جواب تھا'' یہ آپریشن وزیراعظم کی خصوصی ہدایت پر کیا گیا' لہٰذا ہم ان کی اجازت کے بغیر کوئی بندہ نہیں چھوڑ سکتے۔''

میں اس قصے کو مختصر کرتے ہوئے اس کا انجام بتاتا ہوں کہ ایک دن خود وزیراعظم لاہور کے ائیر پورٹ پر ایجنسیوں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ بلاتے ہیں اور پھر ساری بحث و تمحیص کے بعد حکم دیتے ہیں کہ ان دہشت گردوں کو فوری طور پر رہا کر دیا جائے! ایک افسر احتجاج کرتا ہے تو نواز شریف جھنجھلا کر کہتے ہیں'' آرڈر از آرڈر''

آپ یقین کریں میں نے جب سے یہ واقعہ پڑھا تو میں ہل کر رہ گیا اور میرے دل میں میاں نواز شریف کے لئے بہت منفی جذبات پیدا ہوئے اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر یہ واقعہ درست ہے تو آج کے بعد میرے اور میاں صاحب کے راستے مختلف ہوں گے' میں انہیں پاکستان دوست سمجھتا تھا مگر اس واقعے نے میری رائے میں تبدیلی واقع کر دی' مگر پھر میں نے سوچا کہ کتاب میں چودھری سردار محمد کے ریفرنس سے یہ واقعہ کوٹ ہوا ہے' لہٰذا کیوں نہ براہ راست ان سے بھی پوچھا جائے اور خصوصاً یہ کہ وہ نقاب پوش مرحوم کون تھا کیونکہ ممکن ہے اس وقت چودھری سردار محمد نے میرے دوست کالم نگار سے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ''مرحوم'' کا نام مخفی رکھا ہو۔ چنانچہ چودھری صاحب نے میرے استفسار پر کہا۔

''آپ نے میری کتاب THE ULTIMATE CRIME پڑھی ہے؟''

میں نے کہا۔''سرسری دیکھی تھی اور اپنے کالموں میں ان کا حوالہ بھی دیا تھا۔''

بولے''ایک دفعہ پھر پڑھیں''

میں نے یہ کتاب ایک بار پھر پڑھی تو اس میں یہ واقعہ پورا درج تھا'بس فرق یہ تھا کہ کالم میں جس''مرحوم'' کا ذکر تھا'اس''مرحوم'' کا نام جنرل آصف نواز تھا جو اس وقت افواج پاکستان کے سربراہ تھے' مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے کوئی بم پھٹا ہو!

ڈاکٹر حقی صاحب سے میرا سوال ہے کہ کیا اس کے بعد بھی اندھا دھند ہم برائی اور ہر جرم سیاست دانوں ہی کے کھاتے میں ڈالتے رہیں گے۔ نیز یہ کہ اگر قوم سے حقائق اسی طرح چھپائے گئے تو کیا قوم عذاب الٰہی سے بچ سکے گی؟ اس واقعے سے'اہم نوعیت کے فیصلوں میں وزیر اعظم کی بے بسی پوری طرح آشکار ہوتی ہے اور اگر نواز شریف کبھی دہشت گردوں کی رہائی کے سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے اور اس کردار کشی کا جواب دینے کے لئے قوم کو صحیح صورتحال سے آگاہ کریں تو کیا ان کا یہ اقدام حلف سے خلاف ورزی کے زمرے میں آئے گا؟ میرا یہ سوال مدیر اردو ڈائجسٹ الطاف حسن قریشی صاحب سے ہے!

◆◆◆

سائیں ایڈیسن اور سائیں کوڈے شاہ!

ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ اگر گذشتہ کئی صدیاں ہماری تھیں تو علم کے حوالے سے یہ صدی اہل مغرب کی ہے۔ شام ہوتی تھی تو ہمارے گھروں پر آسیب کا گمان گزرنے لگتا تھا' ہاتھ میں لالٹین پکڑے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جاتے تھے' اردگرد کے چند قدم روشن ہو جاتے تھے اور پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا رہ جاتا تھا۔ روشنی اور اندھیرے کی اس آنکھ مچولی میں لالٹین بردار کا سایہ کبھی سکڑ کر ایک ''چھلیڈے'' کی صورت اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور کبھی ایک بھوت کی طرح پھیلتا چلا جاتا تھا اور اندھیرے کمروں میں لالٹین ہاتھ میں تھامے' گھومنے والا یہ شخص خوفزدہ ہو کر جلد سے جلد واپس اس کمرے میں جانا چاہتا جہاں گھر کے سب افراد موجود ہوتے تھے۔ پھر ایک دن اہل مغرب نے ہمیں بجلی کا تحفہ بھیجا' جس نے شہروں' دیہاتوں' جنگلوں اور پہاڑوں کو بقعہ نور بنا دیا۔ اب ایک بٹن دبایا جاتا ہے اور تاریکی دور ہو جاتی ہے۔

پرانی چیزوں کی رومانویت اپنی جگہ لیکن مٹی کے گھڑوں کی جگہ ریفریجریٹر نے لی ہے۔ تانگوں کو تیز رفتار گاڑیاں پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ مجھ ایسا رومانویت پسند شخص بھی ان چیزوں کو یاد تو کرتا ہے لیکن انہیں دوبارہ اپنی زندگی میں داخل کرنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ ٹیلیفون' فیکس مشین' ہوائی جہاز' کمپیوٹر' انٹرنیٹ' کیمرہ کلوننگ' خلائی سیارے' یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایک جادو کی دنیا ہے' جسے اہل مغرب کے علمی تجسس اور آزاد علمی فضا نے حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسان چاند پر چہل قدمی کرنے لگا ہے۔ کروڑوں برس پہلے وقوع پذیر ہونے والی کائناتی تبدیلیوں کے سراغ میں کامیاب ہوا ہے اور آنے والے موسموں کے بارے میں بتاتا ہے' انسان کو دل کے آپریشن کے دوران کچھ دیر کے لئے موت کے حوالے کرتا ہے اور پھر اسے زندہ کر دیتا ہے۔ میں ایک ایسے انسان کو جانتا ہوں جو اس طرح تیسری زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی زندگی کو بچانے والی دوائیں اور سرجری کے حیرت انگیز کمالات اس کے علاوہ ہیں۔ مغرب کا انسان ہمہ وقت اقبال کی طرح خدا کے ساتھ اس طرح کے مکالمے میں مشغول رہتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی' ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی

خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم نہ از زہر نوشینہ سازم

میں حیران ہوتا ہوں جب ٹیلی ویژن پر وائلڈ لائف کی فلمیں دیکھتا ہوں' مغرب کے سلنگ ریسرچ اسکالر ایک نیکر اور بنیان پہنے اور روکھی سوکھی کھاتے کئی کئی مہینے اپنے کیمروں کے ساتھ درندوں اور موذی کیڑے مکوڑوں کے درمیان گزار دیتے ہیں اور اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر ان کی ایک ایک حرکت اپنے کیمروں میں محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر برسوں کے غور وخوض کے بعد ان کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ سمندر کی تہوں میں اترتے ہیں اور علم کے کتنے ہی موتی ہمارے لئے نکال کر لاتے ہیں!

مغربی مفکروں' فلاسفروں اور دانشوروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے جامد انسانی ذہنوں میں ہلچل پیدا کی اور سوچ کے کتنے ہی در وا کئے' ان میں کارل مارکس' فرائڈ' سارتر' کافکا' برگسان' نطشے' برائڈرسل' والٹیر اور ڈارون سمیت بے شمار نام ہیں۔ ہم نے ان فلسفوں کو گمراہ کن کہنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔ کوئی فلسفہ' کوئی خیال گمراہ کن نہیں ہوتا' انسان اگر راستہ بھول جائے تو منزل کی طرف جانے والے رستے کی تلاش میں وہ ان مقامات سے گزرتا ہے' جدھر سے وہ پہلے نہیں گزرا تھا۔ اس کی آنکھیں اس ''گمراہی'' کے دوران وہ مناظر دیکھتی ہیں جو اس سے پہلے اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ چنانچہ علم کے حصول کے سفر میں بھٹکتا علم کی منزلوں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اہل مغرب علم کے لئے سرگرداں رہتے ہیں' ہم ''کالے علم'' کے دیوانے ہیں' دنیا کہاں جارہی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں' ہم مغرب کی حکمرانی پر سیخ پا ہوتے ہیں' ان کی ڈکٹیشن سے ہماری انا مجروح ہوتی ہے' ہماری قومی سلامتی خطرے میں پڑتی ہے مگر اس کا مداوا کن چیزوں میں تلاش کرتے ہیں؟ دانش کے سوتے خشک پڑے ہیں' ذہنوں پر جہالت کے قفل ہیں ذہن کی کھڑکیاں دروازے بند ہیں' نئے خیال اور نئی سوچ کے لئے کوئی راستہ نہیں' اگر کہیں سے یہ سوچ نمودار بھی ہوتی ہے' ہم نیزوں' کلہاڑوں اور تلواروں سے اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اہل مغرب کے تاریک دور میں بھی ایسے ہی ہوا کرتا تھا۔ ہمیں اپنے اصل مسئلوں اور ان کے حل سے غافل کر کے عجیب وغریب چکروں میں الجھایا جارہا ہے!

اہل مغرب کے پاس سائیں مارکونی' سائیں ایڈیسن' سائیں نیوٹن اور سائیں آئن سٹائن وغیرہ ہیں' جب کہ ہمارے پاس سائیں کوڈے شاہ ہے۔

ویسے ممکن ہے ہمارے تمام مسائل کا حل اور مغرب کی تمام کامیابیوں کا توڑ ہمارے سائیں کوڈے شاہ ہی کے پاس ہو۔ ہوسکتا ہے ایسے ہی ہو، مگر یقین کے ساتھ کیا کہا جاسکتا ہے؟

◆◆◆

سری پائے اور حب الوطنی

اپنے دوستوں کی کسی غلط بات کی تردید کرنا۔ اخلاقی اور شرعی طور پر شاید مستحسن فعل ہے کیونکہ یہ وہ گواہی ہے جو دینا مشکل ہوتی ہے لیکن میں چونکہ گنہگار انسان ہوں چنانچہ ایسے مواقع پر میں اپنے اندر سچ بولنے کی ہمت بہت کم پاتا ہوں جب میرا ایک دوست دانستہ یا نادانستہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہو جو واقعاتی طور پر درست نہ ہو دو تین دن پہلے بھی مجھے اس مشکل مرحلے سے گزرنا پڑا تھا تاہم میں نے اتنا سمجھوتہ ضرور کیا کہ کالم نگار دوست کا نام اور نشانیاں بیان نہیں کیں کہ بنیادی طور پر یہ دوست نیک روح کا مالک ہے آج پھر اسی قسم کی صورت حال کا سامنا ہے۔ میرے ایک اور کالم نگار دوست نے کارگل ایشو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''نواز شریف جیسا شخص جنگ کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا روپیہ بنانے' کھانے' کھیلنے' اور تفریحات کا آدمی' جو کارگل پر دی جانے والی بریفنگ میں کیک کھاتا اور جنرل عزیز سے پوچھتا رہا کہ یہ کس بیکری سے منگوائے گئے ہیں۔ وہ شخص کہ جو کراچی میں لسی کی دکانوں اور لندن میں نہاری والے ہوٹلوں کے راستے خوب جانتا ہے جو ناروے پہنچ کر سفارت خانے میں پائے کے سالن کی فرمائش کرتا ہے' وہ خوفزدہ ہو کر واشنگٹن روانہ ہوا اور صدر کلنٹن کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا'' یہ عبارت بہت خوبصورت ہو سکتی تھی' اگر اس کا اگلا جملہ یہ ہوتا کہ ''اس شخص کی حکومت کی برطرفی کے بعد کلنٹن اور اس کی پوری کابینہ خود پاکستان میں موجود ہے تاکہ اس کے سامنے سجدہ ریزی کے لئے کسی شریف آدمی کو اتنا لمبا سفر طے نہ کرنا پڑے۔''

بہرحال میرا دوست لکھنا جانتا ہے' وہ اگر نہ لکھنا چاہے تو دوسری بات ہے لہٰذا اس اس کی لکھائی کے حوالے سے مشورے دینا' مچھلی کو تیرنے کے بارے میں مشورے دینے کے مترادف ہے۔ البتہ میرے دوست میاں نواز شریف کو ناروے میں پرائم ٹیلی ویژن کے افتتاح کے لئے ایک رات کے قیام کے دوران جو اوسلو کے پاکستانی سفارت خانے میں پہنچایا ہے اور وہاں ان سے سری پائے کی جو فرمائش کروائی ہے' اس سے میں شک میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ آیا ان دنوں میں اوسلو میں موجود تھا کہ نہیں؟ کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں وزیراعظم اور ان کے وفد کو اوسلو ائرپورٹ سے سیدھا ہوٹل لے کر گیا تھا جہاں پاکستانیوں کی بڑی تعداد نے ہلالی پرچم والی جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں جو اوسلو میں مقیم پاکستانیوں اور وفد میں شریک زعما کے ساتھ تھیں۔ وزیراعظم' پاکستانی سفارت خانے جا ہی نہ سکے اور نہ ہی یہ ان کے پروگرام میں شامل تھا' مجھ سے یا

میرے عملے کے کسی فرد سے انہوں نے سری پائے کی فرمائش نہیں کی (یہ بات میں جو خود ایک دیسی آدمی ہوں ایک دیسی کالم نگار کے جواب میں کچھ اتنے معذرت خواہانہ انداز میں لکھ رہا ہوں جیسے وزیر اعظم کی کسی نازیبا سی فرمائش کا ذکر ہو)

وزیر اعظم کا لنچ اسی ہوٹل کے ریستوران میں تھا جہاں وہ اور ان کے وفد کے ارکان مقیم تھے۔ یہ ''کوائٹ لنچ'' (Quiet lunch) تھا یعنی اس میں باہر کے لوگ شریک نہیں تھے' میرے علاوہ کھانے میں ایک صاحب اور بھی تھے' جنہیں میں نہیں جانتا تھا' میاں صاحب ان سے اور وہ میاں صاحب سے بے تکلف تھے۔ ان صاحب نے اپنی باتوں سے کھانے کو (جو مچھلی اور سلاد پر مشتمل تھا) بہت لطف بنائے رکھا' موصوف میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''میاں جی' آپ کے ساتھ امریکہ تو جا رہا ہوں' مگر ایک بات کا خاص خیال رکھیں کہ کلنٹن میرے سامنے نہ آئے!'' میاں صاحب نے پوچھا ''وہ کیوں؟'' موصوف نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''وہ جب بھی ملتا ہے اپنے پیسے واپس مانگ لیتا ہے!'' ویسے اپنے کالم نگار دوست کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میاں صاحب کو سری پائے ایسی لذیذ ڈش پسند ہی نہیں ہے اور خوراک کے ضمن میں ان کی یہ واحد ''بدذوقی'' ہے جو کسی لاہوریئے میں پائی جا سکتی ہو۔ تاہم میں سوچتا ہوں کہ غالب اگر ہمارے دور میں ہوتے اور وزیر اعظم بن جاتے تو آموں کے ساتھ ان کی رغبت' کس درجہ گھٹیا حرکت سمجھی جاتی؟

بہر حال میرا آج کا کالم سری پائے کے ''فضائل'' بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے میری یہ خواہش مضمر ہے کہ میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف اور دوسرے اسیروں کے خلاف ٹنوں کے حساب سے جو الزام لگائے جا رہے ہیں' ان الزامات کی ''ساکھ'' قائم رکھنے کے لئے ''ضروری'' ہے کہ اگر کہیں کوئی ''ڈس انفارمیشن سیل'' قائم ہے تو وہ ایک کمیٹی قائم کرے اور جو الزامات کی اسکروٹنگ کرے اور پھر ان میں سے جو الزامات سچے ہوں یا جنہیں ایسے بنا کر پیش کیا جا سکے کہ وہ سچے لگنے لگیں' صرف انہی ''منظور شدہ'' الزامات کی چھریاں چلائی جائیں' اگر ہم کسی داڑھی والے کا جرم' کسی مونچھوں والے کے کھاتے میں ڈالیں گے تو تاریخ اس الزام کو ہضم نہیں کر سکے گی اور اسے اگل دے گی' حافظہ عوام کا کمزور ہوتا ہے' تاریخ کا نہیں'

یہ کالم اگرچہ سری پائے پر نہیں ہے چونکہ اس خانہ خراب کا ذکر کالم میں آ ہی گیا ہے تو آخر میں ایک واقعہ اپنے حوالے سے بھی بیان کرنا چاہتا ہوں' ویسے اس خوراک کو میں نے خانہ خراب اس بٹ صاحب کے حوالے سے قرار دیا ہے جن سے کسی نے پوچھا تھا کہ بٹ صاحب آج کل آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں' آپ کے تو تین اپنے مکان تھے' وہ کہاں گئے؟'' بٹ صاحب نے بڑے سکون سے کہا ''وہ بیچ کر سری پائے کھا لئے تھے!'' بہر حال جو واقعہ میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں' وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اوسلو میں ایک

افواہ بڑے زوروں سے پھیلی اور وہ یہ کہ سفیر صاحب گرون لینڈ (پاکستانیوں کا محلہ) کے ایک ریستوران میں ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ بیٹھ کر سری پائے کھاتے پائے گئے ہیں اور اس حرکت کا معززین شہر اور اشرافیہ نے برا مانا ہے' آخر ایک صبح کو میں نے مولانا نعمت علی شاہ صاحب مدظلہ العالی (جن کی میں بہت عزت کرتا ہوں) کی جامع مسجد اہل سنت والجماعت (جو شہر کی سب سے بڑی مسجد ہے) میں جمعے کی نماز سے پہلے ''خطبہ'' دیا اور یہ کام میں شہر کے مختلف مساجد میں کرتا رہتا تھا' میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''میں جب سے ناروے میں آیا ہوں' شہر میں روزانہ کسی نہ کسی کے بارے میں کوئی افواہ سنتا ہوں جو دو تین روز بعد غلط نکلتی ہے' ان دنوں ایک افواہ میرے بارے میں بھی شہر میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ میں گرون لینڈ کے ایک ریستوران میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھ کر سری پائے کھاتے'' پکڑا'' گیا ہوں اور خواتین وحضرات' یہ پہلی افواہ ہے جو بالکل صحیح ہے' تاہم یہاں میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ سفیر بننے سے پہلے میری ساری عمر انہی لوگوں کے ساتھ گزری ہے' سفارت کا عرصہ بھی انہی کے ساتھ گزرے گا اور سفارت کے بعد بھی انہی لوگوں میں رہوں گا بلکہ میری دعا ہے کہ قیامت کے روز میں چودھریوں اور وڈیروں کے ساتھ اٹھائے جانے کی بجائے انہی محنت کشوں کے ساتھ اٹھایا جاؤں''

باقی رہا کارگل ایشو اور وزیراعظم کا امریکہ جانا' اس بارے میں نہ میرے پاس فرسٹ ہینڈ انفارمیشن ہے اور نہ میرے کالم نگار دوست کے پاس' ہم دونوں کو یا تو چیف ایگزیکٹو کی باتوں پر اعتبار کر کے معزول وزیراعظم کی حب الوطنی کو مشکوک قرار دینا پڑے گا اور یا معزول وزیراعظم کے بیان کو صحیح مان کر چیف ایگزیکٹو کی حب الوطنی پر غور کرنا پڑے گا۔

◆◆◆

اداس نسلیں!

پاکستان میں ایک ایسی نسل جنم لے چکی ہے جن کے والدین نے ان کے بہتر مستقبل کے لئے وطن کی مٹی سے انہیں جڑوں سمیت اکھاڑا اور انہیں گملے میں اگا کر گھر کے ڈرائنگ روم تک محدود کر دیا۔ یہ نسل انگریزی مشنری اداروں یا بقول ہمارے انگلش میڈیم ''تھاٹ سکولوں'' میں پروان چڑھی جہاں انہیں وہ نصاب پڑھایا گیا جو اس ملک کے نوے فیصد لوگوں کے نصاب سے مختلف ہے' ان سے اس زبان میں گفتگو کی گئی جو ہماری حکمران کلاس بیوروکریسی کی زبان تو ہے اس ملک کے لوگوں کی زبان نہیں ہے۔ انہیں وہ آداب سکھائے گئے جن آداب کا اس ملک میں چلن نہیں ہے۔ انہیں وہ فلمیں دکھائی گئیں جو بدیشی معاشرت کی عکاسی کرتی تھیں اور بدیشی معاشرت کی طرف راغب کرتی تھیں' انہیں گھر میں بس وہی ماحول ملا جو اس نسل کے لئے مخصوص تعلیمی اداروں میں تھا!

جب یہ نسل بلوغت کو پہنچی تو انہوں نے بدیشی دانشوروں کو کچا پکا پڑھا اور انہی سے متاثر ہوئے اور یوں آہستہ آہستہ اس ملک اور اس قوم کے عوام سے ان کی وابستگی محض دانشوری کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ان کے والدین نے جس غرض کے لئے اس پودے کو زمین سے اکھاڑ کر گملے میں سجایا تھا' ان کی وہ غرض پوری ہو گئی' یہ لوگ ہمارے حکمران بن گئے یا اس اقلیتی گروہ حاکماں کے منظور نظر ہو گئے۔ یہ اقلیتی طبقہ اکثریت سے ذہنی' قلبی اور جسمانی طور پر کٹ جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب تر ہوتا چلا گیا اور یوں اس نے ایک مافیا کی شکل اختیار کر لی۔ اس طبقے میں صاحبان اقتدار' سیاستدان' جاگیردار' سول اور فوجی بیوروکریسی' دانشور اور صحافی طبقے کے وہ افراد شامل ہیں جنہیں ایک خاص ماحول میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ اب یہ لوگ ایک جزیرے میں رہتے ہیں جہاں یہ بظاہر بہت خوش ہیں مگر اندر سے اداس رہتے ہیں۔ لوگوں سے کٹ جانے کی وجہ سے یہ لوگ رضا کارانہ نظر بندی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے سامنے بھی اداسیاں ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ انسان اپنی زمین سے قطع تعلق بھی کر لے' زمین اس سے قطع تعلق نہیں کرتی چنانچہ ذہنی طور پر مغرب میں رہنے کے باوجود یہ روزانہ برگر' پزا اور ابلی ہوئی سبزیاں نہیں کھا سکتے۔ انہیں دال چاول کی طرف آنا ہی پڑتا ہے۔ ''پلے بوائے'' میں شائع ہونے والے ''مجلسی لطیفوں'' سے اکتا کر یہ بال آخر شادیوں میں مراثیوں کے لطیفوں پر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ لاہور تھیٹر کی تمام تر فحاشی اور عامیانہ پن کے باوجود اجوکا تھیٹر کے فنکار اس بے ساختہ پن کے لیے ترستے ہی رہتے ہیں۔ جس سے لاہور تھیٹر کے ''ان پڑھ'' اور ''ولگر'' فنکار بہر حال مالا مال ہیں۔

اس طبقے کے افراد نے آئین' جمہوریت' انسانی حقوق اور وہ دیگر تمام الفاظ رٹے ہوئے ہیں جو انہیں این جی اوز کے ذریعے رٹائے گئے تھے اور انگریزی صحافت کے ذریعے پڑھائے گئے تھے لیکن اگر کوئی ایسی حکومت برسر اقتدار آ جائے جس کے افراد کا تعلق بھی این جی اوز کی برگر فیملی سے ہو تو اس طبقے کی قلابازیاں دیکھنے والی ہوتیں ہیں' یہ لوگ ان سول اور فوجی حکومتوں کے ہم نوا رہے جن سے ان کا ثقافتی قارورہ ملتا تھا اور وہ فوجی اور سول حکومتیں ہمیشہ ان کا ہدف رہیں جن کا اس کلچر سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کلچر میں یہ صبح شام زندہ ہیں! آپ یقین کریں میں جب اس قبیلے کے افراد کا رہن سہن' بول چال اور طور طریقے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ لوگ کسی مضحکہ خیز ڈرامے کا کردار لگتے ہیں' مضحکہ خیزی ہمیشہ ناہمواریوں' تصنع اور بناوٹ کے ماحول سے جنم لیتی ہے اور ان کی ساری زندگی اس کی عملی تفسیر ہے اگر اس طبقے کے افراد نوجوان ہیں تو وہ یا تو لمبے لمبے بال رکھ کر اور انہیں چوٹی کی صورت دے کر اس معاشرے سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں جس میں انہیں مجبوراً رہنا پڑ رہا ہے اور یا پھر الٹے استرے سے ٹنڈ کرا لیتے ہیں کہ یہ بھی یورپ کا فیشن ہے۔ جب یہ جوانی کی حدیں کراس کرنے لگتے ہیں تو بوڑھے انگریزوں کی طرح گیٹس والی پتلونیں پہننا شروع کر دیتے ہیں اور ملگجی سی داڑھی رکھ کر اور ہاتھ میں پائپ پکڑ کر پاکستان کو ایک ناکام ریاست ثابت کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ مجھے اس طبقے میں دو افراد ایسے ملے جن میں مجھے اس قسم کا کوئی کمپلیکس نظر نہیں آیا' ایک پاکستان ٹائمز کے محمد ادریس مرحوم اور دوسرے نعیم بخاری' ان جیسے یقیناً کچھ اور بھی ہوں گے لیکن میں بدقسمتی سے ان سے مل نہیں سکا ہوں گا!

مجھے اس طبقے کے افراد پر غصہ نہیں آتا بلکہ ترس آتا ہے کہ کیونکہ ان کی شخصیتیں ان کی رضامندی پر مسخ نہیں کی گئیں یہ لوگ اپنی مرضی سے اپنے لوگوں اور اپنی زمین سے الگ تھلگ نہیں ہوئے انہیں جبراً مختلف نظام ہائے تعلیم نے اپنوں سے جدا کر دیا گیا۔ یہ ہمارے عہد کی اداس نسلیں ہیں' میری خواہش ہے کہ یہ واپس اپنی زمین کی طرف لوٹیں' بچے جیسے بھی ہوں' ماؤں کو عزیز ہوتے ہیں۔

میرے دوستو واپس آ جاؤ کہ مادر وطن اپنے بازو تمہیں آغوش میں لینے کے لئے وا کئے ہوئے ہے!

◆◆◆

کالے انگریز!

میں نے اپنے ایک کالم میں پاکستان کی ''اداس'' نسلوں کا ذکر کیا تھا مگر یہ بتانا بھول گیا تھا کہ یہ نسلیں صرف پاکستان میں ''کاشت'' نہیں کی گئیں۔ بلکہ دنیا کے سبھی مغلوب ملکوں میں اس کی ''شاخیں'' موجود ہیں چنانچہ غالب ملکوں کو اپنی پالیسیوں کے نفاذ کے لئے کچھ زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑتی' ان کی ہر ادا پر فریفتہ یہ نسلیں اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کرتی ہیں اور دنیا کے تمام مغلوب ملکوں میں اسی نسل کے افراد پالیسی ساز ہوتے ہیں جہاں نہ ہوں وہاں حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے اور اسی ''خود کاشتہ'' پودے کو تخت پر بٹھا کر اپنی مرضی کی پالیسیاں نافذ کر دی جاتی ہیں۔ اس نسل کے افراد کے ''ریفریشر کورس'' کے لئے غالب ملکوں نے اپنے ہاں متعدد سکالرشپس رکھے ہوئے ہیں چنانچہ وہ چار ماہ کے ''تربیتی کورس'' مکمل کرنے کے بعد جب یہ مغلوب لوگ وطن واپس آتے ہیں تو ''مذہبی جوش وخروش'' کے ساتھ دوبارہ اپنے ''فرائض منصبی'' انجام دینے لگتے ہیں!

ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں بھی یہ کلاس جنم لے چکی ہے جس طرح ہمارے ہاں کراچی' لاہور' پشاور اور اسلام آباد میں اس کلاس کے افراد زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بھارت کے جن شہروں میں ان کی بہتات ہے ان میں بمبئی' کلکتہ اور دہلی وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آباد میں ڈاکٹر قدیر خاں کی قبر بنانے والے اس نسل کے افراد جب خیر سگالی کے دورے پر شاباش وصول کرنے کے لئے انڈیا جاتے ہیں تو واہگہ سے لے کے کلکتے تک ان کا پرتپاک استقبال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جتنے دن بھارت کے ان شہروں میں گزارتے ہیں' یہ ان کی زندگی کے بہترین دن ہوتے ہیں کہ وہاں انہیں لمبے بال' ٹنڈیں' گیٹس والی پتلونیں' پائپ' جام اور ملگجی داڑھیاں زیادہ Relaxed ماحول میں نظر آتی ہیں' اگرچہ یہ دن ان کی زندگی کے بہترین دن ہوتے ہیں مگر یہ دن برسوں پر محیط نہیں ہوتے' انہیں واپس اس ''ناکام ریاست'' میں آنا ہی پڑتا ہے۔ جہاں ان کی بادشاہیاں قائم ہیں۔ ان کی بہترین مثال فہمیدہ ریاض (اردو میڈیم برانچ) ہیں۔ جنہیں پاکستان سے فرار کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں Poetess in the Campus کے منصب پر فائز کیا گیا تھا مگر جونیجو دور میں معافی نامہ لکھ کر واپس پاکستان آنا پڑا تھا۔ یہ کیسی ناکام ریاست ہے جس کی حدود کے باہر قدم رکھتے ہی ان لوگوں کی ناکامیوں کا آغاز ہو جاتا ہے؟

میں نے اس طبقے کے شاعروں' ادیبوں اور گلوکاروں کو بھی جن کی تعداد اگرچہ دو ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے' قدرے قریب سے دیکھا ہے ان کے گیتوں' ڈراموں اور کہانیوں میں وہ مسائل نظر آتے ہیں جو مغربی ملکوں میں صنعتی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے

ہیں مگر وہ انہیں پاکستانی عوام کے مسائل سمجھ کر بیان کرتے ہیں جب کہ ہمارا ملک ابھی صنعتی دور میں داخل نہیں ہوا۔ یہ لوگ اگر اپنی اردو کہانیاں' ڈرامے اور گیت انگریزی میں ترجمے کے لئے دیں تو اس معذرت کے ساتھ واپس ہو جائیں گے کہ یہ تو پہلے ہی انگریزی میں ترجمہ شدہ ہیں۔ میں نے اپنے گذشتہ کالم میں وعدہ کیا تھا کہ اس نسل کے مردوں کے علاوہ خواتین بلکہ لیڈیز بلکہ Babes یا Chicks کا ذکر بھی کروں گا۔ مگر یہ بہت مشکل کام ہے کہ اس میں کچھ نازک مقام بھی آتے ہیں اس طبقے کی خواتین مردوں سے زیادہ اندورنی کرب کا شکار رہتی ہیں۔ جب مشرقی گھر میں مغرب کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے تو پھر اس کے نتائج بھی وہی برآمد ہوتے ہیں جن نتائج سے آج مغرب دوچار ہے۔ یہ طبقہ ایک سے زیادہ شادیوں کا مخالف ہے اور ''مولوی'' اس کے حق میں ہے یہ مخالف ایک سے زیادہ شادیاں ''افورڈ'' کرتا ہے۔ چنانچہ مخالف کے ساتھ ساتھ شادیاں بھی کرتا چلا جاتا ہے' بچارا ''مولوی'' افورڈ نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے حصے میں صرف حمایت آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس طبقے سے علاقوں یا تعداد ازدواج کی شرح عام پاکستانیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ جن کی زد میں ان کے بچے آتے ہیں اور یوں خاندانی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں وہی مسائل جنم لیتے ہیں جن کی زد میں آیا ہوا مغرب اپنی تمام تر ترقی کے باوجود کراہتا نظر آتا ہے!

اس طبقے کی خواتین اندورنی زیبائش (Interior Decoration) اور بوتیک کے کاروبار میں زیادہ ہیں۔ پریذیڈنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس سے لے کر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ہاؤس تک کی اندورنی آرائش و بیرونی آرائش کے ٹھیکے اور پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ریاستی مہمانوں کے اعزاز میں منعقد ہونے والے ثقافتی شو بھی اس طبقے کی وساطت سے اسی طبقے میں تقسیم ہوتے ہیں اور کروڑوں روپوں کا یہ کھیل پیپلز پارٹی' مسلم لیگ اور فوجی حکومتوں میں یکساں طور پر جاری رہتا ہے کہ تبدیلی تو صرف اوپر اوپر آتی ہے اصل حکومت جن کے پاس ہے وہ انہی کے پاس رہتی ہے!

میں گذشتہ ہفتے اپنی اہلیہ کے ساتھ اس کی ایک ''اداس'' دوست کے والد کی رسم قل میں شرکت کے لئے گیا۔ یہ قل مخلوط نہیں تھے کہ ان کے رشتے داروں میں اللہ وسایا قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم واپس گھر کو جانے لگے تو میں نے اپنی اہلیہ سے پوچھا ''اندر کیا صورت حال تھی؟'' اہلیہ نے کہا ''گھر والوں کو جس پر شک گذرتا کہ یہ قرآن پڑھ سکتا ہے۔ وہ اس کے ہاتھ میں سیپارہ پکڑا دیتے۔ عجیب قسم کا قل تھا' مرحوم کی صرف ایک بیٹی رو رہی تھی!''

میں نے کہا ''باہر بھی یہی صورت حال تھی' تعزیت بھی بہت ''ریزرو'' انداز میں کی جا رہی تھی' انگریز ایسے مواقع پر مہمانوں کو بیئر پیش کرتے ہیں' ان کالے انگریزوں نے اتنی گرمی میں ٹھنڈے پانی کا بھی نہیں پوچھا' یہ قل نہیں ''ڈسکوقل'' تھے!''

◆◆◆